آسٹریلیا اور ترکی کا سفرنامہ
سیرِ ناتمام
ابویحییٰ
www.Inzaar.org
www.Inzaar.pk

Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free. www.inzaar.org ,www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: www.facebook.com/inzaartheorg

Whatsapp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from Whatsapp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

Join us on Youtube @ youtube.com/inzaar-global

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to info@inzaar.org and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD
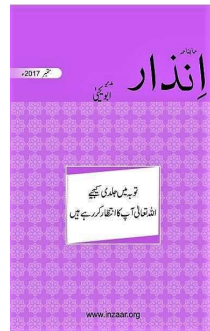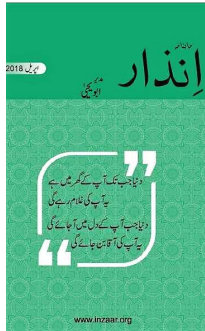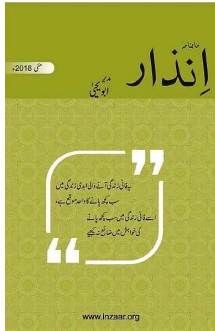
ماہنامہ انذار

مدیر: ابویحییٰ

ماہنامہ انذار ایک دعوتی و اصلاحی رسالہ ہے۔ اس کا مقصد لوگوں میں ایمان و اخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوائیے۔ اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کے لیے ان نمبروں پر رابطہ کیجیے۔

0345-8206011 or 0332-3051201

ابو یحییٰ کے ناول

جو آپ کی سوچ، زندگی اور عمل کا محور بدل دیں گے

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے
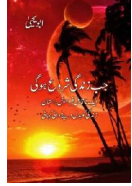
قسم اس وقت کی

ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر، جو سچ کی تلاش میں نکلی تھی
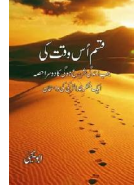
آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ
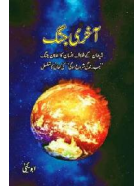
خدا بول رہا ہے

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں
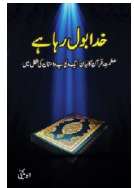
مالی تعاون

اللہ تعالیٰ کے پیغام (ایمان و اخلاق، تعمیرِ شخصیت اور فلاحِ آخرت) کو پھیلانے میں انذار کا ساتھ دیجیے۔

ہمارا مالی طور پر ساتھ دینے کے لیے درج ذیل اکاؤنٹ میں عطیات جمع کرائے جا سکتے ہیں۔

For Local Transaction

Title of Account: Inzaar Educational and Charitable Trust

Address: P.O.BOX.7285 Karachi.

Bank Name: United Bank Limited

Branch Address: UBL Vault Branch, Abdullah Haroon Road, Saddar, Karachi.

Account Number: 0080248866323

Branch Code: 0080

For Foreign Transaction

IBAN: PK32 UNIL 0109 0002 4886 6323

SWIFT CODE: UNILPKKA

عطیات جمع کرنے کے بعد

0092-345-8206011 یا info@inzaar.org یا info@inzaar.pk پر ہمیں مطلع کریں تاکہ اس کی رسید آپ کو بھیجی جا سکے۔

رضا کارانہ تعاون

انذار کے لئے رضا کارانہ تعاون فراہم کرنے کے لئے براہ مہربانی ذیل میں درج ای میل ایڈریس پر ای میل بھیجیں۔ info@inzaar.org , info@inzaar.pk

سیرِ ناتمام

آسٹریلیا اور ترکی کا دلچسپ، علمی و فکری سفرنامہ

ابویحییٰ

انذار پبلیشرز

A Non-Profit Organization

www.inzaar.pk

ان بندگان خدا کے نام جو تعصب اور خواہش

کی زنجیروں سے آزاد ہو کر

تنہا اپنے رب کے غلام ہو چکے ہیں

فہرست

ترکی کا سفرنامہ

آسٹریلیا کا سفرنامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''کھول آنکھ زمیں دیکھ'' کے بعد 'سیر نا تمام'' میرے سفرناموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ یہ کل دو سفروں کی روداد ہے۔ان میں سے پہلا مئی- جون 2016 میں ترکی اور دوسرا ستمبر-اکتوبر 2016 میں آسٹریلیا کا سفر تھا۔

جس طرح میرے ناول ایک ناول سے بڑھ کر ایک پیغام ہوتے ہیں اسی طرح میرے سفرنامے بھی محض ایک سفرنامے سے بڑھ کر ایک زندہ پیغام ہوتے ہیں۔ان کے پڑھنے والے یہ شکایت نہیں کر سکتے کہ وہ سفرنامہ نہیں پڑھ رہے کہ ان میں حالات و مقامات کی تفصیل پوری طرح بیان ہوتی ہے۔احوال سفر کے دلچسپ مشاہدات ،معلومات اور نئی چیزوں کا تعارف ہوتا ہے۔لیکن ساتھ میں دین و دنیا کی فلاح کی بہت سی چیزیں بھی قارئین کو پڑھنے کے لیے ملتی ہیں۔سفر میں ہر قدم پر میرے مشاہدات؛ تحلیل، تجزیے،تنقید اور تبصرے میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ان سے ہونے والی تربیت ہی وہ اضافی فائدہ ہے جو قاری کے وژن،طرز فکر اور چیزوں کو دیکھنے کے انداز کو بدل دیتا ہے۔یہ فائدہ مقصود نہ ہوتو میں خود سفر کروں اور نہ دوسروں کو اپنی تحریر سے شریک سفر کروں۔

امید ہے کہ باذوق قارئین دوران مطالعہ ذہن وفکر کے دریچوں سے اس تازہ ہوا کا لمس محسوس کریں گے جسے دوران سفر اس فقیر نے محسوس کیا۔

ابو یحییٰ

13 نومبر،2016ء

12 صفر المظفر،1438ھ

ترکی کا سفرنامہ

جاہلوں کے بیچ میں ایک ظالم

رات کا وقت تھا اور میں مشہورِ عالم استقلال ایونیو پر کھڑا تھا جو استنبول کی پہچان تھی۔ میرے سامنے ہزارہا لوگ چلے جارہے تھے۔ ہنستے بولتے، گاتے مسکراتے لوگ۔ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، خوش گپیاں کرتے......اردگرد موجود کھانے پینے اور انواع و اقسام کی اشیائے ضرورت اور اشیائے تعیش کو دیکھتے، خریدتے، برتتے لوگ۔ یہ لوگ خوشیوں کی تلاش میں اپنے وطن سے دور آئے ہوئے تھے۔ایک ایسے شہر میں جو عظیم حکومتوں اور عالی شان تہذیبوں کا مرکز رہا تھا۔ جو مشرق و مغرب کا خوبصورت امتزاج تھا۔ جو قدیم آثار اور جدید سہولیات کا انمول سنگم تھا۔ جو قدیم تاریخ اور جدید تہذیب کے ملاپ کا نادر نمونہ تھا۔

ترکی میں اپنے قیام کے دوران میں یہ منظر میں نے بارہا دیکھا۔ دن میں بھی اور رات میں بھی۔صبح میں بھی شام میں بھی۔ سورج کی کرنوں میں اور بادلوں سے برستی تیز بوندوں میں بھی۔ یہی رونق، یہی چہل پہل اس سڑک کی پہچان تھی۔ یہاں کوئی ٹریفک نہ ہوتا تھا۔ بس دور تک پھیلے انسانی سر، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مرد وزن اور لبِ سڑک انھیں بلاتی، لبھاتی سجی سجائی دکانیں اس کی پہچان تھیں۔ یہ سڑک آج کے انسان کی کہانی تھی۔ اپنے آغاز سے بے خبر، اپنے انجام

سے بے خبر انسان۔ اپنے خالق سے بے خبر اپنے مالک سے بے خبر انسان۔ خوشیوں کی تلاش اور خواہشوں میں سرگرداں انسان۔ انھی خوشیوں کے ابدی حصول کی خواہش میں یہ انسان روزِ ازل حوصلے کی دوڑ میں ساری مخلوق سے آگے نکل گیا اور بارِ امانت اٹھا بیٹھا...... وہ انسان کتنا ظالم اور کتنا جاہل ہے اسے جاننے کے لیے استقلال ایونیو شاید اس دنیا کی بہترین جگہ تھی۔

یہاں ہر نسل اور ہر قوم کے لوگ موجود تھے۔ سیاہ فام افریقیوں سے زرد فام چینیوں تک۔ دنیا کے اقتدار پر براجمان اہل مغرب سے لے کر ان کی جگہ لینے کی کوشش کرتے اہل مشرق تک۔ قرآن مجید سے بے خبر غیر مسلموں سے لے کر قرآن مجید کو مانتے، چومتے اور اسے بھاری بوجھ سمجھ کر کونے میں رکھ دینے والے مسلمانوں تک سب یہاں موجود تھے۔

میں اسی سڑک پر موجود تھا۔ جاہلوں اور بے خبروں کی اس بھیڑ میں ظالموں اور مجرموں کے ایک نمائندے کے طور پر میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان بے خبروں میں سے ہر شخص جب روزِ قیامت پروردگار عالم کے حضور پیش ہوگا تو اس کے ساتھ جو ہو سو ہو، وہ حاملین قرآن کے متعلق یہ گواہی ضرور دے گا کہ انھوں نے اپنے حصے کا کام نہیں کیا۔ میں اس سڑک پر کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ انسانیت پر شہادت حق دینا جن کا کام ہے وہ اپنا کام نہیں کرتے تو نہ کریں، انسانیت ان کے خلاف اپنی شہادت ضرور دے گی کہ انھوں نے حق کی گواہی نہیں دی تھی۔ ان جاہلوں کے ساتھ روز قیامت جو بھی ہو، شہادت حق نہ دینے والے ظالموں پر ذلت آج طاری کر دی گئی ہے۔ اس ذلت کا ایک زندہ نمونہ یہ شہر استنبول تھا جہاں ایک دور میں مسلم سلاطین دنیا کے تین براعظموں پر حکومت کرتے تھے۔ اور آج حال یہ ہے کہ دنیا کے بیشتر انسانی اور معدنی وسائل کے حامل ہونے کے باوجود مسلمانوں پر سے ذلت، مغلوبیت، افلاس اور بے امنی کی سیاہ رات ختم نہیں ہو کر دے رہی۔ شاید پروردگار عالم نے اِس فقیر کو اِسی سوال کا جواب ڈھونڈنے

اس سفر پر بھیجا تھا کہ مسلمانوں پر مسلط ذلت و رسوائی کی یہ سیاہ رات کب ختم ہوگی۔

ایک نئے سفر کی تمہید

ایک ایسے شہر کا سفر جو ڈیڑھ ہزار برس سے زیادہ مدت تک دنیا کا مرکز اور ان عظیم سلطنتوں کا دارالخلافہ رہا ہو جن کا اقتدار تین براعظموں تک پھیلا تھا، میرے جیسے شخص کے لیے اپنی ذات میں ایک بہت پرکشش خیال تھا۔ اور گرچہ سفر کے بعد میری یہ رائے بنی کہ یہ ابھی تک میری زندگی کا سب سے اچھا سفر تھا اور یہ کہ استنبول کئی اعتبار سے دنیا کی کسی بھی ٹورسٹ اٹریکشن سے بہتر منزل ہے، تاہم ان سب کے باوجود روانگی سے قبل میرے اندر یہاں جانے کی معمولی خواہش بھی پیدا نہ ہوئی۔ میں کوشش کے باجود اس سفر پر جانے کے لیے نہ خود کو آمادہ کر سکا نہ ذہن میں کوئی تجسس بیدار ہوا۔

مجھے اس سفر پر آمادہ کرنے کا سہرا میری اہلیہ کے سر تھا۔ مجھے آسٹریلیا کا ایک دعوتی سفر درپیش تھا۔ اس دوران میں اہلیہ کا اپنی بہن اور بہنوئی کے ہمراہ ترکی جانے کا پروگرام تھا۔ مجھے آسٹریلیا کا ویزہ بہت تاخیر سے ملا، اس لیے وہاں کا پروگرام موخر ہو گیا۔ جس کے بعد اہلیہ کا مستقل تقاضہ تھا کہ میں ان کے ساتھ جاؤں۔ میرے پاس نہ اخراجات سفر تھے نہ وسائل، مگر پھر اللہ نے انتظام کرا دیا تو میں آمادہ سفر ہوا۔ پھر بھی بعض مسائل اور مصروفیات کی بنا پر ذہن اس سفر کے لیے آمادہ نہ تھا۔ نہ دل میں وہ مسافرانہ امنگ پیدا ہوئی جو ایسے سفر کا خاصہ ہوتی ہے۔

مزید یہ ہوا کہ جب ہم نے ویزہ کے لیے اپلائی کیا تو مقررہ وقت پر پاسپورٹ نہ آسکا۔ سالی اور ہم زلف جن کا ویزہ پہلے سے لگا ہوا تھا انتظار کرتے کرتے روانہ ہو گئے۔ رمضان بالکل سر پر آچکے تھے اور بمشکل دس بارہ دن ہی بچے تھے اس لیے اب محسوس ہوا کہ سفر ممکن نہیں رہے گا۔ مگر آخری وقت پر سفارتخانے سے فون آیا کہ ویزہ لگ کر ہمارا پاسپورٹ آگیا ہے۔ یوں

جمعرات کی دوپہر پاسپورٹ ملے اوراسی رات کی سیٹیں ترکش ایئرلائن سے مل گئیں۔ اور ہم انتہائی مختصر نوٹس پر بغیر کسی تیاری کے سفر پر روانہ ہوگئے۔

ائیر پورٹ اور سفر آخرت اور دنیا کے سفر کی آسانی

ائیر پورٹ میرے لیے ہمیشہ سے آخرت کی یاددہانی کا بڑا ذریعہ رہا ہے۔ ائیر پورٹ اور سفر دونوں میں فکرِ آخرت کے کئی پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ عام حالات میں انسان کو زندگی اور وقت دونوں کے گزرنے کا احساس نہیں ہو پاتا۔ مگر سفر میں یہ احساس کئی گنا بڑھ جاتا ہے کہ وقت بھی گزر رہا ہے اور زندگی کی ڈور بھی ہاتھ سے ہر لمحے چھوٹ رہی ہے۔ عام حالات میں ہم آج میں جیتے ہیں۔ جبکہ سفر میں انسان کی توجہ ماضی کی یاد یا مستقبل کی پلاننگ پر لگی رہتی ہے۔ جبکہ تیزی سے تبدیل ہوتے ہوئے مقامات بھی انسان کو زندگی کا احساس دلاتے ہیں۔ یہی احساس عام زندگی میں بھی مطلوب ہے کہ انسان ہر لمحہ ماضی کو سوچ کر اپنا احتساب اور استغفار کرتا رہے اور آخرت کی آنے والی دنیا کا سوچ کر اس کی تیاری کرتا رہے۔

ترکش ائیرلائن کی فلائٹ رات پونے دو بجے اپنے وقت پر روانہ ہوئی اور مقررہ وقت پر ترکی کے وقت کے حساب سے سوا پانچ بجے پہنچ گئی۔ ترکی کا وقت پاکستان سے دو گھنٹے پیچھے ہے۔ گویا ساڑھے پانچ گھنٹے میں ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ کراچی کا استنبول سے فاصلہ تقریباً پانچ ہزار کلومیٹر کا ہے۔ پرانے زمانے کا بڑے سے بڑا بادشاہ بھی یہ سفر اتنے مختصر وقت میں طے نہیں کرسکتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آج کے انسان پر یہ کرم کر رکھا ہے جس پر اس کا جتنا شکریہ ادا کیا جائے وہ کم ہے۔

اس بات کو ایک واقعاتی مثال سے بھی میں واضح کرنا چاہتا ہوں۔ اس سفرنامہ کی تصنیف سے قبل میں اسلام آباد آیا تو بعض دوستوں کے ہمراہ سوات اور کالام وغیرہ تک جانا ہوا۔ دوران

سفر برادرم ندیم اعظم صاحب نے سوات کے متعلق ایک کتاب میں پڑھا کہ سکندر اعظم بھی یہاں آیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے سوال کیا کہ بہت سے یونانی ہندوستان پر حملے کے بعد واپس نہیں گئے۔ یہیں رہ گئے تو اس کی کیا وجہ تھی؟ میں نے ان کو کئی وجوہات بتائیں اور ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ یونان جو کہ ترکی سے متصل ہی تھا وہاں تک سفر کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ وہاں تک واپس لوٹنا ہی سال سے اوپر کا سفر تھا۔ یہ بھی دیگر عوامل کے علاوہ یہاں یونانیوں کے رک جانے کا ایک عامل بنا۔ آج کا انسان یہ طویل سفر انتہائی مختصر وقت میں کرتا ہے، مگر جس ہستی نے یہ سفر ممکن بنایا ہے اس کا اعتراف کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتا۔

دورِ دعوت

استنبول کا ائیر پورٹ بہت وسیع اور کشادہ ہے۔ یہ دنیا کے مصروف ترین ائیر پورٹس میں سے ایک ہے جس پر پچھلے برس یعنی 2015 میں چھ کروڑ سے زائد لوگوں نے سفر کیا۔ پچھلے کئی برسوں میں مسافروں کی تعداد بڑھتی چلی جارہی ہے جس کی وجہ ترکی کی روزافزوں سیاحتی صنعت ہے۔ گرچہ دہشت گردی کے کئی واقعات کے بعد اب سیاحوں کی آمد میں کافی کمی ہوگئی ہے۔ لیکن جب ہم پہنچے تو بہت بڑی تعداد میں مسافر وہاں موجود تھے۔

دبئی کے بعد استنبول دوسرا ائیر پورٹ تھا جہاں میں نے اتنی بڑی تعداد میں مختلف قومیتوں کے افراد ایک ساتھ دیکھے۔ ایشیا، افریقہ اور مغربی ممالک کی مختلف نسلوں اور رنگوں کے لوگوں کو ایک ساتھ دیکھنا بڑا عجیب تجربہ تھا۔ مختلف ائیر لائنز سے لوگ اتر کر اپنا سامان لینے کے لیے ایک بڑے ہال میں موجود مختلف بیلٹوں کے اردگرد کھڑے تھے۔ ہمیں اتفاق سے پورے ہال میں اس لیے چکر لگانا پڑا کہ ہمیں یہ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ ہمارا سامان کہاں آرہا ہے۔ یہ بظاہر ایک صبر آزما تجربہ تھا مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اتنی ساری اقوام کے لوگوں کو ایک چھت تلے دیکھ لیا۔ اس کا مجھ

پر بہت اثر ہوا۔

آدم وحوا کی اولاد کو اس طرح دیکھ کر دل میں پہلا خیال روزِ حشر کا آتا ہے کہ وہی دن ہوگا جب سب لوگوں کو اس طرح ایک ساتھ جمع کر دیا جائے گا۔ یہ کتنی اہم بات ہے کہ تمام اولادِ آدم کو اس اہم ترین مرحلے کے بارے میں خبردار کیا جائے۔ اس خدمت کو سرانجام دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں اپنے انبیاء کو بھیجا۔ جب نبوت کا دروازہ حتمی طور پر بند کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے صحابہ کو باقاعدہ اس بات کا ذمہ دار بنایا گیا کہ جس طرح رسول عربی علیہ السلام نے ان پر حق کی گواہی دی ہے وہ باقی لوگوں پر یہ گواہی دیں۔ اسی لیے ان کو امت وسط بنایا گیا کہ ان کے ایک طرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا لایا ہوا پیغام ہے اور دوسری طرف پوری انسانیت ہے اور وہ وسط میں کھڑے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ یہ قانون بنا رکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو اہل عرب اور دین حق کے علمبردار بن کر دنیا میں کھڑے ہونے والے مسلمان جب اپنی ذمہ داری پوری کریں گے وہ دنیا پر غالب آجائیں گے۔ اور جب نہیں کریں گے تو دنیا میں ذلیل اور مغلوب ہوجائیں گے۔ میں نے اس قانون کو اپنی کتاب آخری جنگ میں بہت کھول کر بیان کیا ہے۔ جن لوگوں کو اس بات کو علمی طور پر سمجھنے میں کوئی دلچسپی ہے وہ آخری جنگ میں اس کی تفصیل دیکھ سکتے ہیں۔

تاریخی آسانی اور تاریخی بدنصیبی

میں اس سفر میں اپنے ساتھ قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ اور اپنی کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا انگریزی ترجمہ When Life Begins لے کر آیا تھا۔ جہاں موقع ملتا میں کسی نہ کسی شخص کو یہ پیش کر دیتا۔ جہاز میں ہمارے پاس متعین ائیر ہوسٹس کو میں نے قرآن کریم دیا۔

وہ اتنا خوش ہوئی کہ اس نے دوران پرواز تین مختلف مواقع پر میرا شکریہ ادا کیا۔ پھر میں جہاز کے پائلٹ کو بھی قرآن مجید اور اپنی کتاب گفٹ کرنے کے لیے کاک پٹ تک گیا۔ کریو انچارج نے مجھ سے یہ کہہ کر رکھ لیے کہ وہ پائلٹ کو دے دے گا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا میری سیٹ تک آیا اور بتایا کہ پائلٹ نے مجھے خاص طور پر شکریہ ادا کرنے بھیجا ہے۔ میں اس سفر میں ہر جگہ اور بعد کے اسفار میں بھی اسی طرح یہ چیزیں لوگوں تک پھیلاتا رہا۔ اور ہر مسلم اور غیر مسلم کی طرف سے شکریہ کے ایسے ہی جذبات وصول کرتا رہا۔ میں سوچتا رہا کہ ایک دور تھا کہ اسلام پر عمل کرنا اور اس کی دعوت دینا بہت مشکل تھا۔ آج یہ دونوں کام کتنے آسان ہیں۔ اس حساب سے آج کے مسلمان انسانی تاریخ کے خوش نصیب ترین لوگ ہیں۔ پھر بھی مسلمان یہ کام نہ کریں تو اس سے زیادہ بڑی بدنصیبی انسانی تاریخ نے کبھی نہ دیکھی ہوگی۔

ٹاکسم اسکوائر

ہمارا قیام ایک چھوٹے مگر صاف ستھرے ہوٹل میں تھا۔ یہ ٹاکسم اسکوائر کے قریب اور استقلال ایونیو کی عقبی سڑک پر واقع تھا۔ آگے بڑھنے سے قبل ان دونوں مقامات کا تعارف ضروری ہے کہ یہ دونوں جدید استنبول کی پہچان ہیں۔

ٹاکسم اسکوائر دراصل تقسیم اسکوائر ہے۔ یہ قدیم استنبول میں پانی کی لائنوں کی تقسیم اور فراہمی آب کا مرکز تھا۔ استنبول شہر دنیا کے دو براعظموں یعنی ایشیا اور یورپ کے سنگم پر واقع ہے۔ اس کا کچھ حصہ یورپ میں اور کچھ ایشیا میں ہے۔ تقسیم اسکوائر شہر کے یورپی حصے میں واقع اور جدید استنبول کا دل ہے۔ یہ ایک بڑا میدان ہے جس کا فرش پختہ ہے۔ مختلف اطراف سے آنے والی سڑکیں اس میدان میں کھل رہی ہیں۔ ان سڑکوں اور میدان کے ہر طرف ہوٹل اور دکانیں ہیں۔ میدان کے وسط میں جدید ترکی کے قیام کی یاد میں ایک مونومنٹ بنا ہوا ہے۔ اس

مونومنٹ یا یادگار کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک بلند چبوترے پر ترکی کے معمار کمال اتاترک اور ان کے بعض ساتھیوں کے مجسمے بنے ہوئے ہیں۔

سیاحتی مرکز ہونے کے ساتھ یہ استنبول کا سیاسی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بھی ہے۔ رمضان کے آغاز میں ہم نے ایک بڑی اجتماعی افطار یہاں دیکھی جس میں ہزارہا افراد شریک تھے۔ جبکہ مختلف سیاسی مظاہروں کے لیے بھی یہ جگہ معروف ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک طرف غازی پارک ہے۔ 2013 میں یہاں طیب اردگان کی حکومت کے خلاف ایک بہت بڑا مظاہرہ ہوا تھا کیوں کہ وہ اس جگہ پر شاپنگ سنٹر بنانا چاہتے تھے۔ اس مظاہرے پر پولیس نے چڑھائی کردی تھی جس کی بنا پر اس مظاہرے کو بین الاقوامی میڈیا میں بہت شہرت ملی۔ یہاں سے ایک ٹرام شروع ہوتی ہے جو اس سے متصل استقلال ایونیو پر چلتی ہے۔ سیاح اس پر بیٹھ کر استقلال ایونیو کی رونقوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

استقلال ایونیو

استقلال ایونیو تقریباً ڈیڑھ کلومیٹر طویل ایک شاہراہ ہے جو تقسیم اسکوائر سے شروع ہو کر گلاطہ ٹاور کی تاریخی عمارت تک جاتی ہے۔ گلاطہ ٹاور چودھویں صدی کے زمانے کا بنا ہوا ستر میٹر بلند ایک ٹاور تھا جو اُس وقت شہر کی بلند ترین عمارت تھی۔ اس وقت بھی یہ شہر کی ایک اہم تاریخی عمارت ہے جس سے شہر کا خوبصورت نظارہ سامنے آتا ہے۔

استقلال ایونیو گویا ایک طویل شاپنگ سنٹر ہے جس میں سیکڑوں دکانیں موجود ہیں جہاں مختلف اقسام کی ہزارہا چیزیں فروخت کے لیے موجود ہیں۔ یہ دکانیں قدیم اور جدید طرز کی ان عمارات میں بنی ہوئی ہیں جو سڑک کے دونوں طرف موجود ہیں۔ یہ عمارات بہت بلند نہیں بلکہ پانچ چھ منزلہ ہیں۔ اس سڑک کا واحد ٹریفک وہ سیاحتی ٹرام ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ مگر یہ کافی دیر

میں آتی اور بہت آہستگی سے چلتی ہے اس لیے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ اس سڑک کے واحد مسافر پیدل چلنے والے وہ سیاح ہیں جن کی تعداد ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں تک جا پہنچتی ہے۔ دکانوں سے شاپنگ کرتے، یہاں کھاتے پیتے، ہنستے بولتے، چلتے پھرتے یہ سیاح اس علاقے کی سب سے بڑی رونق ہیں جن کا تعلق ہر ملک، رنگ، نسل اور زبان سے ہوتا ہے۔ یہاں کا ماحول مغربی طرز کا ہے، مگر سب لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ میری اہلیہ کی طرح سعودی عرب کی بعض خواتین مکمل ڈھکا ہوا لباس پہن کر بھی وہاں موجود تھیں اور مغربی طرز کا کھلا لباس پہنے خواتین بھی اطمینان سے وہاں گھومتی تھیں۔

ہمارا ہوٹل چونکہ اس سڑک سے بالکل قریب تھا۔ اس لیے یہاں خاص کر آنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ہمارا نکلنا ہی یہاں سے ہوتا تھا۔ کئی دفعہ پوری سڑک کا طواف کیا۔ ٹرام میں بیٹھ کر بھی اور پیدل چل کر بھی۔ مجھے چونکہ بلند عمارات پر چڑھنے کا شوق ہے اس لیے ایک دفعہ گلاطہ ٹاور جانے کا قصد کیا۔ ٹرام نہیں آ رہی تھی اس لیے پیدل ہی آخری سرے تک گئے، مگر وہاں پہنچے تو وہ بند ہو چکا تھا۔ یوں ہم ناکام و نامراد واپس لوٹے، مگر فائدہ یہ ہوا کہ آخری حصے تک استقلال اسٹریٹ کو دیکھ لیا۔

پیشگی علم کی نعمت

ہم رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ ہوٹل پہنچتے ہی ہمیں سو جانا چاہیے تھا، مگر پہلے اپنی سالی ثنا سے ملاقات کرنا تھی جو وہیں ایک ہوٹل میں مقیم تھی۔ چنانچہ کمرے میں پہنچتے ہی میں نے اپنے موبائل کو وائی فائی سے کنکٹ کیا اور اسے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ اس نے ہمیں ٹیکسم اسکوائر آنے کے لیے کہا۔ ہم وہاں پہنچے تو اسے اپنا منتظر پایا۔

اس بے چاری نے اپنا ٹور اپنی بہن کے ساتھ مل کر بنایا تھا، مگر ہمارا ویزہ دیر سے ملنے کی بنا پر

وہ پہلے آگئی اور پورا استنبول دیکھ کر فارغ ہو چکی تھی۔ آج ان سب کی ترکی کے ایک دوسرے شہر گوریم کے لیے روانگی تھی۔ ہمارا وہاں بعد میں جانا ہوا۔ اس کے ساتھ ہم اس کے ہوٹل گئے جہاں اس کی دونوں بچیوں اور اپنے ہم زلف تنزیل سے ملاقات ہوئی۔ میرا بیٹا جس کے نام پر میری کنیت ابو یحییٰ ہے، اپنی کزنز سے مل کر بہت خوشی خوشی ان کے ساتھ کھیلنے لگا۔

ثنا اس سفر میں ہم سے ہر قدم آگے ہی رہی۔ اس کا ہمیں بہت فائدہ ہوا۔ اس نے اپنے تجربات کی روشنی میں ہمیں ہر حوالے سے اور ہر چیز کے بارے میں مکمل گائڈ کر دیا۔ ثنا کے ذریعے سے ٹرانسپورٹ استعمال کرنے سے لے کر کھانے پینے غرض ہر معاملے میں ٹور کی کم وبیش ہر چیز کا ہمیں پہلے ہی علم ہو چکا تھا۔ اپنی لاعلمی کی بنا پر ایک سیاح جن مشکلات یا نقصانات کا شکار ہوتا ہے، ہم ان سے مکمل محفوظ رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پیشگی علم یا غائب چیزوں کا علم دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ خاص طور پر یہ علم کسی ایسی چیز کے بارے میں ہو جس کا براہ راست ہم سے تعلق ہو اور کل ہمارا واسطہ اس سے پڑنے والا ہو تو ہم اس علم کے دینے والے کے لیے سراپا شکر بن جاتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح ہم کئی فوائد حاصل کر لیتے ہیں اور نقصانات سے بچ جاتے ہیں۔

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ علم حاصل ہو جائے تو دنیا میں جتنا مفید ہوتا ہے، اس سے کہیں زیادہ آخرت کے پہلو سے مفید ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیا علیہم السلام کے ذریعے سے انسانیت پر سب سے بڑا احسان یہ کیا کہ آخرت کا تمام پیشگی علم ہمیں عطا کر دیا ہے۔ آخرت کی نجات کے حوالے سے اپنے کام کی ہر چیز سے ہم پوری طرح واقف ہیں۔ یہ ہمارے رب کا ہم پر بڑا احسان ہے۔ تاہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم مسلمان آخرت کو اپنا مسئلہ نہیں سمجھتے۔ ہمیں یہ غلط فہمی ہے

کہ آخرت کا احتساب غیر مسلموں کے لیے ہوگا۔ ہم تو بخشے بخشائے ہیں۔اس لیے ہم اس علم سے فائدہ اٹھانے کے بجائے دیگر چیزوں میں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں۔ہمیں جس چیز میں دلچسپی نہیں ہے وہ آخرت کے اس علم کوانسانیت تک پہنچانا ہے۔شاید ہمارے نزدیک یہ کوئی کرنے کا کام ہی نہیں۔

مگر یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی نبی نبوت ملنے کے بعد نبوت کے فرائض ادا کرنے یعنی دعوت وتبلیغ سے انکار کردے۔اللہ کے جلیل القدر انبیاء نے تو خیر یہ کام کبھی نہیں کیا۔لیکن ان کی امتوں نے کیا ہے۔جس کے بعد اللہ تعالیٰ ان امتوں کو دنیا میں عبرت کا نشان بنادیتے ہیں۔لیکن جب امت یہ کام کرتی ہے تو اسے دنیا میں غلبہ واقتدار مل جاتا ہے۔اس حقیقت کے باوجود مسلمان غلبہ واقتدار کے لیے غیر مسلموں سے جھگڑنے کو دین سمجھتے ہیں۔حالانکہ مسلمانوں کے غلبے کا راستہ دعوتِ دین میں پوشیدہ ہے۔مگر سر دست مسلمان لیڈر شپ یہ بات ماننے کو تیار نہیں۔

یارب وہ نہ سمجھیں ہیں نہ سمجھیں گے میری بات

دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اس ''ناسمجھی'' کا ایک اہم اور بنیادی سبب جو میں اپنے ناقص فہم کی روشنی میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ اہل مغرب نے مسلمانوں سے ان کا ہزار سالہ اقتدار چھینا ہے۔جس کے نتیجے میں مسلم لیڈر شپ عمومی طور پر مغرب کی شدید نفرت میں مبتلا ہے۔نفرت میں مبتلا کسی شخص کو کوئی بات سمجھانا بہت مشکل ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اہل مغرب نے دنیا کی امامت کے منصب سے معزول نہیں کیا۔ ہماری کوتاہیوں کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ جب ہم نے دعوت اور شہادت حق کا کام چھوڑ دیا تو یہ مغلوبیت بطور سزا ہم پر مسلط کر دی گئی اور دوسو برس کی سر توڑ کوشش کے باوجود ختم نہیں ہو رہی۔مگر جس روز ہم اپنی ذمہ داریاں ادا کرنا شروع کر دیں گے تو کچھ ہی

عرصہ میں ہمارا منصب بحال ہو جائے گا۔ ورنہ ذلت ورسوائی یونہی ہمارا مقدر رہے گی۔ یہ چیز ہم جتنی جلد سمجھ لیں اتنا ہی بہتر ہوگا۔

اللہ کی ایک خصوصی عنایت

ثنا نے ہمیں بتا دیا تھا کہ ایر پورٹ سے ٹیکسم اسکوائر تک وہ لوگ کافی مہنگی ٹیکسی میں آئے تھے۔ مگر وہاں سے ٹیکسم تک ایک بس بھی آتی ہے جو بہت کم پیسے لیتی ہے۔ ہم اسی آرام دہ اور کشادہ بس میں اطمینان سے بیٹھ کر اپنے ہوٹل کے قریب تک آ گئے تھے۔ راستے بھر میں جدید اور خوبصورت استنبول کو دیکھتا رہا۔ ترکی میں حالیہ برسوں کی معاشی ترقی کی بنا پر ایک بہت مضبوط اپر مڈل اور مڈل کلاس وجود میں آ گئی ہے۔ چنانچہ ترکی کی سڑکوں پر ہر جگہ جدید ماڈل کی گاڑیاں رواں دواں تھیں۔ میں ائیر پورٹ سے ہوٹل آ رہا تھا تو ان گاڑیوں کو دیکھ کر یونہی دل میں خیال آیا کہ کسی مقامی ترکی کی آرام دہ گاڑی میں بیٹھ کر استنبول دیکھا جائے تو خود اِدھر اُدھر دھکے کھانے کی بہ نسبت کافی آسانی ہوگی۔ مگر پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے فوراً جھٹک دیا۔ میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان کو ہمیشہ ملی ہوئی نعمت پر نظر رکھنا چاہیے۔ اس کو چھوڑ کر نہ ملی ہوئی چیز پر للچائی ہوئی نظر رکھنا منفی اندازِ فکر ہے۔ ایسا انسان کبھی مطمئن نہیں رہتا۔

مگر اگلے دن جو ہوا اس سے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میری اس خواہش کی تکمیل کا وہ اہتمام کر دیں گے۔ ہوا یہ ہے کہ میرے بھتیجے سعد کی ایک اسٹوڈنٹ اسریٰ استنبول میں رہتی تھی۔ اس کو جیسے ہی علم ہوا کہ سعد کے چچا کی فیملی یہاں آئی ہوئی ہے، اس نے ہمارا نمبر لیا اور میری اہلیہ سے رابطہ کر لیا۔ اس کے بعد وہ مُصِر ہوگئی کہ اسی نے استنبول ہم کو دکھانا ہے۔

میں نے بہت سختی سے منع کیا۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں اور ہمارا کوئی ایسا گہرا تعلق بھی نہ تھا۔ بلکہ سرے سے نہ تھا، مگر وہ سر ہوگئی۔ چونکہ اگلے دن ہفتہ تھا اور ویک اینڈ

کا آغاز تھا اس لیے اس کی چھٹی بھی تھی۔ چنانچہ ایک دن کے لیے ہم اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ یہ طے ہو گیا کہ اگلے دن وہ ہمیں ترکی کے اہم ترین تاریخی مقامات یعنی بلیو مسجد، آیا صوفیہ اور توپ کاپی لے چلے گی۔

زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

یہ فارسی کے ایک مشہور شعر کا مصرعہ ہے۔ شعر کا دوسرا مصرعہ اس لیے نہیں لکھ رہا کہ ذومعنی ہے اور اس کا دوسرا مفہوم اخلاقیات سے گرا ہوا ہے۔ لیکن پہلا مصرعہ ہمارے ہاں ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے دوست کی زبان ترکی ہے اور مجھے ترکی نہیں آتی۔ ترکی میں مجھے یہ مصرعہ بہت یاد آیا۔ ہر قدم پر ہمیں اس بات کا تجربہ ہوا کہ ترکوں کو ترکی کے سوا کوئی اور زبان نہیں آتی۔ اتنا بڑا سیاحتی مرکز ہونے کے باوجود یہاں انگریزی کا کوئی ذکر نہیں۔ ایک دو مواقع پر زبان کی وجہ سے بڑی دقت پیش آئی۔ مثلاً استنبول کے ایک خوبصورت مقام پرنسز آئی لینڈ پر تو مجھے دیر تک واش روم ہی نہ مل سکا کہ وہاں کے مقامی لوگ واش روم کے لفظ کو نہیں سمجھ پا رہے تھے۔ حالانکہ وہاں ہزاروں سیاح موجود تھے اور ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ ترکی جانے والے ہر سیاح کو اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ چند بنیادی ضرورت کے اسماء اور جملے یاد کر لے۔

بہرحال یہی مشکل ہمیں اسریٰ کے ساتھ پیش آئی۔ وہ اتنی انگریزی پڑھ لکھ لیتی تھی کہ اپنا مافی الضمیر بیان کر سکے اور دوسروں کا سمجھ سکے۔ مگر ایک انگریزی جملہ بولنا بھی اس کے لیے بہت مشکل تھا۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ ہر ملاقات میں ایک نئی خاتون کو بطور مترجم ساتھ لائی۔ تین ملاقاتوں میں تین مختلف خواتین اس کے ساتھ آئیں۔ جبکہ چوتھی دفعہ اس کو کوئی نہیں ملا۔ اس دفعہ ہم نے مکالمے کے لیے اس کے موبائل فون کو استعمال کیا۔ یعنی ہمیں جب کچھ کہنا

ہوتا تو ہم انگریزی میں جملہ لکھ دیتے۔ انٹرنیٹ کے ذریعے سے وہ جملہ ترکی میں ترجمہ ہوتا اور پھر جواب میں وہ ترکی میں لکھتی جو انگریزی میں ترجمہ ہو جاتا۔ یوں کچھ مشکل سے سہی لیکن پیچیدہ قسم کی گفتگو بھی ہم نے کر ڈالی۔

زبان بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں میں سے ایک ہے۔ قرآن مجید کے مطابق یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم رحمت اور نعمت کا ظہور ہے۔ ہم کتنی پیچیدہ اور مشکل معلومات اور خیالات کا تبادلہ کس قدر آسانی سے کر لیتے ہیں۔ یہ زبان ہی ہمارے سارے جذبات و احساسات کی ترجمان ہے۔ مگر افسوس کہ لوگ سب سے بول لیتے ہیں۔ نہیں سیکھتے تو رب سے گفتگو کرنا نہیں سیکھتے۔ ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے گفتگو کے لیے کوئی خاص زبان سیکھنی ہے۔ اس سے تو ہر زبان میں بات ہو سکتی ہے، مگر ہمارے پاس اللہ تعالیٰ سے گفتگو اور راز و نیاز کے لیے وقت نہیں۔ بہت ہوا تو کسی مشکل میں دعا کر لی۔ یہ بھی اچھی بات ہے۔ لیکن صرف مشکل ہی میں اللہ کو پکارنا اور باقی وقت اسے بھولے رہنا کوئی اچھا رویہ تو نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے تو ہر وقت بات ہونا چاہیے۔ اس کی بڑائی کے اعتراف میں۔ اس سے اظہار محبت کے لیے۔ اس کا دلی شکریہ ادا کرنے کے لیے۔ اس کے جمال و کمال کے بیان کے لیے۔ ہمارے پاس ہر چیز کا وقت ہے۔ مگر اس کا وقت نہیں۔

آیا صوفیا، نیلی مسجد اور سات پہاڑیاں

اسریٰ نے ہفتے کی صبح بارہ بجے تک آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ شہر کے ایشیائی حصے میں رہتی تھی جبکہ ہم یورپی حصے میں مقیم تھے۔ اس لیے کچھ تاخیر سے وہ ہم تک پہنچ ہی گئی۔ اس کے ساتھ گاڑی میں اس کی دوست فلس بھی تھی جسے وہ بطور مترجم ساتھ لائی تھی۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے اور راستے میں گفتگو شروع ہوئی۔ ترتیب یہ تھی کہ ہم انگریزی میں فلس سے اپنی بات کرتے اور پھر اسی کے ذریعے سے اسریٰ کا جواب ہم کو ملتا۔ کچھ گفتگو فلس سے بھی براہ راست ہو جاتی۔ یوں

ہم سلطان احمد کے علاقے میں جا پہنچے جہاں استنبول کی تین اہم ترین تاریخی عمارات موجود تھیں۔

پہلی اور سب سے اہم جگہ توپ کاپی کا محل تھا جو اب ایک میوزیم بن چکا ہے۔ وقت کی کمی کی بنا پر ہم نے یہ طے کیا آج کے دن کہ ہم توپ کاپی نہیں جائیں گے۔ دوسری عمارت آیا صوفیہ کا میوزیم اور تیسری بلو مسجد یا سلطان احمد جامع تھی۔ ترکی میں مسجد کو جامع کہتے ہیں۔

یہ تین تاریخی عمارات یا مقامات استنبول کی پہلی پہاڑی پر بنے ہوئے تھے۔ استنبول کا قدیم شہر دراصل سات پہاڑیوں پر بنا ہوا ہے۔ ان میں سے اہم ترین یہی پہاڑی ہے جس کی ہموار سطح پر بلو مسجد، آیا صوفیا اور توپ کاپی واقع تھے۔ یہ شہر کا وہی یورپی حصہ تھا جس پر ٹیکسم اسکوائر واقع ہے۔ اپنی تاریخی حیثیت کے علاوہ یہ مقام جنوری 2016 میں اس وقت دنیا بھر کے میڈیا میں نمایاں ہو گیا تھا جب یہاں داعش نے ایک خودکش حملہ کرایا تھا۔ اس حملے میں 13 غیر ملکی جرمن سیاح مارے گئے تھے۔ ہم اس وقت اسی جگہ موجود تھے جہاں چند ماہ قبل یہ حملہ ہوا تھا۔

ترکی کافی اور حورم سلطان کا حمام

مجھے ان تاریخی مقامات کو دیکھنے میں جتنی زیادہ دلچسپی تھی، ان دونوں خواتین یعنی اسریٰ اور فلس کو ان سے اتنی ہی کم دلچسپی تھی۔ ان کے لیے یہ ایک معمول کی جگہ تھی۔ انھیں زیادہ دلچسپی ہم سے باتیں کرنے میں تھی۔ میری اہلیہ کی اس وقت تک ان سے گہری دوستی ہو چکی تھی۔ اس لیے وہ بھی ان سے باتیں کر کے خوش تھیں۔ وہاں پہنچے تو اسریٰ نے ہمیں بہت اصرار کے ساتھ ترکی کافی پینے کے لیے کہا۔ یہ کافی مشرقی یورپ، شمالی افریقہ، بلقان اور مڈل ایسٹ یعنی وہ ممالک جو عثمانی سلطنت کا حصہ رہے ہیں، ان میں کافی مقبول ہے۔ اسریٰ اور فلس کا خیال تھا کہ یہ کافی ہم کو بھی بہت پسند آئے گی۔

کافی آئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرا امتحان شروع ہو چکا ہے۔ یہ ایک انتہائی تلخ قسم کی کافی تھی۔ عام کافی کے برعکس یہ پسی ہوئی کے بجائے کُٹی ہوئی کافی تھی جو ابلنے کے بعد تہہ میں جا بیٹھی تھی مگر اس نے پانی کو جو دودھ اور مٹھاس کی ہر آمیزش سے خالی تھا، انتہائی تلخ کر دیا تھا۔ میں ان دونوں کا دل رکھنے کے لیے مسکرا مسکرا کر کافی کے تلخ گھونٹ منہ میں اتارتا رہا اور اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ کپ زیادہ بڑا نہیں ہے۔

ہم لوگ جس ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے وہ آیا صوفیا کے سامنے واقع تھا اور اس کے ساتھ ہی مشہور عثمانی خلیفہ سلطان عالیشان کی ملکہ حورم سلطان کا بنوایا ہوا حمام تھا۔ ان دونوں کا تفصیلی تعارف میں اس وقت کراؤں گا جب سلمانیہ مسجد کے ساتھ واقع ان کے مزار کا ذکر آئے گا۔

پبلک باتھ یا عوامی غسل خانے ترکوں کی خصوصی روایت تھی۔ بلکہ درحقیقت یہ قدیم تمدن کی ایک روایت تھی۔ کیونکہ اٹیچ باتھ کی جو عیاشی آج ہم لوگوں کے لیے ایک معمولی اور ناقابل تذکرہ چیز ہے وہ زمانہ قدیم میں اتنی عام نہ تھی۔ نہانا تو دور کی بات ہے گھر میں بیت الخلاء بھی عام طور پر نہ ہوتے تھے۔ لوگ گھروں سے دور ویرانوں یا جنگلوں میں اس مقصد کے لیے جایا کرتے تھے۔

بلکہ اس حوالے سے ایک دلچسپ چیز بھی قارئین کی نذر کرتا جاؤں۔ میں ایک مغربی رسالے میں ایک سروے پڑھ رہا تھا۔ اس سروے میں لوگوں کے سامنے دورِ جدید کی اہم ترین ایجادات کا بیان تھا۔ لوگوں سے پوچھا گیا تھا کہ وہ ان میں سے کس ایجاد کو سب سے اہم سمجھتے ہیں۔ ان ایجادات میں کمپیوٹر سے لے کر بجلی جیسی مفید ایجادات شامل تھیں۔ مگر لوگوں نے جس ایجاد کو سب سے بڑی اور مفید ایجاد قرار دیا وہ باتھ روم کا فلش سسٹم تھا۔

بہر حال ملکہ حورم سلطان نے یہ حمام عوام کی خدمت کے لیے بنوایا تھا۔ یہ عرصہ سے بند پڑا ہوا تھا۔ مگر حال ہی میں ایک کمپنی نے اسے حکومت سے لے کر سیاحوں کو یہ سروس فراہم کرنا

شروع کردی ہے۔تاہم ہمیں نہانے، اسٹیم باتھ لینے یا مساج کرانے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔اس لیے کافی پی کر ہم جلدی سے اٹھ گئے کہ ترکی کافی کے بعد اسریٰ اور فلس مزید کوئی ترکی تحفہ نہ منگوالیں۔خیر بعد میں میری اہلیہ نے مجھے بتایا کہ کافی کا ٹیسٹ عام کافی سے بہت بہتر تھا۔انھوں نے اپنی ''گھریلو اجتہادی صلاحیت'' کو بروئے کار لا کر بتایا کہ اگر اس کافی میں دودھ اور چینی ڈال کر بنایا جاتا تو یہ کافی بہت بہتر ہو جاتی۔ظاہر ہے کہ اس گہری بصیرت تک صرف خواتین پہنچ سکتی ہیں۔میں ہاں میں ہاں ملانے کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا۔

آیا صوفیہ: رومن اور بازنطینی ایمپائر سے عثمانی سلطنت تک

ابھی تک میں نے کئی دفعہ آیا صوفیا کا ذکر کیا ہے۔قارئین سوچ رہے ہوں گے کہ یہ ہے کیا چیز؟ اس سوال کا آسان ترین جواب یہ ہے کہ یہ عیسائیوں کی مسجد قرطبہ ہے۔یعنی جس طرح مسجد قرطبہ موجودہ اندلس میں مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ اقتدار کی نشانی ہے، جسے اندلس میں مسیحی حضرات کا اقتدار قائم ہونے کے بعد چرچ میں بدل دیا گیا، اسی طرح آیا صوفیہ اس عظیم سلطنت کی آخری یادگار ہے جو ہزار برس تک دنیا کی سب سے بڑی مسیحی سلطنت رہی۔یہاں تک کہ سلطان محمد فاتح نے سن 1453 میں قسطنطنیہ کو فتح کر کے اس سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور اس کا نیا نام استنبول رکھ دیا گیا۔اس کے بعد آیا صوفیہ کے چرچ کو مسجد بنا دیا گیا اور بیسویں صدی میں خلافت عثمانیہ کے خاتمے تک یہ ایک مسجد رہا۔

یہ مسیحی سلطنت خود اپنی ایک تاریخ رکھتی ہے جسے مکمل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں، مگر اس کا سرسری تعارف ضروری ہے کہ اس کے بغیر نہ آیا صوفیا کی اہمیت سمجھ میں آسکتی ہے، نہ استنبول کی اور نہ اس بات کی کہ کیوں صدیوں تک مسلمان اس کوشش میں رہے کہ قسطنطنیہ کو فتح کر لیں۔ قسطنطنیہ یا استنبول کی فتح کا واقعہ اور پس منظر تو میں حضرت ابوایوب انصاری کے مزار پر حاضری

کے احوال میں بیان کروں گا،مگر سردست بازنطینی اوررومن ایمپائر کامختصر تعارف کرادوں۔

استنبول جس کا پرانا نام قسطنطنیہ ہے بازنطینی سلطنت کا صدر مقام تھا۔بازنطینی کا نام سن کر قارئین پریشان نہ ہوں۔ یہ اسی رومی سلطنت ہی کا ایک دوسرا نام ہے جس کے حکمران قیصر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خط لکھ کر اسلام کی دعوت دی تھی۔ یہ ابتدا میں رومی سلطنت کہلاتی تھی۔حضرت عیسیٰ سے تقریباً پانچ صدی قبل سے لے کر 27 قبل مسیح تک یہ سلطنت ایک جمہوری ریاست کے طور پر کام کرتی رہی۔یعنی عوام اراکین کو منتخب کرتے اور وہ حکومت کا نظام چلاتے۔روم کا شہر اس کا مرکز تھا اور یہ اس دور میں یورپ کی ایک عظیم طاقت تھی۔27ق م کے بعد جمہوریت کے بجائے بادشاہت کا نظام آ گیا۔سلطنت کی فتوحات بڑھتی چلی گئیں اور یہ یورپ، ایشیا اور افریقہ کی ایک عظیم طاقت بن گئی۔

ابتداء میں یہ ایک بت پرست مشرکانہ ریاست تھی۔بعد میں یہاں عیسائیت پھیلنا شروع ہوئی اور چوتھی صدی میں رومی حکمران قسطنطین کے قبول مسیحیت کے بعد یہ ایک مسیحی سلطنت بن گئی۔اسی نے روم کے بجائے قسطنطنیہ کو اس کا صدر مقام بنا دیا تھا۔چوتھی صدی عیسوی میں یہ عظیم سلطنت انتظامی طور پر دو حصوں مغربی رومن سلطنت اور مشرقی رومن سلطنت میں تقسیم ہوگئی۔مشرقی سلطنت کا مرکز قسطنطنیہ اور مغربی کا روم تھا۔مغربی رومن سلطنت کو تیزی سے زوال آیا اور پانچویں صدی عیسوی تک یورپ کے وحشی قبائل،اندرونی خانہ جنگی اور دیگر عوامل کی بنا پر بطور سلطنت اس کا خاتمہ ہوگیا۔

تاہم مشرقی رومن سلطنت پوری شان وشوکت سے قائم رہی اور سرحدوں میں کمی بیشی کے باوجود اگلے ہزار برس تک دنیا کی سب سے بڑی مسیحی طاقت رہی۔ یہاں تک کہ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کرلیا۔ یہ شہر استنبول کہلایا اور بیسویں صدی تک یہ عثمانی خلافت کا دارالحکومت

رہا۔ اس تفصیل سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ استنبول کا شہر دنیا کا واحد شہر ہے جو تقریباً سترہ صدیوں تک مسلسل دنیا کی اہم ترین سپر پاورز کا دارالحکومت رہا ہے۔

باپردہ بیبیاں

کافی پی کر ہم آیا صوفیا کی سمت روانہ ہوئے۔ میرے بہت اصرار کے باوجود داخلے کے ٹکٹ اسریٰ نے لیے۔ فلس نے یہ کہہ کر مجھے روکا کہ یہ ہماری روایت ہے اور میں ٹکٹ لوں گا تو بہت برا سمجھا جائے گا۔ خیر یہیں سے میں نے طے کرلیا کہ آئندہ اسریٰ کے ساتھ کسی ایسی جگہ نہیں جانا جہاں ٹکٹ لگتے ہوں۔ ورنہ میں پیسے دوں گا تو اسے اور وہ دے گی تو مجھے برا لگے گا۔

ہم اندر داخل ہوئے تو بہت سے سیاح یہاں موجود تھے۔ اندر داخل ہونے سے قبل فلس اور اسریٰ دونوں مشرف با حجاب ہوگئیں۔ یعنی فلس نے تو ایک ہیڈ والی جیکٹ پہن کر اس ہیڈ سے اپنا سر ڈھانپ لیا۔ جبکہ اسریٰ نے ایک چادر کو اسکارف کی شکل میں سر پر اوڑھ لیا۔ آگے چل کر جب ہم بلو مسجد گئے تو دونوں کا پردہ کچھ اور بڑھ گیا۔ اسریٰ نے اسکارف کے ساتھ ایک لمبا اوورکوٹ پہن لیا۔ جبکہ فلس نے جیکٹ کے اوپر ایک چادر پہن لی اور اس سے خود کو مکمل ڈھانپ لیا۔ یوں مغربی لباس میں ملبوس دونوں خواتین باپردہ بیبیاں بن گئیں۔

آیا صوفیا کی خوبصورتی

ہم اندر داخل ہوئے تو ایک وسیع ہال سامنے تھا جس پر ایک بڑا سا گنبد بنا ہوا تھا۔ یہی اس کی سب سے نمایاں خصوصیت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ تعمیرات کے فن میں گنبد کا آغاز یہیں سے ہوا۔ ترکی میں بننے والی تمام اہم مساجد میں ایک بڑے مرکزی گنبد کا خیال یہیں سے ماخوذ ہے۔ اس کے باہر چار مینار بھی بنے ہیں لیکن وہ اسے مسجد میں تبدیل کرنے کے بعد بنائے گئے۔ جبکہ منبر و محراب کا بھی اضافہ کیا گیا۔ بلو مسجد کے بننے تک یہ استنبول کی مرکزی مسجد رہی۔

آیا صوفیا کے مرکزی گنبد اور اندرونی عمارت میں ہر طرف انتہائی خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ جبکہ مسیحی دور کی حضرت عیسیٰ، حضرت مریم اور دیگر لوگوں کی خیالی تصویریں بھی کئی جگہ بنی ہوئی ہیں۔ چرچ کو مسجد میں تبدیل کرتے وقت ان میں سے بیشتر کو مٹا دیا گیا تھا یا ان پر پلاسٹر کر دیا گیا تھا۔ تاہم کمال اتاترک کے اقتدار کے بعد 1931 میں اس کو ایک میوزیم بنایا گیا تو ان تصویروں کو بھی بحال کر دیا گیا۔

یہ ترکی کا سب سے زیادہ مشہور سیاحتی مقام ہے جہاں لاکھوں کی تعداد میں سیاح آتے ہیں۔ مغربی سیاح کی سب سے زیادہ تعداد بھی یہاں آتی ہے۔ کیونکہ یہ چرچ جو 537 عیسوی میں بنا، اگلے ہزار برس تک دنیا کا سب سے بڑا چرچ رہا تھا۔ اور اب بھی استنبول میں اہل مغرب کے اقتدار کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ اس وقت بھی آیا صوفیا کے حوالے سے ترکی کے اسلام پسندوں اور سیکولر حلقوں میں ایک جھگڑا جاری ہے۔ ترکی میں مذہب کی بحالی کے ساتھ یہ مطالبہ زور پکڑتا جا رہا ہے کہ اسے میوزیم سے دوبارہ مسجد بنا دیا جائے۔ نیوز ویک نے دسمبر 2015 میں اس پر ایک تفصیلی مضمون شائع کیا ہے۔

نیلی مسجد

آیا صوفیا سے نکل کر ہم سلطان احمد جامع یا بلو مسجد گئے۔ اس کو نیلی مسجد اس لیے کہا جاتا ہے کہ اندرونی حصے کے ٹائلوں کا رنگ نیلا ہے۔ مسجد میں پہلے ایک وسیع صحن ہے اور اس کے بعد اندرونی حصہ ہے جو ایک وسیع ہال پر مشتمل ہے۔ اس ہال کی چھت بھی ایک گنبد پر مشتمل ہے۔ یہ گنبد ہی ترکی کی بڑی مساجد کی پہچان ہے۔ مسجد بہت عالیشان اور بہت خوبصورت تھی۔ کیوں نہ ہوتی کہ اس کی تعمیر اپنے زمانے کی ایک بڑی طاقت یعنی عثمانی سلطنت کے فرمانروا سلطان احمد اول نے کرائی تھی۔ یہ مسجد سات برس میں سن 1616 میں مکمل ہوئی تھی۔

مسجد کے اندرونی ہال میں گنبد کے نیچے ایک بہت بڑے دائرے میں پھیلا ہوا فانوس لگا ہوا ہے۔ اسی طرح اسپیکر بھی دیواروں کے بجائے سر کے اوپر معلق فانوسوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اس سے اذان اور قرات کی آواز بہت اچھی لگتی ہے۔ مسجد میں جا بجا خطاطی، مینا کاری، رنگین شیشوں، ٹائلوں اور خوبصورت نقش و نگار سے بڑی دلکشی پیدا کر دی گئی تھی۔ ابتدا میں کچھ حصہ غیر مسلم سیاحوں اور خواتین کی نماز کے لیے ہے جبکہ اس سے آگے مردوں کی جگہ ہے۔ میں نے اپنے بیٹے کے ہمراہ عصر کی نماز ادا کی۔ جبکہ خواتین نے پیچھے کے حصے میں نماز پڑھی۔ مجھے اس مسجد میں آکر بلکہ ترکی کی تمام مساجد میں جا کر عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ میرا اور اہلیہ دونوں کا تاثر یہ تھا کہ ان مساجد میں آنے کے بعد یہاں سے واپس جانے کا دل نہیں چاہتا۔ لیکن مسافر کو جانا ہی ہوتا ہے اس لیے تھوڑی دیر بعد ہم یہاں سے رخصت ہو گئے۔

گلاطہ برج اور استنبول کا جغرافیہ

آیا صوفیا اور بلو مسجد کے بعد اس کی گنجائش نہ بچی تھی کہ ہم توپ کاپی کو دیکھتے۔ اس کو دیکھنے کے لیے ایک پورا دن چاہیے تھا۔ چنانچہ ہم یہاں سے نکلے اور میزبانوں پر چھوڑ دیا کہ وہ ہمیں کہاں لے جاتے ہیں۔ ہماری میزبان ہمیں جہاں لے کر گئی وہ بلاشبہ ایک انتہائی خوبصورت مقام تھا اور اس نے اس شام کو یادگار بنا دیا۔

اسریٰ ہمیں گلاطہ برج لے گئی۔ گلاطہ برج کو سمجھانے کے لیے مجھے استنبول کا تھوڑا سا نقشہ بیان کرنا ہوگا۔ استنبول یورپ اور ایشیا کے سنگم پر واقع ہے۔ تاہم ایشیا اور یورپ کی زمین بالکل متصل نہیں ہے بلکہ ان کے بیچ میں پانی موجود ہے۔ یہ پانی کی پٹی آبنائے باسفورس کہلاتی ہے جو دو بڑے سمندروں یعنی بحیرہ اسود اور بحیرہ مرمرہ کو آپس میں ملاتی ہے۔ آبنائے باسفورس گویا کہ سمندر کی وہ حد ہے جس کے ایک طرف ایشیا اور دوسری طرف یورپ ہے۔

آبنائے باسفورس کا پانی جس مقام پر بحیرہ مرمرہ سے ملنے لگتا ہے، اس سے کچھ قبل وہیں یورپی حصے کی زمین میں ایک خلیج سی بنی ہے جس سے باسفورس کا پانی ایک دریا کی مانند کافی دور تک اندر چلا گیا ہے۔ یہ خلیج اس رخ پر ہے کہ اگر بلندی سے دیکھا جائے تو ایسا لگے گا کہ جیسے سینگ کی شکل میں پانی کے دو دھارے سے بن گئے ہیں۔ سینگ کا ایک حصہ یا ایک دھارا آبنائے باسفورس ہے اور دوسرا دھارا یا دوسرا سینگ گولڈن ہارن کہلاتا ہے۔ اس گولڈن ہارن کے دونوں طرف استنبول کا یورپی علاقہ ہے۔ ٹاکسم اسکوائر گولڈن ہارن کے ایک طرف اور سلطان احمد دوسری طرف ہے۔ ایک طرف سے دوسری طرف جانے کے لیے کئی پل ہیں جن میں سب سے مشہور زیادہ استعمال ہونے والا یہی گلاطہ برج ہے۔

جنت کی حسین شام

گلاطہ برج کا اوپر کا حصہ ٹریفک کے لیے مخصوص ہے۔ جبکہ نچلے حصے میں سمندری کھانوں کے ان گنت ریسٹورنٹ ہیں۔ اسریٰ ہمیں اپنے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں لے گئی جو اس کے کزن کا تھا۔ اس نے انتہائی گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ ہم پل کی ریلنگ کے قریب لگی ہوئی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ ہم سے کھانے کا پوچھا گیا تو ہم نے میزبانوں پر چھوڑ دیا۔

ہم یہاں پہنچے تو شام کا وقت ہو رہا تھا۔ اس وقت تک منظر انتہائی خوبصورت ہو چکا تھا۔ باسفورس کا پانی ہمارے سمندر سے انتہائی مختلف اور بہت خوبصورت ہے۔ اس کا پانی ہلکے نیلے رنگ کا ہے جو دیکھنے میں بہت دلکش لگتا ہے۔ اس نیلگوں پانی پر بہت سے جہاز اور کشتیاں آ جا رہے تھے۔ شام کے وقت سورج ڈوب رہا تھا۔ آسمان کھلا ہوا تھا، مگر کہیں کہیں ہوا کے دوش پر تیرتے سفید بادل نیلے آسمان پر بھلے لگ رہے تھے۔ نیلا آسمان زمین کو چھوتے ہوئے، مارے حیا کے سرخ ہو کر شام کے افق پر لالی بکھیر رہا تھا۔ ٹھنڈی اور انتہائی خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔

ہم ریسٹورنٹ میں بیٹھے سمندر میں ڈوبتے سورج کا حسین نظارہ کررہے تھے اور ساتھ میں خوشگوار ہوا کے نرم ولطیف جھونکوں کا لطف اٹھارہے تھے۔

ڈھلتی ہوئی شام، ڈوبتے ہوئے سورج، آتی جاتی کشتیوں، شفق بکھیرتا آسمان، ہچکولے لیتا باسفورس کا نیلا پانی، اڑتے ہوئے پرندوں، لذیذ کھانوں کی خوشبوؤں، مہربان میزبانوں، شہری زندگی کی تمام سہولتوں اور سب سے بڑھ کر رب کریم کی عنایتوں میں یہ شام ایک انتہائی خوبصورت شام تھی۔ رات ہوئی تو اردگرد موجود دکانوں اور علاقے کی روشنیوں نے اس منظر کو ایک دوسرے پہلو سے بہت خوبصورت بنادیا۔ سیاہ آسمان کے نیچے رنگ وروشنی کا ایک سیلاب تھا جو سمندر کے کنارے بنی آبادی پر جگنوؤں کی طرح لگ رہا تھا۔ برج پر ایک لائن میں ڈھیر سارے ریسٹورنٹ بنے تھے جن میں بہت سے لوگ بیٹھے کھانا کھارہے تھے اور اس خوبصورت جگہ کو انجوائے کررہے تھے۔ ایک دوجگہ لوگ خوشی سے رقص بھی کررہے تھے۔

اس ماحول اور ان مناظر نے مجھے مسحور کردیا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس حسین شام کا احساس آنے والے کئی برسوں تک ہم سیاحوں کو سرشار کیے رکھے گا۔ یہ شام جب بھی مجھے یاد آئے گی تو مجھے استنبول ہی نہیں خدا کی جنت بھی یاد آئے گی۔ وہ جنت جس کی ہر شام اس شام سے زیادہ حسین ہوگی۔ جس کا ہر جلوہ یہاں کے جلووں سے جمیل تر ہوگا۔ جس کا وعدہ خدائے رحمٰن نے ہر اس شخص سے کررکھا ہے جو بن دیکھے اس سے ڈرے۔

مگر اس جنت کے متعلق کون دنیا کو بتائے گا؟ آج کا نام نہاد مسلمان جو خوف خدا سے آخری درجہ میں خالی اور ایمان واخلاق کی اصل دینی تعلیم کو بھول کر ظاہری چیزوں کو عین دین بناچکا ہے؟ اور ظاہر پرستی کی اسی جعلی کرنسی سے خدا کی جنت خریدنا چاہتا ہے۔ یا آج کا وہ فرقہ پرست مسلمان جو اپنے تعصّبات سے اوپر اٹھنے کو تیار نہیں؟ یا آج کا وہ قوم پرست مسلمان جو اپنے سیاسی مسائل

کے آئینے میں دین کو دیکھتا اور بیان کرتا ہے؟ یا وہ غافل عوام و خواص جن کو خدا کی یاد ہے نہ اس کی جنت کی؟ خدا خوفی کے اس قحط میں جو شخص ظاہر پرستی، فرقہ پرستی، قوم پرستی اور غفلت سے بلند ہو گیا وہ خدائے رحمٰن کی جنت کا سب سے بڑا حقدار ہے۔ وہی ہو گا جو خدا کی محبت سے سرشار اور اس کے بندوں پر مہربان ہو گا۔ وہی ہو گا جو خدا کے بندوں کو خدا کی جنت کی طرف بلائے گا۔ جنت کی ایسی ہر حسین شام اسی سچے خدا پرست کے نام ہو گی۔

پرنسز آئی لینڈ

اسریٰ نے رات گئے تک ہم کو ہمارے ہوٹل چھوڑ دیا۔ وہ اگلے دن یعنی اتوار کو بھی ہمیں ساتھ لے جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ مگر ہم میاں بیوی نے طے کر لیا تھا کہ اب اسے مزید زحمت نہیں دیں گے۔ چنانچہ ہم نے ہوٹل پہنچ کر اسے میسج کر دیا کہ کل ہم خود پرنسز آئی لینڈ جائیں گے۔

پرنس یا پرنسز آئی لینڈ استنبول سے قریب ہی بحیرہ مرمرہ میں واقع سیاحت کا ایک اہم اور مشہور مقام ہے۔ یہ نو جزائر کا مجموعہ ہے جن میں سے پانچ چھوٹے اور چار بڑے ہیں۔ ان جزائر کا وجہ تسمیہ یہ ہے کہ بازنطینی سلطنت اور عثمانی سلطنت میں بادشاہ کسی شہزادے یا شہزادی سے ناراض ہوتے تو اسے محل سے نکال کر ان جزائر میں بطور سزا بھیج دیا جاتا۔ سلطنت ختم ہو گئی تو ترکی کے طبقہ امراء نے یہاں اپنے گھر بنانا شروع کر دیے۔ سیاح ان سارے جزائر پر نہیں جاتے بلکہ عام طور پر ایک دو اہم اور بڑے جزیروں پر جاتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا جزیرہ ''بیوکادا'' ہے جس کا مطلب ہی بڑا جزیرہ ہے۔

انفارمیشن سنٹر

اتوار 29 مئی کو ہم پرنسز آئی لینڈ کے لیے نکلے۔ اب ہمیں استنبول کے ٹرانسپورٹ سسٹم کو

استعمال کر کے خود ہی اپنی منزل پر پہنچنا تھا۔ جیسا کہ پیچھے کہیں بیان ہو چکا ہے کہ یہاں زبان کا بڑا مسئلہ تھا۔ اس لیے ہر چیز کو خود ہی سمجھنا تھا۔ البتہ ایک سہولت جس سے ثنا نے ہمیں شروع ہی میں متعارف کروادیا تھا وہ ٹیکسم اسکوئر پر موجود انفارمیشن سنٹر تھا۔ اس میں موجود اسٹاف بڑی روانی سے انگریزی بولتا تھا۔ وہ ہر طرح کی نہ صرف رہنمائی کر دیتے تھے بلکہ مفت نقشے، پینے کے لیے پانی اور دیگر چھوٹی موٹی چیزیں گفٹ کر دیتے تھے۔

میری یہاں موجود نوجوان سے اچھی شناسائی ہوگئی کیونکہ میں نے اسے اپنی کتاب When Life Begins جو ''جب زندگی شروع'' ہوگی کا انگریزی ترجمہ ہے، گفٹ کی تھی۔ اس نے ہر دفعہ ہر مقام پر جانے کے لیے میری بڑی رہنمائی کی۔

استنبول کا ٹرانسپورٹ سسٹم

استنبول کا ٹراسپورٹ سسٹم دنیا کے کسی بھی بڑے اور ترقی یافتہ ملک کے ہم پلہ ہے۔ یہ انڈر گراؤنڈ ریلوے، میٹرو، چھوٹی بڑی بسوں اور سمندری کشتیوں پر مشتمل ہے۔ ہم نے ان تمام میں سفر کیا اور ان کو انتہائی آرام دہ اور باسہولت پایا۔ پاکستان کے باقی صوبوں کو تو چھوڑیے کہ جہاں عوام کو ایسی کسی سہولت کا کوئی تصور ہی نہیں، پنجاب میں جہاں میٹرو سسٹم کچھ بڑے شہروں میں موجود ہے، وہ اس سے کہیں کم تر درجے کا ہے۔

اس سفرنامہ کی تحریر کے وقت میں اسلام آباد میں تھا۔ یہاں حال ہی میں میٹرو سسٹم شروع ہوا ہے۔ تجربے کے لیے ایک روز میں نے اس میں سفر کیا تو اندازہ ہوا کہ پاکستانی معیار سے بہت بہتر ہونے کے باوجود یہ کسی طور استنبول کے مقابلے کا نہیں۔ تاہم یہ ماننا چاہیے کہ 20 روپے میں یہ واقعی سستی اور معیاری سواری ہے جو پاکستان کے لحاظ سے عوام کے لیے بڑی سہولت ہے۔

اللہ کی مدد کا ایک تجربہ

استنبول میں چار لیرا میں یکطرفہ سفر ہوتا ہے۔لیکن استنبول کارڈ ہو تو یہی سفر سوا دو لیرا میں طے ہو جاتا ہے۔لیرا ترکی کی کرنسی ہے اور میرے سفر کے وقت تقریباً 37 پاکستانی روپے کے برابر تھا۔ چھ سال کے بچے بغیر کرائے کے سفر کر سکتے ہیں۔ثنا نے یہ ساری باتیں ہمیں بتادی تھیں۔اسے یہ باتیں اپنے قیام کے آخر میں معلوم ہوئی تھیں اور اس نے بغیر کارڈ کے سفر کر کے ہر جگہ اضافی کرایہ دیا اور ساتھ میں بچیوں کا ٹکٹ بھی خریدتی رہی جن کا داخلہ فری تھا۔مگر ہم پہلے دن ہی اس بات کو جاننے کی بنا پر نقصان سے محفوظ رہے۔

خیر ایک دن قبل ہفتے کی صبح جب ہم اسریٰ کا انتظار کر رہے تھے تو ہم نے وقت ضائع کرنے کے بجائے استنبول کارڈ بنوانے کا فیصلہ کیا۔انفارمیشن سنٹر سے معلومات لے کر ٹیکسم اسکوائر پر موجود انڈر گراؤنڈ اسٹیشن چلے گئے جہاں ایک مشین میں پیسے ڈال کر یہ کارڈ بنوایا جاسکتا تھا۔خیر وہاں پہنچے تو دیکھا کہ مشین میں ساری ہدایات ترکی میں درج ہیں۔گویا یہاں کوئی غیر ملکی سیاح آتا ہی نہیں ہے۔

چنانچہ ایک مقامی ترکی خاتون سے انگریزی میں مدد کی درخواست کی۔اس نے مجھ سے پیسے لیے اور ہمارے لیے کارڈ بنوانے کے بجائے ہمارے پیسوں سے اپنا کارڈ چارج کرلیا۔میں نے اسے دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی کہ مجھے اپنا کارڈ بنوانا تھا۔وہ خاتون میری بات سن کر تیزی سے وہاں سے چلی گئی۔میں یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔پہلے دن ہی اپنے ساتھ اس طرح ہاتھ ہو جانے پر میں ششدر رہ گیا۔خیر مرتا کیا نہ کرتا۔آگے جا کر میٹرو میں داخلے کی جگہ پر متعین ایک اہلکار سے درخواست کی مجھے کارڈ بنادے۔انگریزی سے وہ بھی نابلد تھا،مگر میری بات سمجھ گیا۔پھر وہ میرے ساتھ آیا اور میرے پیسوں سے اس نے کارڈ بنادیا۔

عین اسی وقت وہ خاتون لوٹ کر آ گئی۔اس کی اور اہلکار کی گفتگو سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ ہوا کیا تھا۔ پہلے وہ یہ سمجھی تھی کہ میں پیسے دے کر اس کے کارڈ پر سفر کرنا چاہتا ہوں۔اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ کارڈ بنوانے کے اپنے چارجز ہوتے ہیں۔اس لیے شاید کچھ لوگ یہ کرتے ہوں گے کہ جس شخص کا کارڈ بنا ہوا ہے اس کو یکطرفہ سفر کے پیسے دے کر اس کا کارڈ چارج کروا لیتے ہوں گے اور اپنا الگ کارڈ بنوائے بغیر سستا سفر کر لیتے ہوں گے۔یہاں ایک کارڈ ایک ہی وقت میں کئی دفعہ استعمال ہو سکتا تھا۔جیسے میں اور میری اہلیہ میٹرو سسٹم کے اندر داخل ہوتے وقت ایک ہی کارڈ استعمال کرتے تھے۔

خیر جب اسے اندازہ ہوا کہ میں اپنا کارڈ بنوانا چاہتا ہوں تو وہ اندر چلی گئی۔وہ اندر آفس یہ دریافت کرنے گئی ہوگی کہ آیا چارج کیے ہوئے پیسے واپس ہو سکتے ہیں۔مگر شاید یہ ممکن نہ تھا۔خیر جب تک وہ واپس آئی میٹرو اہلکار میرا کارڈ بنوا چکا تھا۔جب اہلکار نے اسے یہ بتایا تو اس نے اپنا زیادہ چارج ہوا کارڈ مجھے دے دیا اور میرا کم پیسوں والا کارڈ خود رکھ لیا۔زیادہ پیسوں والی بات مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب میں نے خود کارڈ کا بیلنس چیک کیا۔یوں اس نیک خاتون نے رک کر نہ صرف ہماری مدد کی بلکہ زیادہ پیسے بھی دے دیے۔اس خاتون کی یہ مدد ہم مسافروں پر اللہ کی ایک عنایت تھی۔الحمدللہ ترکوں کا یہ احسان میں نے سفر کے آخر میں اتار دیا، مگر اس بات کا ایک اثر دل پر ہوا جو تا زیست رہے گا۔

خدا، انسان اور سراب

بعض قارئین یہ سوچ رہے ہوں گے کہ مصنف نے یہ واقعہ کیوں بیان کیا۔اور کیا بھی تھا تو اس نیک دل خاتون کی تعریف کرنے کے بجائے مصنف اسے اللہ کی عنایت کے خانے میں ڈال دیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس خاتون نے بڑی نیکی کی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ''نیک'' خاتون کے ظاہری حلیے کو ہمارے جیسا نام نہاد نیک شخص دیکھتا تو اس کے مغرب زدہ ہونے کی تصدیق پا کر اس کے جہنمی ہونے کا فتویٰ دے دیتا۔ تاہم مجھے تو جب بھی وہ خاتون یاد آئی میں نے اس کے لیے دعا کی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی عنایت کا ذکر کرنا اس لیے ضروری تھا کہ میرا ایک معمول ہے کہ میں ہر سفر میں نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول تمام دعائیں پڑھتا ہوں بلکہ ہر قدم پر اللہ تعالیٰ سے عافیت، آسانی اور مدد کی درخواست کرتا رہتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے پیچھے اگر کوئی لگ جائے تو وہ اس کی فریاد ضرور سنتے ہیں۔ اس کے لیے کوئی نیک ہونا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے جیسے گناہ گاروں کو بھی ان کے تمام تر گناہوں کے باوجود اپنی نظر عنایت سے محروم نہیں کرتے۔ اس لیے اپنے ہر سفر میں بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر اس گنہ گار نے ہمیشہ اللہ کی غیر معمولی مدد اور عنایت کا تجربہ کیا ہے۔ ہاں جو لوگ غیر اللہ کے پیچھے لگتے ہیں وہ سراب کے پیچھے بھاگتے ہیں اور سرابوں کے پیچھے بھاگنے والوں کے حصے میں مایوسی کے سوا کچھ اور نہیں آتا۔

فیری اور بگھی

خیر یہ تو ایک دن پہلے کی کہانی تھی۔ اگلے دن اتوار ٹاکسم اسکوائر سے ہم کباتش کے لیے روانہ ہوئے۔ کباتش لب ساحل وہ جگہ تھی جو سمندر کی کشتیوں اور میٹرو بس دونوں کا آخری اسٹاپ تھا۔ ٹاکسم سے زیر زمین سرنگ میں بجلی سے چلنے والی ریلوے شٹل وہاں مستقل آتی جاتی تھی اور کسی دوسری ٹرین کا روٹ وہاں نہیں تھا۔ یہ ایک انتہائی آرام دہ ٹرین تھی جس میں دو ڈبے لگے ہوئے تھے۔ کباتش سے ہم نے وہ فیری لی جو پرنسز آئی لینڈ جاتی تھی۔

استنبول سے اس بڑی کشتی یا فیری میں پرنسز آئی لینڈ کا تقریباً ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ یہ بحری سفر

اپنی ذات میں ایک بہت خوشگوار تجربہ تھا۔ دو منزلہ فیری مرمرہ سمندر کے نیلے پانی کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جارہی تھی۔ ہم فیری میں ہر جگہ گھوم کر سمندر اور ساحل کا نظارہ کررہے تھے۔ یہ فیری پہلے Heybeliada کے جزیرے پر رکی جو دوسرا بڑا جزیرہ تھا۔ پھر ہم اپنی منزل مقصود بیوکادا کے جزیرے پر پہنچے۔

ہزارہا سیاح یہاں موجود تھے۔ لب ساحل درجنوں ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے۔ ان میں مختلف طرح کی سمندری غذائیں کھانے والے کے ذوق کی تسکین کے لیے مہیا تھیں۔ جبکہ آگے کی سمت سیکڑوں قسم کی دکانوں میں مختلف اشیا فروخت کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔

ہم نے سب سے پہلے ایک مسجد ڈھونڈ کر ظہر کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد جزیرے پر گھومنے کا مرحلہ آیا۔ اس کے دو ہی طریقے تھے۔ ایک یہ کہ سائیکل کرائے پر لی جائے اور دوسرا بگھی کی سواری کی جائے۔ کسی مشینی سواری کی جزیرے پر اجازت نہ تھی۔ ہمارے لیے سائیکل تو ممکن نہ تھی۔ بعد میں معلوم بھی ہوا کہ یہاں یہ بہت خطرناک سواری ہے۔ خیر ہم بگھی کی طویل لائن میں لگ گئے۔ ہمارا نمبر آیا ایک بگھی میں ہم تینوں سوار ہوگئے۔ اس کا کرایہ 80 لیرا تھا۔ ترکی کی کم مہنگائی کے لحاظ سے یہ کرایہ زیادہ لگا۔

ہائے رے موسم

بگھی روانہ ہوئی تو جزیرے کے مختلف مقامات سامنے آنے لگے۔ یہ جزائر ہموار زمین نہیں بلکہ اونچی نیچی پہاڑیوں پر مشتمل ہیں۔ چنانچہ بگھی مسلسل چڑھائی اور نشیب میں چل رہی تھی۔ ساتھ ساتھ سائیکل سوار بھی آجارہے تھے۔ یہیں پر ہم نے دو ایکسڈنٹ دیکھے۔ دراصل بگھی میں بریک تو ہوتا نہیں۔ دوسری طرف نشیب میں سائیکل کی رفتار کافی بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ زبردست جھگڑا ہورہا تھا۔ معلوم ہوا کہ کسی فیملی کو بگھی والے نے ٹکر ماردی ہے۔ دوسرے میں بھی

ایک سائیکل سوار لڑکی زخمی ہوئی تھی۔

خیر ایک جگہ پہنچ کر بگھی والے نے بگھی روک دی۔ یہ غالبًا جزیرے کا سب سے زیادہ بلند مقام تھا۔ مگر ہر طرف اتنے درخت تھے کہ دور کا نظارہ ممکن نہ تھا۔ یہی راستے میں بھی ہوا تھا۔ ہر جگہ اتنے درخت تھے کہ ایک جنگل کا گمان ہورہا تھا۔ مگر یہ درخت نیچے موجود سمندر کے دلکش نظارے کی راہ میں حائل تھے۔ اس جگہ بس ایک پارک تھا جہاں بچوں کے کھیلنے کے لیے جھولے بھی تھے۔ سو یہاں سوائے اس کے کہ ہم اپنے بچے کو جھولوں میں بٹھائیں، کوئی کام نہ تھا۔ اس کام کے لیے اتنی دور آنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ پانچ دس منٹ بعد بگھی والے نے روانگی کے لیے کہا۔ کچھ ہی دیر میں ہم واپس پہنچ گئے۔

سوال یہ تھا کہ اب ہم کیا کریں۔ موسم ابر آلود ہوتا تو یہ جگہ کمال لگتی، مگر آج گرمی اور سخت دھوپ تھی۔ اونچے نیچے راستوں پر عین دوپہر میں دو قدم چلنا مشکل تھا۔ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ ہم واپس جاتے ہوئے سمندر میں ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر دیکھیں۔ مغرب مقامی وقت کے مطابق ساڑھے آٹھ بجے تھی۔ جبکہ ابھی صرف تین بجے تھے۔ کھانا ہم نے کھانا نہیں تھا کہ ہوٹل کا فری کا ناشتہ سیر ہو کر کرنے کے بعد دوپہر کے کھانے کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔ دکانوں سے کچھ خریدنا ہم کو نہیں تھا۔ ہم شہر کراچی کے باسی ہیں، اس لیے صرف ساحل سمندر وہ بھی اس گرمی میں اپنی ذات میں کوئی غیر معمولی کشش نہیں رکھتا۔ ویسے بھی راستے میں آتے جاتے سمندر بہت دیکھ لیا تھا۔ بگھی کے راستے میں کئی جگہ بہت خوبصورت منظر سامنے آئے تھے۔ مگر مسلسل چڑھائی پر پیدل چل کر ان تک پہنچنا بہت مشکل تھا۔ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں یہ اور مشکل تھا۔ جبکہ سائیکل سواروں کا انجام سامنے تھا۔

ترکی دولہا دلہن اور عوامی فوٹو گرافی

بہرحال ہم نے ہمت کر کے پیدل واپس اوپر جانے کی کوشش کی۔ راستے میں ہر جگہ پرانی وضع کے مکانات نظر آئے۔ مگر مکین ایک بھی نظر نہ آیا۔ ایک دو جگہ کچھ اچھے مناظر ملے جہاں سے سمندر کا بہت خوبصورت نظارہ نظر آرہا تھا۔ مگر مکانوں کے بیچ اور تارکول کی سڑک پر سخت گرمی میں ان کو دیکھنے میں کوئی لطف نہ تھا۔ تاہم یہ اندازہ ضرور ہوا کہ اس پرسکون اور پلوشن فری ماحول میں یہاں رہنے والے صبح و شام اور بادل و برسات کے وقت میں ان مناظر کو دیکھ کر فردوس کی دنیا کو اس آئینے میں ضرور دیکھ لیتے ہوں گے۔

خیر ایک جگہ چھاؤں میں کچھ خالی نشستیں نظر آئیں تو ان پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر میں دیکھا کہ ایک دولہا دلہن ہر جگہ فوٹو گرافروں کو ساتھ لے کر تصویریں کھنچواتے پھر رہے ہیں۔ یہ ہم نے گوریم کے شہر میں بھی دیکھا کہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی دولہا دلہن عین دوپہر میں لباس عروسی زیب تن کئے مختلف تفریحی اور عوامی مقامات پر تصویریں کھنچواتے پھر رہے ہیں۔ وہاں ہماری گائڈ جانان نے ہم کو یہ بتایا کہ یہ ترکی کا رواج ہے کہ شادی کے بعد دولہا دلہن تفریحی مقامات پر جا کر فوٹو سیشن کرواتے ہیں۔ ہمیں تو خیر اس روایت میں کوئی معقول بات سمجھ میں نہیں آئی۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہر روایت معقول ہوتی ہی کہاں ہے۔ روایت تو بس روایت ہوتی ہے جو وقت کے ساتھ مقدس ہو جاتی ہے۔

دھوپ چھاؤں، خزاں اور بہار

خیر اسی میں چار بج گئے۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ باقی وقت کیسے گزاریں کہ مغرب سے پہلے فیری میں بیٹھ کر جائیں اور ڈوبتے سورج کا منظر دیکھیں۔ گرمی نے ویسے ہی بے حال کر دیا تھا اور کرنے کو کچھ نہ تھا۔ آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ واپس ہوٹل چلتے ہیں۔ چنانچہ واپسی کا سفر شروع ہوا۔ جو نسبتاً پژمردہ انداز میں طے کیا۔ کیونکہ ہم نے سب سے زیادہ تعریف پرنسز آئی لینڈ کی سن

رکھی تھی۔ مگر یہاں آ کر کوئی خاص مزہ نہیں آیا تھا۔ مگر ہم اس بات سے بے خبر تھے کہ سفر کے بہترین مقامات اور بہترین دن ابھی آنے والے ہیں۔

یہی اس دنیا کا اصول ہے۔ یہاں بعض دن اچھے نہیں ہوتے۔ بعض ماہ و سال اور موسم بھی اچھے نہیں ہوتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو جس اصول پر بنایا ہے اس میں آنے والے دنوں میں اکثر زیادہ بھلائی ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسے مواقع پر انسان کو صبر کرتے ہوئے ہمیشہ مستقبل پر نظر رکھنا چاہیے۔ کسی معاملے میں توقع پوری نہ ہو تو دلبرداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ کی دنیا اسی اصول پر بنی ہے۔ کبھی رات کبھی دن۔ کبھی دھوپ کبھی چھاؤں۔ کبھی خزاں کبھی بہار۔ اللہ تعالیٰ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ بندہ زندگی کی بہار اور نعمتوں کی چھاؤں میں شکر گزار رہتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح بندہ زندگی کی خزاں اور محرومی کی دھوپ میں ثابت قدم رہتا ہے یا نہیں۔ جنت کی ابدی بہار اور فردوس کی ابدی چھاؤں ایسے ہی لوگوں کا بدلہ ہے۔

کمیونیکیشن ایج اور اسلام کی دعوت

جیسا کہ شروع میں بیان ہوا کہ ہمارا یہ سفر بغیر کسی تیاری کے بہت جلدی میں ہوا تھا۔ اس لیے کہیں ہوٹل وغیرہ کچھ بھی بک نہ کرا پائے تھے۔ چلنے سے کچھ دیر قبل آن لائن اِسی ہوٹل کی بکنگ کرالی تھی جس میں اب مقیم تھے۔ ثنا کے ساتھ جو ابتدائی پروگرام طے ہوا تھا اس کے مطابق ہمیں استنبول کے علاوہ گوریم کے شہر بھی جانا تھا جو ترکی کے وسط میں اناطولیہ کے علاقے میں واقع تھا۔ ویزہ میں تاخیر کی وجہ سے وہاں کا پروگرام بھی ثنا کے ساتھ ممکن نہ ہوسکا۔ ترکی روانگی سے قبل جہاز کی بکنگ آن لائن کرانا چاہی تو وہاں جانے کے لیے جو سیٹ دستیاب ہوئی، وہ ثنا کی واپسی کے بعد 31 تاریخ کی تھی۔ اب پرسوں ہماری وہاں روانگی تھی اور کوئی ہوٹل ابھی تک بک نہیں کرایا تھا۔ میری اہلیہ نے انٹرنیٹ پر بہت ڈھونڈ کر ایک اچھا ہوٹل نکال لیا۔ کریڈٹ کارڈ

سے ایڈوانس ادائیگی کی وجہ سے ہوٹل کافی سستا مل گیا۔ یوں ہم نے اس کی آن لائن بکنگ کرالی۔

ثنا نے جو پہلے ہی سے گوریم میں موجود تھی ہمیں بتادیا تھا کہ وہاں بھی ایئرپورٹ سے شہر تک ٹیکسی کا کرایہ کافی زیادہ تھا۔ چنانچہ میں نے انٹرنیٹ پر شٹل طریقہ ڈھونڈا تو معلوم ہوا 25 لیرا میں شٹل مل رہی، مگر اس کے لیے فون کر کے بکنگ کرانی ہوگی۔ ہمارے پاس فون تھا نہ ہمیں ترکی آتی تھی۔ نہ اتنا وقت تھا کہ ای میل بھیج کر اس کا انتظار کرتے۔ چنانچہ اسریٰ کو فون کر کے اسے شٹل کا نمبر دیا۔ تھوڑی دیر میں اس نے شٹل کی بکنگ کرادی۔ ساتھ میں جو کچھ اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں ہمیں بتایا اس سے ہم نے یہ سمجھ لیا کہ فنڈا نام کا شٹل ڈرائیور ائیرپورٹ پر ہمیں لینے آئے گا۔

واپس آ کر بھی دو چار دن ہمیں استنبول رکنا تھا۔ چنانچہ ہم نے ایک ہوٹل جا کر پسند کیا۔ اور انٹرنیٹ پر اس کی بکنگ کرالی۔ ہوٹل والے نے اس کے ریٹ کافی زیادہ بتائے تھے، مگر نیٹ پر مخصوص ویب سائٹ پر اس ہوٹل کا کمرہ کافی سستا مل گیا۔ اسی طرح ہم موبائل فون سے جو فوٹو لے رہے تھے وہ وائی فائی اور انٹرنیٹ کے ذریعے سے اپنے احباب کو منتقل بھی کرتے جا رہے تھے۔ گھر والوں سے بھی اسی سے بات کر رہے تھے۔ اسریٰ کے حوالے سے موبائل اور انٹرنیٹ کے ذریعے سے ترجمے کا ذکر پیچھے گزر چکا ہے۔ اسریٰ کے ساتھ دوران سفر یہ تجربہ بھی ہوا کہ وہ جہاں ٹریفک میں پھنستی فوراً انٹرنیٹ کے ذریعے سے دوسرا متبادل راستہ ڈھونڈ کر کسی اور سڑک سے نکل جاتی۔

کریڈٹ کارڈ کے علاوہ اس سفر میں پیسے کی جب بھی ضرورت پیش آئی تو اپنے پاکستانی اے ٹی ایم کارڈ سے ترکی میں ہر جگہ مقامی کرنسی میں اس طرح پیسے نکلوائے جیسے میرا اکاؤنٹ

یہیں موجود ہو۔اس کے علاوہ موبائل فون، انٹرنیٹ اور سیٹلائیٹ ٹیکنالوجی ہی کا کمال تھا کہ سفر پر ہر قدم پر میں یہ پہلے سے معلوم کرنے کی پوزیشن میں تھا کہ اگلے دن یا اگلے پہر کیسا موسم ہوگا۔ درجہ حرارت کیا ہوگا۔ دھوپ ہوگی یا ابر۔خنکی ہوگی یا گرمی۔ بارش ہوگی یا کھلا موسم ہوگا۔ہوٹل میں نماز کے لیے قبلہ بھی انٹرنیٹ کی مدد سے معلوم کیا تھا۔

اس ساری تفصیل کو بتانے کا مقصد یہ ہے کہ انٹرنیٹ اور موبائل فون کے مجموعے نے دنیا کو بدل کر رکھ دیا۔انسان کو زندگی میں وہ سہولتیں اور آسانیاں عطا کی ہیں کہ جن کی کوئی حد نہیں۔ یہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے اور شکر گزاری کرنے کا ایک عظیم موقع ہے۔مگر لوگ ان ذرائع کو بھرپور طریقے سے استعمال کرتے ہیں مگر شکر گزاری کے بجائے یہ چیزیں غفلت اور معصیت کا سبب بن رہی ہیں۔

تاہم میرے نزدیک کمیونیکیشن اور انفارمیشن کے میدان میں یہ انقلابی تبدیلی ایک سادہ تبدیلی نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس منصوبے کا آغاز ہے جس کے تحت وہ پوری دنیا تک اپنا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ کام اصل میں تو امت مسلمہ کی ذمہ داری تھی جو اس نے پوری نہیں کی۔ بظاہر مستقبل میں بھی امت اور اس کی لیڈرشپ کا اس بات کا کوئی ارادہ نہیں لگتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرا انتظام کر دیا ہے۔اس انتظام میں ایک طرف دین کی حقیقی دعوت ہر قسم کے اضافوں سے پاک کر کے اصل شکل میں واضح کر دی گئی ہے۔ یہ دعوت اس طرح واضح ہے کہ جو شخص تعصب اور غفلت سے بلند ہو جائے وہ اسے بآسانی پا سکتا ہے۔دوسری طرف اس دعوت کو دنیا بھر میں پہنچانے کے لیے انفارمیشن ایج اور کمیونیکیشن ایج کا آغاز کر دیا گیا ہے۔اب وہ لوگ بہت خوش نصیب ہیں جو غفلت و تعصب سے بلند ہو کر اس دعوت کو دریافت کریں، اسے اپنی زندگی بنائیں اور پھر اس کو زندگی کا مشن بنا کر دنیا بھر تک پہنچائیں۔ یہ پروردگار عالم کی اعلیٰ ترین

عنایات بہت آسانی کے ساتھ حاصل کرنے کا وہ سنہری موقع ہے جو نہ کبھی پہلے کسی کو دیا گیا اور نہ کبھی آئندہ کسی کو دیا جائے گا۔

توپ کاپی پیلس میوزیم

اگلے دن پیر 30 مئی کو ہم نے توپ کاپی پیلس دیکھنے کا پروگرام بنایا۔ کباتش پہنچ کر پہلی دفعہ میٹرو بس میں بیٹھے۔ یہ بجلی سے چلنے والی انتہائی آرام دہ بس تھی۔ ہمارے پاس نقشہ تھا۔ اس میں توپ کاپی کے اسٹیشن کا ذکر تھا اور یہ کافی دور تھا۔ ہم وہاں جا کر اتر گئے۔ پتہ چلا کہ یہ تو صرف نام کا توپ کاپی ہے۔ اصل توپ کاپی پیلس تو سلطان احمد اسٹیشن پر واقع ہے۔ خیر واپس لوٹے اور سلطان احمد پہنچ گئے۔ یہاں ساری جگہ جانی پہچانی تھی کیوں کہ اسریٰ اور فلس کے ساتھ پرسوں ہی یہاں خوب گھومے تھے۔ بلو مسجد اور آیا صوفیہ کو باہر سے دیکھتے ہوئے ہم توپ کاپی میوزیم کے صدر دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ دور دور تک ایک وسیع و عریض باغ کا منظر تھا۔ اس کے بعد محل کے داخلی دروازے سے قبل ٹکٹ گھر آیا۔ چالیس لیرا کا ایک ٹکٹ تھا جسے خرید کر ہم اندر داخل ہو گئے۔

توپ کاپی محل ایک عمارت پر مشتمل معروف معنوں میں ایک محل نہ تھا۔ بلکہ یہ متعدد حصوں، عمارتوں اور بیٹھکوں پر مشتمل گویا کہ ایک قلعہ تھا۔ سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے بعد اس جگہ پر اپنے لیے ایک محل تعمیر کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہاں آیا صوفیا کا چرچ اور بازنطینی دور کی بعض تعمیرات پہلے سے موجود تھیں، مگر کوئی محل یا قلعہ نہ تھا۔ سلطان محمد فاتح کا محل 1459ء میں بنا اور اگلی چار صدیوں تک عثمانی سلاطین کی رہائش گاہ رہا۔ سلاطین اور ان کے وزرا اپنے ذوق کے مطابق عمارات میں تبدیلی یا اضافہ کرواتے رہے۔ یہاں تک کہ 1856 میں سلطان عبدالحمید نے ڈولما محل کے نام سے مغربی طرز تعمیر کا ایک محل اس جگہ بنالیا جہاں اب کباتش

موجود ہے۔

تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ جگہ کے لحاظ سے سلطان محمد فاتح کا انتخاب بہترین تھا۔توپ کاپی محل استنبول کی سات مشہور پہاڑیوں میں سے پہلی پہاڑی کے اختتامی حصے پر اس جگہ موجود تھا جہاں یہ پہاڑی سمندر کی سمت ایک دم سے اس طرح ختم ہوتی ہے کہ اوپر پہاڑی اور نیچے گہرائی میں سمندر ہے۔آیا صوفیا اور بلو مسجد دونوں اس سے پہلے آتے ہیں۔اس جگہ سے کھڑے ہوکر بیک وقت بحیرہ مرمرہ، گولڈن ہارن اور باسفورس یعنی تین سمت میں سمندر کے تین مختلف حصے دیکھے جاسکتے ہیں۔اس جگہ سے یہ منظر اتنا خوبصورت ہے کہ ہم لوگ بہت دیر تک اس آخری حصے پر بیٹھے بلندی سے سمندر کا نظارہ کرتے رہے۔

توپ کاپی: ایک علامت

توپ کاپی صرف ایک محل کا نام نہیں ہے۔ یہ انسانی تاریخ کی عظیم ترین سلطنت کا نام بھی ہے جس نے چھ صدیوں تک دنیا پر راج کیا اور جس کی حکومت دنیا کے تین بر اعظموں یورپ، ایشیا اور افریقہ میں قائم تھی۔اس عظمت کو جاننے کے لیے عثمانی خلافت کی تاریخ کو مختصر سمجھنا ہوگا۔

عثمانی سلطنت کا آغاز عثمان اول (1326-1281) سے ہوتا ہے جب 1299ء میں انھوں نے زوال پذیر سلجوقی سلطنت سے الگ ہوکر اپنی باقاعدہ خودمختار ریاست قائم کرنے کا اعلان کیا۔ان کا علاقہ موجودہ ترکی کے شمال مغرب میں واقع ایک چھوٹا سا شہر تھا جس کا نام ’’اسکی شہر‘‘ ہے۔عثمانی خاندان میں پے در پے اولعزم سلاطین پیدا ہوئے جو بتدریج سلطنت کا رقبہ بڑھاتے چلے گئے ۔عثمانیوں نے 1453 میں سلطان محمد فاتح (1432-1481) کی قیادت میں قسطنطنیہ پر قبضہ کرکے بازنطینی سلطنت کا خاتمہ کردیا۔یوں گویا کہ وہ رومی سلطنت

کے جانشین ہو گئے۔سلطان سلیم (1465-1520) کے زمانے میں مصر و مشرق وسطیٰ پر ان کا اقتدار قائم ہوا۔خلافت عباسیہ کا خاتمہ 1258 میں تا تاریوں کے ہاتھوں ہو چکا تھا مگر ان کی آل واولاد مصر میں مقیم تھی۔سلیم نے مصر میں ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیا سے منسوب تبرکات حاصل کیے اوراس روحانی نسبت کے بعد خلافت کا اعلان کر دیا۔یوں ڈھائی سو برس کے بعد سلطان سلیم مسلمانوں کا مرکزی خلیفہ بن گیا۔اس نے حجاز پر قبضے کے بعد وہاں کا حاکم کہلانے کے بجائے خود کو خادم الحرمین کہلوایا۔

سلیم کے بیٹے (1494-1566) سلیمان عالیشان کے زمانے میں عثمانیوں کا اقتدار اپنے عروج پر جا پہنچا۔خلیج فارس سے لے کر بحیرہ روم تک،شمال میں قفقاز سے لے کر جنوب میں موجودہ الجزائر تک،مغرب میں آسٹریا سے لے کر مشرق میں ایران تک عثمانیوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔آج کے دور میں جنوب مشرقی یورپ،مغربی ایشیا،مشرق وسطیٰ،شمالی افریقہ اور روس کی سمت قفقاز تک کے جس علاقے میں درجنوں ممالک قائم ہیں وہ عثمانی سلطنت کا حصہ تھا۔ سیاسی،جغرافیائی،فوجی اور معاشی اعتبار سے یہ دنیا کی تاریخ کی سب سے بڑی،مستحکم،مرکزی سلطنت تھی۔تاہم اس کے بعد عثمانی خلافت کو بتدریج زوال شروع ہوا۔انیسویں صدی تک یہ زوال تیز ہو گیا اور تقریباً چھ صدیوں تک ایک طاقتور ریاست اور مسلمانوں کی مرکزی خلافت کی حیثیت قائم رکھنے کے بعد پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر 1922 میں خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

توپ کاپی محل کے اثرات

میں اس تاریخ سے مختصراً اپنی اہلیہ کو آگاہ کر رہا تھا۔وہ ترکی کے بعض تاریخی ڈراموں کی وجہ سے کچھ نہ کچھ اس سے واقف بھی تھیں۔ہم کئی گھنٹے وہاں رکے۔اور وہاں در و دیوار کو دیکھتے ہوئے بڑے گہرے تاثر کا شکار ہوئے۔ایک طرف اس محل کے ساتھ عظمت کے ایسے افسانے

وابستہ تھے اور دوسری طرف محل کے خالی اور ویران در ودیوار جن میں چند لیرا دے کر کوئی بھی جا سکتا تھا۔ ایک طرف خلافت، بادشاہت، سلطنت کا وہ جاہ حشم کہ ادنیٰ گستاخی پر ایک اشارے پر کسی کا سر تن سے جدا ہو جاتا تھا اور آج یہ حال تھا کہ لوگ اپنے پاؤں تلے عظمت کے نشانوں کو روندتے ہوئے محل کے اندر ہر طرف دندناتے پھر رہے ہیں۔ ایک طرف یہ حال تھا کہ دنیا بھر کی حسین ترین عورتوں سے بادشاہوں کا حرم بھرا رہتا تھا اور جہاں خواجہ سرا کے علاوہ کسی مرد کا سایہ بھی نہیں جا سکتا تھا، آج اس حرم میں ہر شخص ٹکٹ خرید کر جا سکتا تھا۔ ایک وقت تھا کہ دنیا بھر کے سفیر شرف بازیابی کے منتظر رہتے تھے اور آج دنیا بھر کے سیاح اپنی مرضی کے مطابق جہاں چاہتے اطمینان سے چلے جاتے۔ توپ کاپی محل میں پہاڑی کے کونے میں بنی مسجد کے سائے تلے بیٹھ کر میں یہ دیر تک سوچتا رہا کہ یہ دنیا اس کی بادشاہت، اس کی رونق، اس کی لذت، اس کی شان وشوکت، اس کا مال، اس کا جمال، اس کی قوت، اس کی طاقت کتنا بڑا دھوکہ ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی پر یہاں آکر گہرا اثر ہوا۔ تاریخی عظمت کا بھی اور اس عبرت کا بھی جو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی مفید ہوگا کہ ایک اجنبی جب اس تاریخی عظمت سے اتنا متاثر ہوتا ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ترک قوم پر اس کا کیسا اثر ہوگا۔ یہ اثر پہلی جنگ عظیم کے موقع پر پوری طرح یوں ظاہر ہوا کہ جب ترکوں کے اپنے اصل علاقے یعنی موجودہ ترکی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی گئی تو ترکوں نے متحدہ یورپی قوت کو بھرپور شکست دی۔ یہ اثر دوبارہ اس وقت ظاہر ہوا جب سیکولر طاقتوں نے تقریباً پون صدی تک اسلام کی روح کو یہاں سے نکالنے کی کوشش کی۔ مگر انھیں اس میں شدید ناکامی ہوئی۔ لباس اور ثقافت کے بعض مظاہر اور آزادی کی روایت کے کچھ پہلوؤں کو چھوڑ کر ترک آج بھی انتہائی گہرے مسلمان ہیں۔ بدیع الزماں نورسی، فتح اللہ

گولن، طیب اردگان اسی اسلامی روح کے مظاہر ہیں۔تاہم ان کے باہمی معاملات، ترکی کی موجودہ بغاوت وغیرہ پر اگر یاد رہا تو کہیں آگے چل کر بات ہوگی۔

میوزیم اور تبرکات

جیسا کہ عرض کیا کہ یہ محل بہت سی عمارات پر مشتمل ہے۔ پہلے ایک بڑا اصدر دروازہ ہے۔ اس کے بعد ایک بڑا قطعہ ارضی ہے جو اب ایک پارک کا سا منظر پیش کرتا ہے۔ پھر دوسرا دروازہ آتا ہے جو کہ اصل محل میں داخلے کا دروازہ ہے۔ یہاں شاہی دیوان ہے جہاں بادشاہ امرا سے ملتا تھا۔ یہ خوبصورت نقش ونگار سے مزین ایک ہال نما عمارت ہے۔اسی طرف ایک ہال میں مختلف زمانوں کا قدیم اسلحہ نمائش کے لیے موجود ہے جبکہ اس کے مقابل کے ہال میں مختلف قیمتی اشیا اور خلفاء کا شاہی خزانہ نمائش کے لیے رکھا گیا ہے۔

اس کے بعد تیسرے دروازے سے بادشاہ کی ذاتی رہائش شروع ہوتی ہے جہاں اُس دور میں دوسروں کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔اس جگہ کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہاں وہ متبرکات موجود ہیں جن کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، انبیائے بنی اسرائیل اور خلفائے راشدین سے ہے۔

ہم یہاں پہنچے تو دیکھا کہ الگ الگ کمروں میں مختلف متبرکات رکھے ہوئے ہیں۔ پہلے حصے میں انبیائے بنی اسرائیل سے منسوب چیزیں ہیں۔جیسے حضرت داؤد کی تلوار، حضرت یوسف کا عمامہ اور حضرت موسیٰ کا عصا وغیرہ۔ دوسرے کمرے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین سے متعلق متبرکات موجود ہیں۔تیسرے میں موئے مبارک، حضرت حسین اور حضرت فاطمہ سے منسوب لباس موجود ہیں۔

یہاں پر ایک قاری خوبصورت انداز میں قرآن مجید کی تلاوت کررہا تھا۔جس سے ماحول

میں تقدس کا احساس زندہ تھا۔ یہاں آ کر ایک سب سے بڑا احساس یہ زندہ ہوا کہ ایک ایمپائر وہ تھی جس کو بادشاہوں نے قائم کیا۔ بادشاہوں کی بنائی ہوئی ایمپائر آخر کار ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری ایمپائر انبیا علیھم السلام نے قائم کی۔ یہ دعوہ ایمپائر تھی۔ یہ وہ ایمپائر جس نے پوری کی پوری قومیں پیدا کر دیں۔اس کے نتیجے میں سلطنتیں قائم ہوئیں۔اور یہ وہ ایمپائر جو کل قیامت کے دن جنت میں لوگوں کی بادشاہت قائم کرنے کا باعث بنے گی۔

یہاں کا اصل سبق میرے لیے یہ تھا کہ مسلمانوں کو دنیا کی سلطنت کے بجائے دعوہ ایمپائر قائم کرنے کی جدوجہد کرنا چاہیے۔ کیونکہ دنیا اور آخرت کی ہر خیر اسی دعوہ ایمپائر سے جنم لیتی ہے۔مسلمان جس سیاسی اقتدار کے پیچھے لگے ہیں،اس کا راستہ بھی یہیں سے کھلتا ہے۔

کنیزیں اور حرم

بادشاہ کی ذاتی رہائش گاہ سے ایک سمت حرم کا راستہ نکلتا ہے جہاں بادشاہوں کی کنیزیں رہا کرتی تھیں۔خیال رہے کہ خلفاء شادیاں نہیں کرتے تھے بلکہ کنیزیں رکھا کرتے تھے۔ان میں سے جو کنیز بادشاہ کی اولاد کو جنم دیتی وہ ممتاز حیثیت اختیار کر لیتی اور جس کا بیٹا تخت نشین ہو جاتا وہ والدہ سلطان کا لقب پا کر حرم کی سرپرست بن جاتی۔شادیاں نہ کرنے کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب بایزید یلدرم کو تیمور لنگ نے 1402 میں ایک جنگ میں شکست دے کر اسے قید کر لیا تو اسے پنجرے میں قید کر کے دربار میں لایا گیا اور اس کی بیویوں کو برہنہ کر کے اہل دربار کو شراب پلانے پر معمور کیا گیا۔

اس ذلت آمیز سلوک سے سلطان قید ہی میں مر گیا۔ تیمور کے بعد یلدرم کے اولعزم بیٹوں نے عثمانی سلطنت کا اقتدار اور عزت کئی زیادہ بڑے پیمانے پر بحال کر دی لیکن اس کے بعد انھوں نے شادیاں کرنے کے بجائے کنیزیں رکھنے کو ترجیح دی۔تاہم بہت سے محققین کے نزدیک یہ

سب افسانہ ہے۔

بادشاہ کا حرم

مسلمان بادشاہوں کے حرم کی داستانیں بہت مشہور رہیں۔ تاہم ترکی کے سلاطین اس معاملے میں سب سے زیادہ آگے رہے۔ ان کا اقتدار چونکہ اہل مغرب کے علاقوں پر بھی قائم ہو چکا تھا اس لیے مشرق کے ساتھ مغرب کی حسین ترین سفید فام خواتین بھی ان کے حرم میں کثرت سے موجود رہتی تھیں۔ یہ خواتین بادشاہ کے دل بہلانے کا سامان ہی نہیں تھیں بلکہ اس کی طاقت، عظمت اور مردانگی کا ایک اظہار بھی تھیں۔ دنیا بھر سے خریدی گئی یا تحفے میں ملی ہوئی یہ لڑکیاں شاہی محل لائی جاتیں۔ ان کی تربیت کی جاتی۔ ان کے حسن کو نکھارا جاتا اور پھر بادشاہ کے حرم میں شامل کر لیا جاتا تھا۔

حرم کی یہ عمارت وہیں موجود تھی۔ ہم نے وہاں جانا چاہا تو معلوم ہوا کہ اس کا ٹکٹ چھ بجے بند ہو چکا ہے۔ یہ ایک بند سی جگہ تھی۔ یہاں اس زمانے میں خواجہ سراؤں کے علاوہ کسی اور کو داخلے کی اجازت نہ تھی۔ جو لڑکی یہاں ایک دفعہ داخل ہو جاتی وہ گویا ساری زندگی کے لیے ایک سنہری پنجرے کی اسیر ہو جاتی۔ دنیا بھر کی نعمتیں یہاں موجود تھیں، مگر ظاہر ہے کہ بادشاہ کس کس کو اور کتنی دیر تک اپنا قرب عطا کرتا۔ ہاں جن کا نصیب جاگتا اور جو بادشاہ کی منظور نظر بن جاتیں ان کا سکہ ہر جگہ چلنے لگتا۔ باقی لڑکیاں حسد اور محرومی کا شکار ہو کر اس سنہری پنجرے میں زندگی گزار دیتیں۔

حرم عثمانیوں کے ہاں ایک انسٹیٹیوشن بن گیا تھا۔ سلیمان عالیشان کے بعد ایک دور میں تقریباً سوا سو سال تک حرم کی خواتین کا اثر و رسوخ اتنا بڑھا کہ بادشاہوں سے زیادہ ان کا حکم چلتا تھا۔ آگے سلیمان عالیشان کی ملکہ حورم سلطان کے ضمن میں اس کا تفصیلی ذکر ہو گا۔

موجودہ دور میں کنیزیں

چند برس قبل سلیمان عالیشان کی زندگی پر بنا ہوا ترکی کا ڈرامہ پوری اسلامی دنیا خاص کر عربوں اور ہمارے ہاں نشر ہوا اور بہت شوق سے دیکھا گیا۔اس میں بادشاہ کے حرم میں موجود حسین وجمیل خواتین کو نیم عریاں لباس میں دیکھ کر کچھ لوگوں کو یہ شوق چرایا کہ اسلام میں غلامی کے جواز میں آواز اٹھانا شروع کردیں۔ مجھے پے در پے اس حوالے سے سوالات آنا شروع ہوگئے۔ پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ لوگوں کو اچانک کنیزوں سے اتنی دلچسپی کیوں ہوگئی۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ ڈرامے میں دکھائی گئی خوبصورت کنیزوں کی کارستانی ہے کہ لوگوں کو اس ''اسلامی حکم'' کو دوبارہ زندہ کرنے کا خیال آنے لگا تھا۔

اس کے بعد مجھے متعدد مضامین اور مکاتیب میں اس حوالے سے اسلام کا موقف واضح کرنا پڑا۔ ہمارے ہاں لوگ چونکہ تعصّبات کے اسیر ہوتے ہیں اس لیے علمی باتوں سے زیادہ قائل نہیں ہوتے۔ چنانچہ ایسے لوگوں سے آخر کار مجھے یہ کہنا پڑا کہ کرلیجیے آپ غلامی کو زندہ۔مگر یادرکھیے کنیزیں کمزوروں کی عورتوں کو بنایا جاتا ہے۔اس وقت مسلمان کمزور ہیں۔اگر آپ اس کے جواز کے قائل ہوگئے تو پھر شکایت مت کیجیے گا طاقتور لوگ آپ کی بہنوں بیٹیوں کو کنیزیں بنا کر بازاروں میں بیچ رہے ہیں۔ویسے اس کے لیے کسی باہر کی طاقت کی ضرورت نہیں۔آپ کے ہاں بھی بہت ہوس پرست جیب میں پیسے ڈالے گھوم رہے ہیں۔انھیں اخلاقی اور قانونی جواز مل گیا تو کسی کی بہن بیٹی کی خیر نہیں ہے۔

تاہم جو لوگ علمی اور فکری طور پر چیزوں کو سمجھنا چاہیں ان کے لیے میرا ارادہ ہے کہ غلامی کے حوالے سے یہ سارے مضامین انشاءاللہ ایک جگہ جمع کر کے شائع کردیے جائیں۔

محل کا آخری حصہ اور ٹیرس

بادشاہ کی رہائش اور دیگر مقاصد کے لیے بنائی گئی متعدد تعمیرات اسی آخری حصے میں موجود تھیں۔ تاہم مجھے سب سے زیادہ محل کا وہ آخری حصہ پسند آیا جو پہاڑی کے سرے پر بنا ہوا تھا اور جہاں سے بحیرہ مرمرہ کا دلکش منظر دیکھا جاسکتا تھا۔ یہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے جس میں ہم نے ظہر اور عصر کی نمازیں ادا کیں۔ مسجد کی کھڑکی سے بھی سمندر کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ مسجد کی دیوار سے متصل لکڑی کی نشستوں پر میں دیر تک بیٹھا رہا اور سمندر کو دیکھتا رہا۔ سچی بات ہے کہ اس جگہ نے اتنا گہرا تاثر پیدا کیا تھا کہ اس کے اثر سے میں نکل نہیں پا رہا تھا۔ کبھی انھی جگہوں سے سلطان محمد فاتح، سلطان سلیم اور سلیمان عالیشان جیسے انسانی تاریخ کے طاقتور ترین حکمرانوں نے سمندر کو دیکھا ہوگا۔ کبھی اسی مقام سے حورم سلطان جیسی حسین اور چالاک عورت نے اپنی عظمت اور بڑائی کا احساس کیا ہوگا۔ کتنے ہی عظیم بادشاہ اور فاتحین اور ان کی منظورِ نظر خواتین حسیناؤں نے ہماری طرح ان جگہوں پر انتہائی خوبصورت شاموں کا نظارہ کیا ہوگا۔ کیسے کیسے سازشی، ذہین، حسین، طاقتور اور حوصلہ مند کردار یہاں آئے اور رخصت ہو گئے۔

میں یہاں آ کر سن ہو گیا تھا۔ ایک ٹرانس، ایک اثر تھا جس سے میں باہر نہیں آ رہا تھا۔ کتنی دیر میں مسجد میں بیٹھا یہی سوچتا رہا۔ کتنی دیر میں مسجد کے سائے میں بچھی نشست پر اسی فکر میں رہا۔ کتنی دیر میں ٹیرس کے آخر میں کھڑے ہو کر سمندر اور سامنے موجود استنبول کے حسین منظر کو اپنی آنکھوں میں سمیٹ کر ماضی، حال، مستقبل کی کہانی سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ جگہ سترہ صدیوں سے دنیا کے طاقت ور ترین حکمرانوں کا مرکز تھی۔ مگر اب وہ حکمران کہاں ہیں؟ اب ان کی طاقت وقوت کہاں ہے؟ اب ان کا جاہ و جمال کہاں ہے؟

میرے سامنے نیلے آسمان اور نیلے سمندر میں ایک ہی طاقت ور کی حکمرانی تھی۔ ایک ہستی کا جمال و کمال تھا۔ اسی نے کرم کیا اور اپنے انبیاء کو انسانیت کو یہ سمجھانے بھیجا کہ یہ دنیا دھوکے کے

سوا کچھ نہیں۔ حقیقت وہی ہے جو ہزار ہا انبیا نے اور سب سے بڑھ کر سرکار دو عالم خاتم الانبیا نے دنیا کو سمجھائی ہے۔ ان کا پیغام قرآن مجید کی شکل میں آج تک ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ جگہ اس پیغام کو سمجھنے کے لیے بھی بہترین ہے کہ دنیا دھوکہ ہے اور آخرت اصل زندگی ہے۔ یہ جگہ جہاں ہر روز دنیا بھر کے ہزاروں لاکھوں سیاح آتے ہیں، ہمیں پیغام دیتی ہے کہ اب ختم نبوت کے بعد دنیا کو یہ پیغام پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے۔ مدعو چل کر اب داعی کے پاس آ رہا ہے۔ مذہب کی بنیاد پر نفرت کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا یہ بہترین موقع ہمیں میسر ہے۔

آہ! مگر کیا کیجیے کہ شیطان نے امت اور اس کی قیادت کو غیر مسلموں کی نفرت میں مبتلا کر کے اپنی ذمہ داری سے مکمل غافل کر دیا ہے۔ سیاست اور اقتدار ان کے سر پر سوار ہے۔ وہ قرآن میں اللہ کا یہ وعدہ بھول گئے ہیں کہ اقتدار ایمان و عمل صالح کے نتیجے میں دے دیا جاتا ہے۔ یہ اپنی ذات میں کوئی ہدف ہے نہ کوئی ذمہ داری۔

ترکی کا یہ سفر ابھی جاری ہے۔ جنت نظیر اس جگہ میں ابھی کچھ دیر اور قیام ہے۔ مگر قیام کا مقصد شاید آج حاصل ہو چکا تھا۔

نائٹ کروز اور استنبول کی روشنیاں

اگلے دن ہمیں استنبول سے گوریم جانا تھا جو کہ کپوڈوکیا کے علاقے میں واقع تھا۔ اسی شام ثنا وہاں سے لوٹ کر آئی۔ ہمارا وائی فائی کے ذریعے مستقل آپس میں رابطہ تھا اور اس کے ذریعے سے ہمیں وہاں کی تفصیلات معلوم ہوتی رہی تھیں۔ ان لوگوں کو اگلے دن دبئی چلے جانا تھا۔ چنانچہ ایک دن کے لیے ان لوگوں نے ہمارے ہی ہوٹل میں کمرہ بک کرالیا تھا۔ بچے ساتھ تھے اور ایک دفعہ پھر ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش تھے۔ یہ طے پایا کہ فیری کی سواری کی جائے۔ کیونکہ

رات میں سمندر سے شہر کی روشنیاں بہت خوبصورت لگتی تھیں۔ اس مقصد کے لیے متعدد ڈنر کروز باسفورس میں تیرتے پھرتے تھے۔ مجھے ان میں جانے میں بڑی دلچسپی بھی تھی۔ ٹاکسم اور کباتش دونوں جگہ ایسے کروز کے بارے میں معلومات کیں، مگر معلوم ہوا کہ ڈنر کے ساتھ خواتین کا نیم عریاں ثقافتی رقص ان تمام کروز کا لازمی حصہ تھا۔ یہ چیز سیاحوں کے لیے بڑی باعث کشش ہوتی ہے، مگر ہمارے لیے یہ کروز میں بیٹھنے کی خواہش میں ایک رکاوٹ بن گئی۔ اس کے نعم البدل کے طور پر رات میں فیری کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سے بھی کسی حد تک یہ مقصد حاصل ہوسکتا تھا۔

فیری کا آسان طریقہ یہ تھا کہ استنبول کے ایشیائی حصے میں واقع اسکودر نامی ڈسٹرکٹ میں جایا جائے۔ چنانچہ ہم ٹاکسم سے کباتش روانہ ہوئے اور وہاں سے اسکودر کی فیری میں سوار ہوگئے۔ رات ہونے کی وجہ سے فیری خالی پڑی ہوئی تھی۔ کسی کشتی یا جہاز کا کنارے سے ہٹ کر سمندر میں جانا، ساحل کو بتدریج دور ہوتا ہوا دیکھنا ایک بڑا ہی پر لطف نظارہ ہوتا ہے۔ خاص کر رات میں جب ساحل سے دور ہوتے ہوئے شہر کی روشنیاں بتدریج نگاہوں کے دائرے میں سمٹتی چلی آئیں تو یہ ایک بہت خوبصورت منظر ہوتا ہے۔ استنبول ایک گنجان آباد شہر ہے جس کی آبادی تقریباً ڈیڑھ کروڑ ہے۔ باسفورس کی پٹی کے آر پار پہاڑیوں پر آباد اس شہر کی روشنیاں سمندر سے بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ یہ بلاشبہ ایک دلکش نظارہ تھا۔ کشتی چلنا شروع ہوئی تو سرد ہواؤں نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پانی اس وقت سیاہ نظر آ رہا تھا مگر فیری کی روشنی میں آگے بڑھتی کشتی کے عین نیچے سفید جھاگ اڑاتا نیلگوں پانی اب سیاہی کے اثر سے سبزی مائل نظر آ رہا تھا۔ سمندر کا ایک اور اہم منظر نیلی روشنیوں سے جگمگاتا اور ایشیا اور یورپ کو آپس میں ملاتا باسفورس برج تھا۔ جبکہ کباتش کے ساحل پر پیلے رنگ کی روشنیوں میں نہائی ہوئی ایک اہم عمارت سلطان عبدالحمید کا بنایا ہوا ڈولمباحل تھا جو کہ توپ کاپی کے بعد خلفاء کی رہائش گاہ بنا۔

اُس رات ہم ٹھنڈی یخ ہوا میں اس منظر سے خوب محظوظ ہوئے۔ کچھ دیر دوسرے کنارے پر رک کر ہم واپس لوٹ آئے۔

آخرت کا پانا کھونا اور موت کی آہٹ

اگلے دن دوپہر میں ہم سب ایک ہی ٹیکسی میں ائیر پورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ پانچ بجے ہمیں گوریم روانہ ہونا تھا جبکہ شام سات بجے ثنا کی دبئی روانگی تھی۔ ائیر پورٹ کافی دور تھا اور راستے میں بہت رش تھا۔ ہماری فلائٹ کا وقت کافی قریب آ گیا تھا۔ ہم دو گھنٹے کے سفر کے بعد مقررہ وقت سے کچھ پہلے بمشکل تمام ائیر پورٹ پہنچے۔ جلدی جلدی ثنا، تنزیل اور بچوں کو الوادع کہا اور ڈومسٹک لاؤنج کی طرف لپکے۔ جبکہ یہ لوگ آگے انٹرنیشل لاؤنج کی طرف بڑھ گئے۔

ان دونوں بہنوں نے ساتھ مل کر یہ پروگرام بنایا تھا مگر سفر میں بمشکل تمام ایک دن ہی ہمارا ساتھ رہا۔ یہیں سے یہ سبق ملتا ہے کہ زندگی میں تمام فیصلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں ہمیں ارادہ کرنے کا اختیار ہے۔ موثر وہی فیصلہ ہوتا ہے جسے اللہ چاہے۔ لیکن اس دنیا میں ہمیں ایک اور عظیم موقع دیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ آنے والی دنیا کا ہر فیصلہ ہم کر سکتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ وہاں تمھارے لیے وہی ہوگا جو تمھارا دل چاہے گا اور تمھیں وہی ملے گا جو تم مانگو گے۔ اس حقیقت کو ہم جان لیں تو دنیا کے کھونے اور پانے کے بجائے آخرت کے کھونے اور پانے پر ساری توجہ ملحوظ رہے۔ اس لیے کہ اُس روز جو کھویا وہ کبھی نہیں ملے گا اور جو پالیا وہ کبھی نہیں کھوئے گا۔

ہمیں ایک طرف یہ عظیم موقع ملا ہوا ہے کہ ابدی زندگی کی بادشاہی حاصل کریں اور دوسری طرف ایک خوفناک حقیقت یہ ہے کہ یہ موقع کسی وقت بھی اچانک غیر متوقع طور پر ختم ہوسکتا ہے۔ اس کا تجربہ ہمیں جہاز میں اس طرح ہوا کہ لینڈنگ سے کچھ پہلے اچانک جہاز نے غوطہ کھایا

اور تیزی سے نیچے ہونے لگا۔ محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً دل اچھل کر گلے کو آ گیا۔ لینڈنگ سے قبل جہاز اتنا نیچے آ چکا ہوتا ہے کہ سنبھلنے کے لیے بہت کم وقت ہوتا ہے۔

مجھے ایک دفعہ ایک پائلٹ نے جو جہاز کے ایسے ہی حادثے سے بچے تھے یہ بتایا تھا کہ اتنے نیچے منٹوں میں نہیں بلکہ سیکنڈوں میں کام تمام ہو جاتا ہے۔ مگر اللہ نے کرم کیا اور چند لمحوں میں جہاز پائلٹ کے کنٹرول میں آ گیا اور وہ تیزی سے جہاز کو اوپر اٹھاتا چلا گیا۔ میں نے زندگی میں بہت ہوائی سفر کیے ہیں، بہت ناہموار پروازیں دیکھی ہیں مگر ایسا تجربہ کبھی نہیں ہوا۔

ہم اس صورتحال سے نکلے تو میں نے اپنے بیٹے کو جو اس صورتحال کو بالکل نہیں سمجھا تھا یہ بتایا کہ ہمارا جہاز نیچے گر رہا تھا۔ بابا نے دعا کی تو اللہ میاں نے ہماری مدد کے لیے اپنے فرشتے بھیج دیے جنھوں نے جہاز کو واپس ٹھیک کر دیا۔ اس میں کیا شک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عنایت اور مداخلت کے بغیر اس جہاز کا واپس اوپر اٹھنا ممکن نہ تھا۔

گوریم کے غار والے ہوٹل

الحمدللہ جہاز ائیر پورٹ پر ساتھ خیریت کے اتر گیا۔ یہ نواشیر ائیر پورٹ تھا جو کہ کپوڈوکیا کے علاقے میں واقع ایک چھوٹا سا صوبہ ہے۔ ہمیں اسی صوبے کے قصبے گوریم جانا تھا۔ جہاز سے پیدل چل کر ہم لاؤنج میں آئے جو کسی بس کے ٹرمنل جتنا چھوٹا تھا۔ اس چھوٹے سے لاؤنج سے نکل کر باہر آئے تو میں سوچ رہا تھا کہ فنڈا کو کیسے تلاش کیا جائے۔ کیونکہ اسریٰ کی بات ہم کو پوری طرح سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ مگر باہر ایک شخص میرے نام کا بورڈ لیے کھڑا تھا۔ ہم مطمئن ہو گئے کہ چلو فنڈا مل گیا۔ کچھ دیر بعد فنڈا ہمیں لے کر روانہ ہوا۔ ائیر پورٹ پر اترتے اور باہر نکلتے ہوئے ہم نے ثنا کے اس تاثر کی تصدیق پائی جس سے اس نے ہمیں فون پر مطلع کیا تھا کہ کپوڈوکیا ایک انتہائی پرسکون جگہ ہے۔ راستہ میں کچھ کھیت چٹانیں اور کچھ قصبات جتنے بڑے شہر گزرے۔

سڑک پر ٹریفک بالکل نہ تھا۔قصبات میں لوگ نہ تھے۔ ہر جگہ اسی سکون کا احساس گہرا ہوتا چلا گیا۔

مغرب کے لگ بھگ ہم گوریم پہنچے ۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ یا ٹاؤن تھا جس کی کل آبادی بمشکل دو ہزار نفوس تھی۔ کپوڈوکیا کی ساری سیاحتی سرگرمیاں کا مرکز ہونے کی بنا پر اس قصبے میں بکثرت ہوٹل تھے۔زیادہ تر ہوٹل غاروں کے اندر بنے ہوئے تھے اور Cave ہوٹل کہلاتے تھے۔یہاں آنے والے بیشتر سیاح مغربی ممالک سے تھے اور بڑے شوق سے ان غار والے ہوٹلوں میں رکتے تھے۔تاہم میں نے اس ایڈوانچر کے بجائے بڑے، کشادہ اور کھلے ہوئے ہوٹل میں قیام کو ترجیح دی۔

اس کا سبب یہ تھا کہ اس سے قبل ہم ملائیشیا کے سفر میں لنکاوی کے حسین جزیرے میں اپنا قیام اسی طرح کے ایڈوانچر میں خراب کر چکے تھے۔وہاں ہوٹل میں کمروں کے بجائے جنگل میں تنہا تنہا بنے ہٹ میں سے ایک میں رہائش ملی۔اسے شاید مغربی لوگ تو بڑا انجوائے کرتے ہوں، مگر پہلی رات ایک عجیب سے جانور کا کمرے میں نکل آنے ،اس کے بعد انتہائی خوفناک بارش اور جنگل میں مکمل تنہائی کے احساس میں اہلیہ پوری رات جاگیں اور میں بھی نہ سو سکا۔تب سے ہم نے ایسے کسی ایڈوانچر سے توبہ کر لی تھی۔ چنانچہ یہاں انھوں نے غاروں میں رہنے کے بجائے جدید طرز کے بنے خوبصورت ہوٹل میں قیام کو ترجیح دی جو گوریم کے قصبے سے ذرا باہر واقع تھا۔

اللہ کی خصوصی عنایت

ہم ہوٹل پہنچے تو ریسپشن پر موجود لڑکی نے بڑی خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔وہ ہمیں ہماری بکنگ کے مطابق ہوٹل کی اصل عمارت سے باہر بنے ولاز کی طرف لے گئی۔یہ اچھے صاف ستھرے اور کشادہ ولاز تھے،مگر اس وقت مغرب ہو چکی تھی۔اندھیرا اچھل رہا تھا۔اول تو یہ ہوٹل

قصبے سے باہر۔ پھر یہ والا ہوٹل سے باہر۔ پھر ہوٹل میں بھی ہمیں کوئی دوسرا مہمان نظر نہیں آیا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔اس لیے رات میں یہاں ٹھہرنے کے تصور سے کچھ وحشت ہوئی۔

اس سے قبل کے ہم کچھ کہتے وہ لڑکی خود ہی بولی کے آپ کو میں دوسرا کمرہ بھی دے سکتی ہوں۔ہم نے کہا وہ بھی دکھایں۔ چنانچہ وہ ہمیں لے کر واپس ہوٹل آئی۔راہداری سے گزرتے ہوئے اندازہ ہوا کہ کچھ لوگ ہوٹل کے کمروں میں مقیم ہیں۔ہمیں کچھ اطمینان ہوا۔وہ ہمیں پہلی منزل پر واقعہ ایک بڑے سوئٹ میں لے گئی۔ یہ سوئٹ بہت بڑا کشادہ اورآرام دہ تھا جس میں بیڈروم کے علاوہ ایک لاؤنج بھی تھا۔لاؤنج کے آگے ایک گیلری تھی جہاں سے سامنے دور تک کا منظر نظر آتا تھا جبکہ کمرے کی وسیع کھڑکی سے داہنی طرف، ہوٹل کا سوئمنگ پول، بڑا سا لان اور آگے دور دور تک کا منظر نمایاں تھا۔

ہم دل ہی دل میں اللہ کے شکر گزار تھے کہ اس نے بلاتردد ہمیں ایک بہترین رہائش عطا کردی۔ ورنہ وہاں اندھیرے اور تنہائی کے احساس سے بہت مشکل ہوتی۔دوسری طرف ہوٹل والے بکنگ سے ہٹ کر کوئی چیز نہیں دیتے اور دیتے ہیں تو اس کے اچھے خاصے اضافی پیسے وصول کرتے ہیں۔یہاں ہمیں اسی سستے کرائے میں بہت مہنگا کمرہ مل رہا تھا۔اگلے دن فجر کے لیے اٹھے تو دیکھا کہ اس کمرے کی کھڑکی اور گیلری کے سامنے ہی بلون یا غبارے اڑتے ہیں جو خود بہت دلچسپ تجربہ تھا۔جبکہ دور دور تک فیری چمنی کی منفرد پہاڑیاں، بلند نیلگوں آسمان، ہوٹل کا کشادہ اور سرسبز لان اور نیلا سوئمنگ پول ارد گرد کسی اور عمارت کا نہ ہونا یہاں کے ہر منظر کو انتہائی حسین بنا دیتا ہے۔کمرے میں رہ کر بھی ان مناظر کو دیکھتے رہنا جنت میں رہنے کا تجربہ معلوم ہوتا تھا۔

بے اختیار دل میں احساس ابھرا کہ کاش کل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہمارے گھٹیا اعمال اور

ناقص پونجی کے باوجود جنت کے اعلیٰ درجات بلا استحقاق عطا کردیں تو ان کے لیے کیا بعید ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ رب کی رحمت کے سوا ہم گناہ گاروں کا کوئی سہارا ہی نہیں۔ ان ربی رحیم ودود۔

فنڈا کا لطیفہ

یہ سوئٹ دکھا کے اس لڑکی نے ہماری شکل دیکھی جس پر پہلے ہی لکھا تھا کہ ہمیں یہی کمرہ چاہیے۔ چنانچہ وہ ہمیں لے کر دوبارہ نیچے لوٹی تاکہ ہمارا اندراج کر کے چابی ہمیں دے دے۔ سارے کاموں سے جب فارغ ہوگئے تو آخر میں میں نے اس مہربان لڑکی سے پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے۔ اس نے ترنت جواب دیا کہ اس کا نام فنڈا ہے۔

ہم ایک دم ششدر رہ گئے۔ ہم ائیر پورٹ وین کے بھاری بھرکم چھ فٹے بڑے میاں کو فنڈا سمجھے تھے ۔ جبکہ اصل فنڈا یہ نرم و نازک ،خوش اطوار، ہمیشہ مسکراتی اور تعاون پر آمادہ یہ خوبصورت لڑکی تھی۔ اس بات پر سب سے زیادہ مزہ میرے بیٹے کو آیا۔ اس کے لیے تو یہ ایک لطیفہ بن گیا کہ ہم فنڈا کو کیا سمجھے تھے اور درحقیقت وہ کیا نکلی۔

فنڈا نے بتایا کہ اسریٰ نے ہوٹل فون کر کے اسے بتادیا تھا کہ پاکستان سے اس کے مہمان آئے ہیں۔ ترکی والے خاص کر دیہاتی پس منظر کے لوگ اہل پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ فنڈا نے اس تمام عرصے میں اس محبت کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ ہر پہلو سے وہ ہمارے ساتھ تعاون کرتی رہی۔ اس کا رویہ کسی ایسے میزبان کا تھا جس کے اپنے گھر مہمان آئے ہوں۔ واپس آتے وقت بھی اس نے بڑی اپنائیت سے ہمیں رخصت کیا۔ وہ ہمارے لیے اٹھ کر اپنی جگہ سے باہر آ گئی تھی۔ میں نے فنڈا سے رخصت ہوتے وقت اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے بہت دعا دی۔ اس نے ہر قدم پر ہمارے ساتھ بہت تعاون کیا تھا۔

سفر کا بہترین حصہ

میں نے پیچھے پرنسز آئی لینڈ کے ضمن میں یہ تذکرہ کیا تھا کہ ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہمارے سفر کا بہترین حصہ اب آنے والا ہے۔اس کا آغاز توپ کاپی پیلس سے شروع ہو گیا تھا۔مگر سچی بات یہ ہے کہ گوریم کا قیام ہمارے سفر کا بہترین حصہ تھا۔ یہاں کی فضا میں جو سکون وطمانیت رچا ہوا تھا وہ نا قابل بیان ہے۔ایسا لگتا تھا کہ زندگی یہاں آ کر کچھ دیر سستانے کو بیٹھ گئی ہے۔ وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔زمانے کی گردش دم لینے کو ٹھہر گئی ہے۔

یہاں سیاحوں کے لیے بہت سی تفریحات تھیں۔ مگر میرے لیے سب سے بڑی تفریح وہ سکون تھا جو یہاں ہر طرف میسر تھا۔ خاص کر ہمارا ہوٹل ہی ایسا تھا کہ کمرے سے اپنے بیڈ پر بیٹھے بیٹھے دور دور تک خالق کائنات کے جمال وکمال کے نظارے بکھرے ہوئے نظر آتے۔ ہوٹل کے وسیع وعریض لان کی ہریالی میں صبح وشام بیٹھ کر فیری چمنی چٹانوں، دور تک پھیلے پہاڑوں اوران سے اوپر نیلے آسمان کو دیکھتے رہنا، پرندوں کی دلکش آوازوں کو سننا، تتلیوں اور پرندوں کے رنگوں کو گننا ایک عجیب تجربہ تھا۔ ہوٹل کے لان ہی سے ایسا منظر نظر آتا کہ انسان گھنٹوں فطرت کی نیرنگی اور قدرت کی صناعی کی داد دیتا رہے۔ خداوند ذوالجلال کی حمد کے نغمے بکھیرنے اور اس کی تسبیح میں مصروف زمین وآسمان کی خاموش محفل کا مہمان بننے کی شاید یہ بہترین جگہ تھی۔ خداوند عالم کی جنت کی ایک زندہ تمثیل دیکھ کر اس جنت میں اپنا ابدی گھر مانگنے کے لیے یہ موزوں ترین مقام تھا۔ میں سوچتا تھا کہ وہ دن بھی آئے گا جب خدا کے نیک بندے اس کی جنت میں بیٹھ کر کہہ رہے ہوں گے کہ اللہ کا شکر ہے جس نے اپنا وعدہ ہم سے سچا کر دکھایا اور ہمیں جنت کا مالک بنا دیا کہ جہاں چاہیں اطمینان سے رہیں۔ یہ بدلہ مگر اسلام کے نام پر اپنے تعصّبات اور خواہشات کی پیروی کرنے والوں کو نہیں ملے گا۔ یہ ان کا بدلہ ہے جن کی زندگی ایمان و اخلاق کے تقاضوں

کو پورا کرتے ہوئے گزری۔ جو صبر، تقویٰ اور نیکی کے ساتھ خدا کو پکارتے رہے۔ جو ہر سچائی کی تصدیق کرتے رہے۔ جو عدل، احسان، انفاق کو اپنی زندگی کی اقدار بناتے اور فواحش، حق تلفی اور ظلم سے رکتے رہے۔ جو تواصو بالحق، نصرت دین اور دعوت دین کی ذمہ داریاں پوری کرتے رہے۔ جنت انھی کا بدلہ ہے۔

گوریم، کپوڈوکیا اور فیری چمنی

گوریم کا چھوٹا سا ٹاؤن یا قصبہ کپوڈوکیا میں واقع ہے۔ کپوڈوکیا ترکی کے وسط میں واقع ایک قدیم تاریخی علاقہ ہے۔اس علاقے کے باشندوں کا ذکر قدیم یونان مورخ ہیروڈوٹس کے ہاں پانچویں صدی قبل مسیح میں ملتا ہے۔ یہ علاقہ اپنی عجیب وغریب چٹانوں جنھیں عام طور پر فیری چمنی کہا جاتا ہے اور زیر زمین شہر کی وجہ سے مشہور ہے۔ فیری چمنی ؛کون کی شکل میں بنی ہوئی چٹانیں ہیں۔یعنی یہ نیچے سے گول ہیں اور بتدریج پتلی ہوتے ہوئے اوپر ایک نوکیلی سطح کی شکل میں ختم ہوتی ہیں۔ یہ چٹانیں یہاں بکثرت پائی جاتی ہیں اور ہمارے ہوٹل کے کمرے سے بھی نظر آتی تھیں۔

کمرے کا معاملہ طے ہوگیا تو ہم رات کے وقت گوریم دیکھنے کے لیے نکلے۔ ہمارا ہوٹل لب سڑک تھا اور یہی سڑک پندرہ منٹ کے پیدل فاصلے پر گوریم لے جاتی تھی۔مگر اُس وقت نہ وہاں ٹریفک تھی اور نہ روشنی۔اس لیے بڑی مشکل سے ہم نے اندھیرے میں یہ راستہ طے کیا۔

گوریم ایک صاف ستھرا چھوٹا سے قصبہ تھا۔سیاحتی مرکز ہونے کی بنا پر ساری دکانیں سیاحوں کی ضروریات کے تحت ہی بنی ہوئی تھیں۔ یہاں ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔سڑک کے کنارے روشن دکانیں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں۔اگلے دن ہم صبح کے وقت یہاں دوبارہ آئے اور ایک جگہ سے ہاٹ ائیر بلون کی بکنگ کرالی اور ساتھ میں علاقے کا ٹور لے لیا۔گرین

ٹور کے لیے تو پورا دن چاہیے تھا۔ اس لیے ہم نے آدھے دن کا ریڈ ٹور لے لیا۔

جانان اور زیادہ بولنے کا نقصان

عام طور پر کسی ٹور میں بہت سارے لوگ ہوتے ہیں۔ مگر اس ٹور کے لیے ہمارے لیے ہی ایک گاڑی اور ڈرائیور کا بندوبست کیا گیا۔ جبکہ ایک گائڈ جانان بھی ساتھ تھی۔ یہ ایک دلچسپ خاتون تھی جو ترکی لہجے میں بے تکان انگریزی میں گفتگو کی عادی تھی۔ اس نے ہمیں اس علاقے کی تاریخ، جغرافیے، روایات کے ساتھ ساتھ اپنے بارے میں بھی تمام معلومات فراہم کیں۔

جانان کا تعلق ترکی کی اس نسل سے تھا جو کمال اتاترک کے مغربی جبر کے عہد میں جوان ہوئی تھی۔ اس کا آئیڈیل بھی کمال اتاترک تھا۔ وہ اپنے گھر سے دور یہاں تنہا رہتی تھی۔ بقول اس کے اسے مردوں سے چڑ تھی کیونکہ اس کا بوائے فرینڈ اسے چار سال قبل دھوکہ دے کر چلا گیا تھا۔ خیر تھوڑی ہی دیر میں اس کی زبان سے یہ بات نکل گئی کہ آج کل اس کا ایک نیا بوائے فرینڈ بنا ہوا ہے۔ گرچہ تیر نکلنے کے بعد اس نے وضاحت کی کہ یہ 'اُس' معنوں میں بوائے فرینڈ نہیں ہے۔ لیکن زیادہ بولنے کا نقصان ہوتا تو ہے۔

بہر حال اس سے مل کر دکھ ہوا۔ مغربیت نے اس کو وہ سب کچھ نہیں دیا جس کی وہ مستحق تھی۔ اس سے پہلے ہم اسریٰ کے ساتھ فلس سے مل چکے تھے۔ فلس کا بھی ایک تائیوانی بوائے فرینڈ تھا جو کہ اس کا باس بھی تھا۔ میں نے ان دونوں پر کوئی منفی تبصرہ کرنے کے بجائے ان کو اپنی کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا انگریزی ترجمہ پیش کر دیا۔

ترکی کی مظلوم نسل

حقیقت یہ ہے کہ ترکی کی یہ نسل بڑی مظلوم ہے۔ اس پر کمال اتاترک نے بالجبر مغربیت کو مسلط کیا۔ عورتیں آزاد ہیں۔ مغربی لباس پہنتی ہیں۔ خود کماتی ہیں۔ مگر تیس کی دہائی میں پہنچ کر بھی

اس سکون کو نہیں پا تیں جو اللہ تعالیٰ نے خاندان کے ادارے میں فطری طور پر رکھا ہے۔

مگر میرے نزدیک جتنا قصور کمال اتاترک کا ہے اس سے کہیں زیادہ قصور اس مذہبی جمود، انتہا پسندی اور ظاہر پرستی کا ہے جس نے دین کی اصل تعلیم کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ اسی کا ردعمل ہوتا ہے کہ لوگ دوسری سمت نکل جاتے ہیں۔ ایسے میں جن لوگوں پر اللہ کا یہ فضل ہو گیا ہے کہ ان پر ایمان و اخلاق کی دعوت بالکل واضح ہے ان کی یہ بڑی بھاری ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کے درست پیغام کو لوگوں تک پہنچا ئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ کام کیا وہ روزِ قیامت جنت کے اعلیٰ ترین درجات کے حقدار ہوں گے۔

عجیب و غریب گھر

جانان ہم کو کئی جگہ لے کر گئی۔ گوریم اوپن ائیر میوزیم، امیجینیشن ویلی یا وادی تصور، مٹی کے ظروف یا برتن بنانے کی فیکٹری وغیرہ۔ مگر اس ٹور کا حاصل فیری چمنی پر مشتمل وہ آبادیاں تھیں جن میں زمانہ قدیم میں انسانوں نے اپنے گھر بنا رکھے تھے۔ جیسا کہ بیان ہوا کہ فیری چمنی کون کی شکل کی چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں جو زمین سے اس طرح ابھری ہوئی تھیں کہ کون کا سرا اوپر اور موٹا گول حصہ زمین پر تھا۔ یہ چٹانیں لاکھوں برس کی جغرافیائی تبدیلیوں کے بعد وجود میں آئیں تھیں۔ یہ اندر سے کھوکھلی ہوتی تھیں۔ انسانوں نے ان کے ایک حصے کو توڑ کر دروازہ بنایا اور درمیان کے خالی حصے کو ایک گول کمرے کی شکل میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ یعنی ہر چٹان ایک کمرے پر مشتمل ایک چھوٹا سا گھر بن گئی جس میں ایک کنبہ موسم کے تغیرات سے محفوظ رہ کر اطمینان سے زندگی گزار سکتا تھا۔ تاہم کہاں گول کمرے کی رہائش اور کہاں آج کے جدید انسان کی آرام دہ رہائش گاہیں۔

اب یہ چٹانی علاقہ گرچہ غیر آباد ہو چکا ہے لیکن ان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آج کا جدید

انسان اللہ تعالیٰ کی کن عظیم نعمتوں میں جی رہا ہے۔ زمانہ قدیم کے انسان کی زندگی کتنی مشکل تھی اور آج کے انسان کو اللہ تعالیٰ نے کیسی نعمتیں دے رکھی ہیں۔

ترکی میں اسلام

یہ علاقہ ڈیڑھ ہزار قبل مسیح میں آباد ہوا۔ رومی عہد میں یہاں مسیحیت پھیلنا شروع ہوئی۔ مشرک رومی سلطنت میں حضرت عیسیٰ کے ابتدائی پیروکاروں کو ایک زمانے میں سخت ظلم وستم کا سامنے کرنا پڑا۔ قرآن مجید میں بیان کیا گیا اصحاب کہف کا واقعہ اسی دور میں ترکی ہی کے ایک شہر افسس میں پیش آیا تھا۔ گرچہ کچھ محققین کی رائے ہے کہ اصحاب کہف کا غار اردن کے شہر عمان کے نزدیک پہاڑوں پر واقع ہے۔ گوریم کے قریب میں موجود زیر زمین شہر انھی مسیحی لوگوں نے آباد کیا تھا تا کہ رومیوں کے ظلم وستم سے بچ سکیں۔ تاہم روم کے بادشاہ قسطنطین کے قبول مسیحیت کے بعد مسیحیت یہاں کا غالب مذہب بن گئی۔

گیارہویں اور بارہویں صدی عیسوی میں سلجوقیوں کے زیر سایہ یہاں ترک قبائل آ کر بسنا شروع ہوئے اور ان کے زیر اثر یہاں اسلام پھیل گیا۔ عثمانی سلطنت کے زمانے میں پورے ترکی میں اسلام عام ہوگیا۔ اس وقت بھی ترکی بھاری مسلم اکثریت کا ملک ہے جس کے 98 فیصد لوگ مسلمان ہیں۔

اسلام کا فروغ اور مسلمانوں کی فتوحات

اسلام کی تعلیمات کے مطابق دین میں کوئی جبر نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی غیر مسلم کو اس کی مرضی کے خلاف زبردستی مسلمان نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کے برعکس اسلام سے قبل جو بادشاہ کا مذہب ہوتا تھا رعایا مجبور تھی کہ وہی مذہب اختیار کرے۔ دوسری شکل میں ان کو ظلم وستم کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

تاہم اسلامی فتوحات کے ساتھ ہر جگہ جبر کا یہ سلسلہ ختم ہو جاتا تھا۔ اسلام چونکہ ایک دعوتی مذہب ہے، اس کی تعلیمات فطری اور عدل پر مبنی ہیں نیز موجودہ دور سے قبل مسلمانوں میں دعوتی سوچ پوری طرح زندہ تھی، اس لیے مسلمان یہ کوشش کرتے تھے کہ اسلام پھیلے۔ اکثر مسلمان فاتح قوم سے تعلق رکھنے کے باوجود بہتر انسان ثابت ہوتے۔ چنانچہ اکثر جگہ اسلام خاموشی سے پھیل جاتا۔ خلافت راشدہ سے لے کر بعد کے ادوار تک اکثر جگہ یہی ہوا۔

جس چیز کو نمایاں کرنا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ مسلم فاتحین عام طور پر دینی جبر کا نظام ختم کر دیتے تھے۔ مگر خود جبر کر کے اسلام کو نہیں پھیلاتے تھے۔ اسلام ہمیشہ اپنی دعوتی قوت کے زور ہی پر پھیلا ہے۔ اسی شاہی جبر کی عدم موجودگی کی بنا پر بہت سی جگہوں پر جیسے ہندوستان اور اسپین وغیرہ میں مکمل آبادی مسلمان نہ ہوئی۔ جبکہ جہاں شاہی جبر موجود نہ تھا وہاں مسلم فاتحین کے بغیر ہی اسلام پھیل گیا جیسے ملائشیا انڈونیشیا وغیرہ۔

دور جدید میں گرچہ مسلمان مغلوب ہو چکے ہیں لیکن جبر کا نظام بھی ختم ہو چکا ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک میں مذہبی آزادی ہے۔ چنانچہ اب مسلمانوں کے پاس موقع ہے کہ وہ فتوحات کے بغیر ہی دنیا بھر میں اسلام کو پہنچا دیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ کام کرے گا کون؟ مسلمان تو اس وقت دیگر بعض ''ضروری کاموں'' میں مشغول ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کی اس غفلت سے فائدہ اٹھا کر شیطان حرکت میں آ گیا ہے۔ بعض نادان مسلمانوں کو استعمال کر کے وہ دنیا بھر میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت عام کر رہا ہے۔ اس کے بعد اسلام کی تبلیغ ہر گزرتے دن کے ساتھ مشکل ہوتی چلی جا رہی ہے۔

کمہار اور فکری قیادت

اس سفر میں ہم چکنی مٹی سے برتن بنانے کے شوروم بھی گئے۔ وہاں کے مالک نے پہلے ایک

کاریگر جسے وہ ماسٹر کہہ رہا تھا کے ذریعے سے ظروف سازی کا مظاہرہ کروایا اور پھر مجھ سے کہا کہ میں ایک برتن بناؤں۔ چنانچہ ماسٹر کی مدد سے میں نے بھی چکنی مٹی سے ایک برتن بنا دیا۔ یہ ایک بہت مہارت سے کرنے کا کام ہے۔ چکنی مٹی کا ڈھیر لوہے کی ایک ڈسک کے اوپر لگے ہوئے کمر تک بلند ایک ستون پر رکھا جاتا ہے۔ ڈسک کو پیروں سے گھمانے سے یہ ستون اور اس پر رکھا گیلی مٹی کا ڈھیر بھی گھومنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر دونوں ہاتھوں اور انگلیوں کو گیلا کر کے جس جس رخ سے اس پر دباؤ ڈالا جاتا ہے وہ اسی شکل میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ اگر کمہار ماسٹر ہو تو ایک بہترین ظرف وجود میں آتا ہے اور میرے جیسا کوئی اناڑی ہو تو برتن کا بیڑہ غرق ہو جاتا ہے۔ تاہم میری رہنمائی ماسٹر کرتا رہا اس لیے میں نے قدرے ڈھنگ کا برتن بنا لیا۔

کم و بیش یہی تعلق ایک ماں اور بچے اور فکری قیادت اور معاشرے کا ہے۔ یہ دونوں کمہار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اگر درست رہنمائی کریں، صحیح چیزوں پر زور ڈالیں تو بچے کی شخصیت اور معاشرہ نکھرتا چلا جاتا ہے۔ اور اگر ان کی رہنمائی غلط ہے تو برتن کا برا حشر ہوتا ہے۔ اس وقت ہمارا معاشرہ جس ابتری کا شکار ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ والدین اور فکری قیادت دونوں جگہ سے رہنمائی کا فریضہ درست طور پر سرانجام نہیں دیا جا رہا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ایمان و اخلاق پر زور ڈالا جائے یہاں سارا زور ظاہری شخصیت اور اوپری لباس پر ہے۔ اصل زور تعلیم اور امن کے ذریعے ترقی پر ہونا چاہیے جبکہ یہاں زور تشدد اور ٹکراؤ اور احتجاجی ذہن بنانے پر ہے۔ زور دعوت پر ہونا چاہیے اور یہاں سارا زور نفرت پر ہے۔ ایسے میں معاملات نے تو خراب ہونا ہی ہے۔

کنڈ ملیر

جغرافیائی اعتبار سے یہ بلاشبہ ایک منفرد خطہ تھا۔ جانان ایک جگہ ہمیں لے گئی جسے تصور کی

وادی یا امیجینیشن ویلی کا نام دیا جاتا ہے۔اس نے بتایا کہ یہاں چٹانیں اس طرح ڈھل گئی ہیں کہ تصور کی آنکھ کے ساتھ دیکھا جائے تو عجیب وغریب چیزیں نظر آئیں گی۔ جیسے ایک چٹان اونٹ جیسی تھی۔ایک چٹان تین خواتین کی طرح تھی۔جانان کی بات کسی حد تک ٹھیک تھی۔

پاکستان میں ایسی جگہیں موجود ہیں۔مثلاً بلوچستان کوسٹل ہائے پر واقع کنڈ ملیر میں ایسی ہی ایک جگہ موجود ہے۔اس جگہ کو امید کی شہزادی یا پرنسز آف ہوپ کہا جاتا ہے۔وہاں ایک چٹان بالکل ایک شہزادی کا مجسمہ محسوس ہوتی ہے۔ یہاں انتہائی خوبصورت ساحل سمندر بھی ہے اور ہندوؤں کا ایک بڑا تاریخی مقام نانی ہنگلاج بھی ہے۔نیز بعض بڑی خوبصورت اور صدیوں میں ہوا سے ترشی ہوئی چٹانیں بھی ہیں۔ یہ تو ایک مثال ہے ورنہ میں پاکستان کے بیشتر سیاحتی علاقوں میں سفر کرنے کے بعد یہ اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ اللہ نے ہمیں دیا ہے، دوسروں کو کم ہی دیا ہوگا۔اس کی بہت کچھ تفصیل میں اپنے پچھلے سفر نامے ''کھول آنکھ زمیں دیکھ'' میں کر چکا ہوں۔

مگر افسوس کے ہم نے اپنے سیاحتی مقامات کو بالکل ضائع کر دیا ہے۔غیر ملکی تو کیا کوئی ملکی سیاح وہاں کا رخ نہیں کرسکتا۔اس سفرنامے کی تصنیف سے قبل کالام کی حسین وادی میں ہوکر آیا۔مگر حال یہ تھا کہ ہر طرف گندگی، بدبو، مکھیاں اور غلاظت تھی۔تیس کلومیٹر بحرین سے کالام تک کی روڈ اس طرح ٹوٹی ہوئی تھی کہ آدھے گھنٹے کا سفر تین گھنٹے میں طے ہوا۔ جہاں سڑک وغیرہ ہے وہاں ہوٹل غیر معیاری اور انتظامات ناقص ہیں۔

میں ملک کے بیشتر اہم سیاحتی مقامات سوات، کاغان، ہنزہ، کشمیر، ٹیکسلا وغیرہ جا چکا ہوں۔ مگر کہیں سیاحوں کے لیے وہ انتظام نہیں جو جدید دنیا میں معمول ہو چکا ہے۔پھر سیاحت یہاں کیوں کر فروغ پاسکتی ہے۔جب تک ہمارے اندر تعمیری ذہن پیدا نہیں ہوتا ہم ترقی نہیں

کر سکتے۔ سر دست ہمارے ہاں احتجاج کی سیاست اور ٹکراؤ کی سوچ کا غلبہ ہے۔ اس انداز فکر کے ساتھ تعمیری ذہن پیدا نہیں ہو سکتا۔

بہرحال ترکی نے دور جدید میں سیاحت کی انڈسٹری کا بہترین فائدہ اٹھایا ہے۔ سن 2014 میں چار کروڑ سے زائد غیر ملکی سیاح ترکی آئے۔ ترکی کی تیز رفتار ترقی میں سیاحت کی صنعت کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ تاہم طیب اردگان کی موجودہ سیاسی پالیسیوں کے نتیجے میں ترکی کی سیاحتی صنعت کو زوال شروع ہو چکا ہے۔ سن 2015 میں سیاحوں کی تعداد ساڑھے تین کروڑ رہ گئی۔ جبکہ موجودہ برس 2016 کی پہلی سہ ماہی میں تیس فیصد سیاح کم آئے تھے۔ جبکہ اس کے بعد پے در پے دہشت گردی کے واقعات اور پھر انقلاب کی ناکام کوشش اور سیاسی ناہمواری کے باعث یہ تعداد یقیناً کہیں زیادہ کم ہو گئی ہو گی۔

ہاٹ ائیر بلون اور جنت کی دنیا

ہمارے سفر کا سب سے دلچسپ تجربہ گرم ہوا سے اڑنے والے غباروں میں بیٹھ کر اس علاقے کا فضائی نظارہ کرنا ہے۔ غباروں کے اترنے اور اڑنے کا مقام ہمارے ہوٹل کے نزدیک تھا اور ہماری کھڑکیوں سے یہ منظر صاف نظر آتا تھا۔ پہلے دن ہم فجر پڑھنے اٹھے تو یہ سارا منظر دیکھا تھا۔ دوسرے دن ہم خود اڑنے والے تھے۔ فجر پڑھ کر فارغ ہوئے تو صبح چار بجے ایک گاڑی ہمیں لینے آ گئی۔ غبارہ اڑنے کے مقام پر ہلکے پھلکے ناشتے کا بندوبست تھا۔ جون کے مہینے کے آغاز کے باوجود اس وقت یہاں کافی ٹھنڈ تھی۔ ہم ناشتہ کرتے جاتے اور غباروں میں بڑے بڑے پنکھوں کے ذریعے سے ہوا بھرنے کا منظر دیکھتے جاتے۔

یہ غبارے ایک سادہ اصول پر اڑتے ہیں۔ وہ یہ کہ گرم ہوا اوپر اٹھ جاتی ہے۔ چنانچہ پہلے غبارے میں پنکھوں کے ذریعے سے ہوا بھری جاتی ہے۔ پھر ایک برنر کے ذریعے سے اس ہوا کو

گرم کیا جاتا ہے۔جس کے بعد غبارہ اڑ جاتا ہے۔ ہوا ٹھنڈی ہونے لگے تو غبارہ نیچے آتر آتا ہے۔اس واقعے میں اس سوال کا جواب پوشیدہ ہے جو بارہا لوگ مجھ سے کرتے رہتے ہیں کہ انسان جنت میں جا کر ہمیشہ کی زندگی میں کیا کریں گے؟ کیا وہ بور نہیں ہو جائیں گے؟

اس موجودہ دنیا کا حال یہ ہے کہ اس کے امکانات لامحدود ہیں۔انسانوں نے چند امکانات کو دریافت کیا اور اپنی رات کو روشن کرلیا۔ گرمی کو سردی اور سردی کو گرمی میں بدل دیا۔ جہاز،اور راکٹ بنا لیے۔ آخرت میں یہی آسمان و زمین بدل کر کہیں زیادہ بہتر بنا دیے جائیں گے۔اس کے بعد اہل جنت کا کام یہ ہوگا کہ وہ ان میں موجود امکانات کو دریافت کرتے رہیں۔ یہ دریافتیں کر کے وہ اپنی لذت اور خوشیوں کا نیا سامان تیار کرتے رہیں گے۔لیکن موجودہ دنیا کی طرح ان نعمتوں کو پا کر وہ غافل نہیں ہو جائیں گے بلکہ ہر دریافت پر شکر گزاری، حمد اور تسبیح سے اپنے رب کا احسان مانیں گے جس نے ان کے لیے لامحدود امکانات کی دنیا بنا ڈالی۔

چنانچہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت وہ جگہ ہے جہاں انسانوں کی ابتدائی مہمانی کا سامان ان کو تیار ملے گا۔لیکن اس کے بعد باقی عرصے کے لیے معاملات ان کو خود کرنا ہوں گے۔ انسانوں کو ابتدائی شکل میں ایک بادشاہت دے دی جائے گی۔ پھر جس کے جتنے زیادہ نیک اعمال ہوں گے اس کی صلاحیت اتنی ہی زیادہ ہوگی اور وہ دریافت کا عمل اتنی ہی زیادہ بڑی سطح پر کرے گا۔ یہی چیز اس کے مقام و انعام اور عزت و عظمت کا تعین کرے گی۔ یہ محض ایک اندازہ ہے۔آخرت کی دنیا کی حقیقی نوعیت تو وہاں پہنچ کر ہی معلوم ہوگی۔

یہ تو ہو گیا اس بات کا جواب کہ انسان وہاں جا کر کام کیا کرے گا۔ یہ بات کہ وہاں انسان بور ہو جائے گا،اس لیے درست نہیں کہ خدا کی صفات اور تخلیقات لامحدود ہیں۔ہم تو یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ کائنات ہی لامحدود ہے۔ یہ کائنات ایک خام شکل میں انسان کو دے دی جائے گی جس

میں جمال وکمال کے تمام امکانات پوشیدہ ہوں گے۔ وہاں اہل جنت اس قابل کردیے جائیں گے کہ ان نعمتوں کو دریافت کریں اوران سے محظوظ ہوں اور یہی میرے نزدیک "خالصة یوم القیامه" (اعراف 32:7) کا حقیقی مصداق ہے۔ یعنی وہاں کی ہر نعمت اہل ایمان کے لیے خاص ہوگی۔ نافرمانوں کے حصے میں جہنم کے کوڑا خانے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

طائرانہ نظر کیا ہوتی ہے

جب کافی ہوا بھر گئی تو برنر سے اس ہوا کو گرم کرنے کا عمل شروع ہوا جس کے بعد غبارہ اوپر اٹھ گیا۔ پھر بڑی سی باسکٹ نما سواری میں ہم سب کو بٹھایا گیا۔ اس میں پائلٹ سمیت بارہ پندرہ لوگ تھے۔ پائلٹ نے نیچے اترتے وقت کی کچھ احتیاطوں کے بارے میں ہم کو بتایا۔ ہوا میں اڑنا بہر حال ایک خطرناک کام ہے۔ ہوا ذرا بھی غیر ہموار ہو یا کوئی اور خرابی ہو تو جان لیوا حادثہ پیش آ سکتا ہے۔ اس لیے ہر روز موسم کی پیش گوئی کے علاوہ صبح کے وقت ہوا کو دیکھا جاتا ہے اور پھر غبارے اڑتے ہیں ورنہ اگلے دن پر یہ پروگرام موخر کر دیا جاتا ہے۔

پائلٹ بتدریج ہوا کو گرم کرتا رہا یہاں تک کہ بہت آہستگی سے ہمارا غبارہ فضا میں بلند ہوا۔ اردگرد درجنوں رنگ برنگے غبارے موجود تھے جو ایک کے بعد ایک رفتہ رفتہ بلند ہو رہے تھے۔ ان کو اڑتے دیکھنا ایک انتہائی خوبصورت منظر ہوتا ہے جو ایک دن پہلے ہم ہوٹل کے کمرے سے دیکھ چکے تھے۔

ہمارا غبارہ بلند ہوا اور اردگرد کی زمین کا منظر بتدریج ہماری آنکھوں میں سمٹنا شروع ہو گیا۔ جہاز کی بلندی سے بھی زمین نظر آتی ہے، مگر جہاز تیز رفتاری سے فضا میں بلند ہوتا اور اس سے کہیں زیادہ رفتار سے آگے بڑھتا ہے کہ کوئی منظر اپنی جگہ باقی نہیں رہتا۔ مگر یہاں غبارہ بہت آہستگی سے فضا میں اٹھ رہا تھا۔ چنانچہ ایک ہی منظر نگاہ کے سامنے تھا۔ پرندے فضا میں اڑتے

ہوئے زمین کو کیسا دیکھتے ہیں اس کا درست اندازہ زندگی میں پہلی بار ہوا۔غبارہ فضا میں بلند ہوتا گیا اور دور دور تک کا منظر نگاہوں کے سامنے آگیا۔ ہمارا بڑا سا ہوٹل دیکھتے ہی دیکھتے کھلونے جتنا نظر آنے لگا۔ یہی معاملہ درختوں، فیری چمنی چٹانوں اور دیگر چیزوں کا تھا۔

رفتہ رفتہ ہم پہاڑوں سے بھی بلند ہوگئے۔اوپر صاف وشفاف آسمان تھا۔کہیں کہیں اس پر تیرتے بادل تھا۔اردگرہمارے جیسے درجنوں رنگ برنگ غبارے اڑرہے تھے۔آسمان کے مشرقی کنارے پر ابھرتے سورج کی لالی تھی۔جبکہ نیچے دور تک پھیلے پہاڑوں،سبز قطعات، چھوٹے چھوٹے مکانات، اور فیری چمنی کا دلکش نظارہ تھا۔تھوڑی ہی دیر میں پہاڑ کی اوٹ سے سورج طلوع ہوا۔اس کو فضا میں معلق ہوکر یہاں ابھرتے دیکھ خدا کی عظمت کا عجیب احساس ہوا۔ مجھے احساس ہوا کہ سورج طلوع نہیں ہورہا۔رات کی نیند سے بیدار ہوکر نماز بندگی کا قیام ادا کرنے کے لیے اٹھ رہا ہے۔

عجیب خدا اور عجیب تر انسان

کتنا عجیب ہے وہ خدا جس نے یہ سب تخلیق کیا۔جس نے آسمان،سورج اور زمین کو بنایا۔ ان میں موجود ان گنت مخلوقات کو پیدا کیا۔اور ان سب کو ایک کمزور، عاجز،ضعیف انسان کی خدمت میں لگا دیا۔ ذرا سوچیے کہ سورج طلوع نہ ہوتو انسان سردی میں ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔ کوئی ان کی مدد کو نہ آئے گا۔ بادل نہ برسیں تو انسان پیاس سے تڑپ کر مر جائے گا۔کوئی اس کی دادرسی نہ کرے گا۔یہی معاملہ تمام مظاہر کائنات کا ہے جو انسان کی خدمت میں مشغول ہے۔

مگر آہ یہ انسان ! کتنا غافل کتنا ناشکرا کتنا عجیب ہے۔اسے خدا سے کوئی دلچسپی نہیں۔اس کے لیے خدا بس مصیبت میں پکارنے والی ایک مشین ہے اور کچھ نہیں۔اس دور کے اکثر انسانوں کے لیے تو خدا ہے ہی نہیں۔کچھ کے لیے وہ خدا عیسیٰ ابن مریم کا باپ ہے۔کچھ کے لیے خدا ان کا

قومی دیوتا ہے جسے اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ وہ خدا کی نافرمانی کریں، اس کی عائد کردہ ذمہ داریوں سے بھاگیں اور وہ اپنے سارے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر زمین کا اقتدار ان کی خدمت میں پیش کر دے۔ پاک ہے زمین و آسمان کا خدا ان تمام بے ہودہ باتوں سے۔

زمین پر واپسی

ہم تقریباً ایک کلومیٹر کی بلندی تک جا پہنچے۔ ہمارا پائلٹ ہم کو بلندی سے آگاہ کر رہا تھا۔ اس نے دوسروں سے پہلے ہی ہم کو اوپر پہنچا دیا تھا۔ ہمارا غبارہ دوسروں سے پہلے ہوا میں بلند ہوا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ہم نے اپنے نیچے سارے غباروں کو ہوا میں اڑتے ہوئے بھی دیکھ لیا۔

پھر ہم رفتہ رفتہ نیچے اترنا شروع ہوئے۔ پائلٹ نے اس دفعہ پھر ایک فنکاری دکھائی جو اس کی مہارت کا ثبوت تھا۔ وہ ہم کو پہاڑوں کے بیچ میں لے گیا۔ ہمارا غبارہ دو پہاڑوں کے بیچ کسی کھائی میں اتر جاتا۔ پھر وہ اس کو ایک دم سے بلند کر دیتا۔ اس طرح ہم نے کئی پہاڑیوں، ان پر بنے ہوئے فیری چمنی کے گھروں اور پہاڑوں پر اگے درختوں کو بہت قریب سے دیکھا۔ یہ بڑا پر لطف اور دلچسپ تجربہ تھا۔ ایک دفعہ تو ایسا لگا کہ ہم ایک پہاڑ سے ٹکرا جائیں گے کہ کیونکہ غبارہ اٹھنے میں کچھ دیر ہو رہی تھی اور ہم بتدریج پہاڑ سے قریب ہو رہے تھے۔ مگر اس کے قریب پہنچ کر وہ کمال مہارت سے ہم کو اوپر اٹھا کر لے گیا۔

میرے دریافت کرنے پر پائلٹ نے بتایا کہ غبارے کی ڈائکرشن کنٹرول کرنا پائلٹ کے لیے ممکن نہیں۔ وہ بس اوپر نیچے کر لیتے ہیں۔ لیکن اس علاقے کی ہوا ایسی ہے کہ غبارے زیادہ دور نہیں جاتے اور قریب ہی رہتے ہیں۔ خیر زمین سے قریب آ کر ہم نے دیکھا کہ ہمارے غبارے کا زمینی عملہ اپنے ٹریلر میں نیچے سفر کر رہا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر انھوں نے ٹریلر ٹھہرا دیا۔ ہمارے پائلٹ نے ایک دفعہ پھر مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمین پر غبارہ اتارنے کے

بجائے ٹریلر کے اس پچھلے حصے میں باسکٹ اتاری جس میں رکھ کر باسکٹ کو ٹیک آف کے مقام پر لایا جاتا ہے۔

غبارے کی رسیاں گرادی گئیں اور نیچے موجود عملے نے ان رسیوں کی مدد سے غبارے کو نیچے کیا اور پھر زمین پر گرا کر اس کی ہوا نکال دی گئی۔ زمین پر اترے تو ایک تقریب کا اہتمام تھا۔ باسکٹ میں موجود تمام لوگ وہاں موجود تھے۔ پہلے ہماری وہ تصویریں ہمیں دی گئیں جو کھینچی گئی تھیں۔ پھر جس طرح اہل مغرب میں کسی خوشی کے موقع پر شیمپین وغیرہ کو ہلا کر اس کے جھاگ کو ہوا میں اڑایا جاتا ہے اس طرح کے کسی مشروب کا انتظام تھا۔ اسے دیکھ کر ہم دور جا کھڑے ہوئے لیکن انھوں نے یہ کہہ کر قریب بلا لیا کہ یہ نان الکحلک مشروب ہے۔ خیر یہ ایک کولڈ رنک کی طرح کا کوئی لذیذ مشروب تھا۔ آخر میں ہم سب کو میڈل پہنائے گئے۔ اس دوران میں دیگر غبارے بھی اردگرد اترتے رہے۔ کچھ دیر بعد ہمیں گاڑی میں ہوٹل چھوڑ دیا گیا۔

سن سیٹ ٹور اور غیر محسوس تبلیغ

ہاٹ ائیر بلون سے ہم صبح نو بجے فارغ ہو گئے تھے۔ سہ پہر میں ہم دوبارہ قصبے کے مرکزی بازار کی طرف گئے۔ میری خواہش تھی کہ آدھے دن کے لیے کوئی گاڑی مل جائے تو اردگرد کے علاقے میں خود ہی گھوم لیں گے۔ بہت سے مغربی سیاح یہی کر رہے تھے۔ مگر ہر جگہ گاڑی پورے دن کی مل رہی تھی۔ اگلے دن چونکہ ہمیں جانا تھا اس لیے اس کی ضرورت تھی نہ فائدہ۔ آخر کار یہ ارادہ بدلا اور ایک جگہ سے چار پہیوں پر چلنے والی بائیک کا سن سٹ ٹور لے لیا۔ اس پر دو سیٹیں تھیں جن میں ہم دونوں میاں بیوی بیٹھ گئے اور اپنے بچے کو میں نے اپنی گود میں بٹھا لیا۔

اس ٹور میں چار پانچ بائیک تھیں اور ایک بائیک تھی جس پر ٹور گائیڈ جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ ٹور لیڈر ٹینا اور بائیک چلانے والا اس کا ساتھی۔ ان کی بائیک کی سیٹ اسکوٹر کی طرح تھی۔ جس پر

سارے رستے وہ نوجوان ہمارے آگے چلتا ہوا کرتب دکھاتا رہا تھا۔اب اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کرتبوں سے ہمیں متاثر کرنا مقصود تھا یا یہ کہ پیچھے بیٹھی ہوئی خوش جمال ٹینا اس سے چمٹ کر بیٹھی رہے۔

ٹینا روانی سے انگریزی بولتی تھی۔ یہ اسی مغربی ماڈل کا ایک نمونہ تھی جسے ہر جگہ اپنے سفر میں ہم نے دیکھا۔روانگی سے قبل اس سے نماز کا میں نے پوچھا تو اطمینان سے بولی کہ نماز کا وقت نکل گیا۔کل پڑھیے گا۔حالانکہ اس سے میں نے عصر کی نماز کا وقت پوچھا تھا۔خیر میں نے کوئی تبصرہ کیے بغیر اسے اپنی کتاب پیش کردی۔ جو اس نے بہت خوش دلی سے لی۔اس نے پورے یقین سے کہا تھا کہ اسے پڑھنے کا بہت شوق ہے اور وہ ضرور یہ کتاب پڑھے گی۔اس کی انگریزی بہت اچھی تھی۔اس لیے امید تھی کہ دین کا اصل پیغام یعنی آخرت کی فلاح کی بات اس تک پہنچ جائے گی۔

سفر میں راستے میں میرے بیٹے کا کیپ گرگیا۔ ہمارے پیچھے آنے والی برٹش فیملی نے یہ کیپ اٹھالیا اور بعد میں ہمیں دے دیا۔ یہ انگریز میاں بیوی،ان کی بیٹی اور بچی کی نانی ملا کر چار لوگ تھے۔وہ صاحب ساٹھ برس کے لگ بھگ تھے مگر بچی پندرہ سولہ برس کی ہوگی۔ان کو بھی ہم نے بطورشکر یہ اپنی کتاب پیش کی۔میں ہر جگہ کتاب کو مذہبی کتاب کے بجائے اپنی ذاتی تصنیف اور ایک ناول کے طور پر پیش کرتا تھا۔اس سے امید ہو جاتی تھی کہ لوگ اسے تبلیغ سمجھے بغیر پڑھیں گے۔اس غیر محسوس تبلیغ کے بعد باقی لوگ جانیں اور ان کا پروردگار۔

ایک انتہائی حسین شام

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک انتہائی خوبصورت ٹور تھا۔اس میں ہم کئی جگہ گئے۔کئی جگہ ایسی تھیں جہاں ایک دن قبل جانان بھی لے کر گئی تھی۔مگر کل اور آج میں زمین آسمان کا فرق

تھا۔ دراصل شام کی ڈھلتی روشنی میں اس علاقے کا حسن بے حد نکھر گیا تھا۔ اوپر گہرا نیلا آسمان تھا۔ مغربی افق کی طرف ڈھلتے سورج کی تپش دم توڑ چکی تھی۔ اس کے بعد وہ حرارت کے بجائے صرف روشنی کا منبع بن کر رہ گیا تھا۔ اس ڈھلتی روشنی نے اس علاقے کے حسن کو چار چاند لگا دیے تھے۔ ہم مختلف میدانوں، گھاس کے قطعات، فیری چمنی چٹانوں، کھیتوں اور پہاڑیوں کے درمیان بنے اونچے نیچے راستے پر آگے بڑھتے رہے۔ یہ لوگ مختلف جگہ پر رکتے اور لوگوں کو موقع دیتے کہ وہ فوٹو کھینچ لیں۔

مختلف خوبصورت مقامات سے ہوتے ہوئے ہم آخر کار ایک بلند جگہ پہنچے جہاں پر سورج غروب ہونے کا منظر دیکھا جاتا تھا۔ تاہم سورج ڈوبنے سے قبل ہی افق کے بادلوں میں چھپ چکا تھا۔ مگر یہاں کا منظر بے حد خوبصورت تھا۔ چاروں طرف فیری چمنی چٹانیں، ان کے بیچ واقع گھاس کے سرسبز قطعات، دور تک پھیلا پہاڑی سلسلہ، نیلا آسمان، اور ڈوبتے سورج کی سرخی۔ غرض اتنا حسین اور پرکیف منظر تھا کہ یہاں سے اٹھنے اور واپس جانے کا دل نہیں کرتا تھا۔ مگر سورج ڈوبنے کے بعد اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اس لیے ہمیں جانا پڑا۔

اپنا موسم اپنے اندر

پیچھے پرنسز آئی لینڈ کے حوالے سے یہ بیان ہوا ہے کہ وہ بہت خوبصورت جگہ تھی، مگر موسم کی شدت کے سبب اتنی زیادہ اچھی نہ لگی۔ یہی تجربہ یہاں ہوگیا کہ جو مقامات آج سہہ پہر کے ٹھنڈے وقت میں بہت خوب نظر آئے، وہ کل دھوپ میں اتنے متاثر کن نہیں لگے تھے۔

موسم منظر کو بدل دیتا ہے۔ مگر موسم کسی کے بس میں نہیں ہوتا۔ یہی زندگی کا بھی اصول ہے۔ بس اس فرق کے ساتھ کہ زندگی کا موسم باہر نہیں ہوتا، اپنے اندر ہوتا ہے۔ ہمارے اندر کا موسم بھی بدلتا رہتا ہے۔ کبھی اداسی اور مایوسی کی کڑی دھوپ زندگی کے ہر منظر کو بے فیض بنا دیتی ہے تو

کبھی غم والم کی تاریکی زندگی کے ہر رنگ کو نگل جاتی ہے۔

مگر سمجھدار لوگ اپنے موسموں پر کنٹرول کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ وہ اداسی میں مسکرانا، مایوسی میں پر امید رہنا، محرومی میں ملی ہوئی نعمتوں کے احساس میں جینا اور غموں میں آنے والی خوشیوں کا تصور کرنا سیکھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو زندگی کا ہر منظر بہت خوبصورت لگتا ہے۔ جس کے بعد یہ لوگ ایک طرف خالق کی شکرگزاری کے احساس میں جیتے ہیں اور دوسری طرف مخلوق کے لیے بھی سراپا رحمت بن جاتے ہیں۔ مگر لوگوں کی اکثریت اس بات کو نہیں سمجھ پاتی۔ جس کے بعد وہ اپنے اندر کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ شکایت، چڑ چڑا پن، منفی سوچ، بے عملی، ڈپریشن کا شکار یہ لوگ خالق سے بھی ناراض رہتے ہیں اور مخلوق سے بھی بیزار رہتے ہیں۔

مجھے اور آپ کو پہلی قسم کے انسان ہی بننا چاہیے۔ ہمیں اپنا موسم اپنے اندر خود بنانا چاہیے۔ کیونکہ خدا کی دنیا اور خدا کی جنت پہلی قسم کے لوگوں کے لیے اپنے دروازے کھولتی ہے۔ دوسری قسم کے لوگوں کی کوئی جگہ نہ اس دنیا میں ہے، نہ آنے والی جنت میں ہے۔

ہوائی غسل

بائیک پر بیٹھنے سے قبل ہمیں ہیلمٹ پہنایا گیا تھا۔ ساتھ میں منہ کو ڈھانپنے کے لیے ایک نقاب دے دیا گیا تھا۔ مجھے شروع میں تو نقاب کا مصرف سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر جیسے ہی بائیک مٹیالے ٹریک پر آئی، اگلی بائیک کے پہیوں سے اڑنے والی دھول نے ہم پر حملہ کر دیا۔ چنانچہ فوراً سب لوگوں نے اپنا چہرہ ڈھانپا۔ مگر واپس ہوتے وقت تک سر لباس اور اور دیگر حصے بری طرح مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔

چنانچہ جب ہم نے بائیک پارک کی تو ٹور گائیڈ ہمیں ایک جگہ لے گئے۔ وہاں ایک پائپ جس سے زوردار ہوا نکلتی تھی ہم کو غسل دیا گیا۔ جسم سے اتنی دھول نکلی کہ کچھ حد نہیں۔ مگر یہ ہوائی

غسل بھی ایک بڑا مزیدار تجربہ تھا۔

ٹھہرا ہوا وقت، عارضی دنیا اور ابدی جنت

اگلے دن جمعہ کو چار بجے ہماری روانگی تھی۔ اس روز ہم نے کہیں جانے کے بجائے ہوٹل میں رہ کر ریلکس کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہوٹل میں ناشتہ کرنے کے بعد صبح کے وقت ہم اردگرد کے علاقے میں پیدل گھومنے نکل گئے۔ پھر اہلیہ باہر ہی رک گئیں اور میں تنہا کمرے میں لوٹ آیا۔ موسم ابر آلود ہو چکا تھا۔ اردگرد کا منظر یکسر بدل چکا تھا۔ اس لمحے مجھے اندازہ ہوا کہ ایسے ماحول میں جب آپ اپنے ہوٹل کے آرام دہ کمرے کے بیڈ پر لیٹے ہوں...... کھڑکیوں سے دلکش مناظر نگاہوں کے سامنے ہو...... وقت کی رفتار تھم چکی ہو...... ایسے میں تصورِ جاناں کیے بیٹھے رہنا دنیا کی سب سے بڑی تفریح ہے۔

مگر نہیں...... وقت کا پہیہ خاموشی سے رواں دواں تھا۔ وقت کا پہیہ ہمیشہ رواں دواں رہتا ہے۔ جس وقت ہم خاموشی سے بیٹھے ہوئے کچھ نہیں کر رہے ہوتے اس وقت بھی زمین اپنے محور کے گرد ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے حرکت کرتی ہے۔ اسی خاموش حرکت کے نتیجے میں دن ڈھلتا اور رات آتی ہے۔ اس کے ساتھ زمین سورج کے گرد تقریباً تیس کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے مستقل گردش میں ہے۔ یہی گردش موسموں کے آنے جانے کی ذمہ دار ہے۔

شب و روز کی اس گردش اور موسموں کے آنے جانے کے دوران ہی مجھے اور آپ کو چند برس کا سرمایہ حیات دیا گیا ہے۔ مگر ہم اس سرمائے کو اس دنیا کی تعمیر میں لگا دیتے ہیں اور اس آنے والی دنیا کو بھول جاتے ہیں جہاں حقیقی معنوں میں وقت تھم جائے گا۔ جہاں کی نعمتیں بھی ابدی ہوں گی اور محرومیاں بھی ابدی ہوں گی۔

خیر یہ بظاہر ٹھہرے ہوئے لمحے بھی گزر گئے۔ ہماری روانگی کا وقت آ گیا۔ فنڈا نے واپسی

کے لیے گاڑی بک کرادی تھی۔ فنڈا نے روانگی کے وقت بہت محبت سے ہمیں رخصت کیا۔ وہ میری اہلیہ سے گلے ملی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسا کہ وہ اپنے کسی رشتہ دار کو رخصت کر رہی ہے۔ میں نے اسے بہت دعا دی۔ اس کے ہمہ وقت تعاون نے یہاں کے بہترین قیام کو اور بہتر بنادیا تھا۔

گاڑی مقررہ وقت پر آگئی اور ہمیں لینے کے بعد کئی اور سیاحوں کو لینے کے لیے مختلف جگہوں پر واقع ہوٹلوں میں گئی۔ ان راستوں سے گزرتے ہوئے اندازہ ہوا کہ یہاں سیکڑوں کی تعداد میں ہوٹل موجود ہیں۔ ہلکی بارش شروع ہوگئی۔ یہ جگہ پہلے ہی بڑی زبردست تھی اور برسات کے رنگوں نے اس کو حسین تر بنادیا تھا۔ ہر چیز بہت خوبصورت ہوگئی تھی۔

ہم اس خوبصورتی کو چھوڑ کر رخصت ہورہے تھے۔ میرے دل میں یہ احساس پیدا ہورہا تھا کہ دنیا کا کوئی بھی حسن ہو کوئی بھی مقام ہو کوئی بھی کامیابی ہو، انسان کو اسے چھوڑ کر جانا ہے۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ قرآن مجید میں یہ یاد دہانی کرائی ہے کہ جنت میں انسان ہمیشہ رہیں گے۔ بلکہ ایک جگہ یہ بھی واضح کردیا کہ وہ خود بھی وہاں سے نکلنا نہیں چاہیں گے۔ یہ بتانے کی وجہ یہ ہے کہ انسان چیزوں سے بور بھی ہوجاتے ہیں۔ ہم کچھ دیر گوریم میں اور رکتے تو یہی جگہ کاٹنے کو دوڑتی۔ لیکن جنت کے حسن اور تنوع سے انسان کبھی بور نہیں ہوگا۔ اس کی وجہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں کہ جنت لامحدود امکانات کی دنیا ہے۔ وہاں ہر لمحہ جستجو، ایجاد، دریافت، تحسین، تعریف، خوشی، لذت، سرشاری کی ایسی کیفیت ہوگی جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ مگر یہ ان ہی کا نصیب ہوگی جو آج اس دنیا میں اس کی قیمت دینے کے لیے تیار ہوجائیں۔

استنبول کی کملیکا پہاڑی

استنبول میں بارش ہورہی تھی۔ اس لیے فلائٹ دو گھنٹے لیٹ روانہ ہوئی۔ ہماری واپسی کمال

اتاترک ائیر پورٹ کے بجائے صبیحہ گوچکن ائیر پورٹ پر ہوئی جو ایشیائی حصے میں واقع اور کافی دور ہے۔ صبیحہ گوچکن دراصل ایک خاتون کا نام ہے جو ترکی کی پہلی ہواباز خاتون تھیں اور دنیا کی پہلی خاتون تھیں جنھوں نے کسی جنگ میں حصہ لیا۔ اسریٰ ہمیں لینے کے لیے ائیر پورٹ پر موجود تھی۔ اس وقت اس کے ساتھ کوئی اور لڑکی نہیں تھی۔ چنانچہ اسریٰ نے سارا زور لگا کر انگریزی بولنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔ جہاں بہت مشکل ہوتی وہ اپنا آئی فون ہمیں دے دیتی اس پر ہم انگریزی میں جملہ لکھ دیتے اور اس کا ترکی ترجمہ سامنے آجاتا۔ یوں بات چیت ہوتی رہی۔

اسریٰ ہمیں سیدھا ایشیائی حصے میں واقع کملیکا ہل یا پہاڑی پر لے گئی۔ یہ پہاڑی یورپی حصے کے بالمقابل باسفورس کے بالمقابل واقع ہے۔ اس پر جا کر باسفورس اور یورپی حصے کا بہت خوبصورت منظر سامنے آتا ہے۔ ہم یہاں مغرب کے بعد پہنچے تو شہر کی روشنیاں دیکھنے کا موقع مل گیا۔ ایک دو دن بعد ہم لوگ یہاں سہہ پہر کے وقت خود آئے۔ چنانچہ دن کی روشنی میں شہر کا نظارہ کیا۔ اُسی وقت یہ اندازہ بھی ہوا کہ یہاں ایک بہت بڑا پارک اور درختوں کا بڑا سا جنگل بھی موجود ہے۔ پہاڑی کے دوسرے حصے سے شہر کا ایشیائی حصہ بھی دور دور تک نظر آتا ہے۔ استنبول کے طائرانہ جائزے کے لیے بلاشبہ یہ ایک بہترین جگہ ہے۔

ہماری تربیت اور فیڈ بیک کا رجحان

ہمارا نیا ہوٹل ٹاکسم اسکوائر کے قریب ہی واقع تھا۔ اس ہوٹل کی وجہ انتخاب یہ تھی کہ اس کے کمروں کی کھڑکیوں سے باسفورس کا پانی نظر آتا تھا۔ اس کمرے میں رہ کر کھڑکی سے باسفورس کے نیلگوں سمندر، اس پر چلتے ہوئے بڑے بڑے بحری جہازوں اور کنارے کے دوسری طرف استنبول کے ایشائی حصے کو دیکھنا بڑا ہی دلچسپ اور خوبصورت منظر تھا۔ رات کے وقت سمندر کے اوپر اڑتے ہوئے سفید بگلوں پر جب شہر کی روشنیاں پڑتیں تو وہ خود بھی چمکتے ہوئے نظر آتے۔

کبھی بحر اسود کا سیاہ پانی آتا اور باسفورس کے نیلے پانے کے اوپر ایک سیاہ تہہ چڑھتی چلی جاتی۔ پھر دوبارہ پانی نیلگوں ہوجاتا۔ بارش ہوتی تو پانی کی بوچھاڑ سے شہر کو بھیگتے ہوئے دیکھنا بھی ایک پرلطف منظر تھا۔ کمرے میں بیٹھ کر یہ سارے مناظر دیکھنا وہ تفریح تھی جو ہر وقت ہماری دسترس میں تھی۔ تاہم اس کے علاوہ ہوٹل کی ہر چیز غیر معیاری تھی۔ لفٹ کئی دفعہ خراب ملی۔ وائی فائی بھی اکثر خراب رہا۔ کئی دفعہ کمرے کا لاکر خراب ہوا۔ اسٹاف بھی تعاون کرنے والا نہ تھا۔ تاہم اس کی ایک وجہ شاید یہ تھی کہ بیشتر اسٹاف عرب تھا کیونکہ یہاں اکثر عرب ہی ٹھہرتے تھے۔ اسٹاف میں ترکی کا صرف ایک شخص ملا اور وہ بہت زیادہ تعاون کرنے والا تھا۔

میں اس سے قبل بھی اپنے سفرناموں میں عربوں اور خود پاکستانیوں کے متعلق اپنا یہ تاثر نقل کرچکا ہوں کہ ان دونوں اقوام کے لوگ اکثر اپنی ذمہ داریوں کو بوجھ سمجھ کر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ذمہ داری مجبوراً ادا کرتے ہیں تو لگتا ہے کہ احسان کررہے ہیں۔ یہ صورتحال ہمارے سرکاری اداروں تک ہی محدود نہیں، مجھے تو پاکستان کی ایئرلائن جیسے پروفیشنل اداروں کی ایئر ہوسٹسز سے بھی اسی تجربے کا سامنا ہوا ہے۔

اس صورتحال کا ایک بڑا اہم سبب میرے نزدیک یہ ہے کہ ان کی تربیت فرائض کے بجائے حقوق کی نفسیات میں ہوئی ہے۔ یہاں کی سیاسی اور فکری قیادت جس میں علماء، میڈیا، دانشور، صحافی سب شامل ہیں، الا ماشاءاللہ، ان کی انگلیاں ہمیشہ دوسروں کی طرف رہتی ہیں۔ یہ الزام و بہتان کی نفسیات میں جیتے ہیں۔ یہ ہمیشہ دوسری اقوام، دوسرے صوبے، دوسری پارٹی، دوسرے فرقے اور دوسرے گروہ کو ہر خرابی کا ذمہ دار قرار دینے کے عادی ہیں۔

چنانچہ بچپن ہی سے یہ تربیت ہوجاتی ہے کہ ساری ذمہ داری دوسروں کی ہے۔ ہم تو بالکل ٹھیک ہیں۔ اس طرح کے لوگ ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں سے گریزاں رہتے ہیں اور صرف حقوق

کے لیے آواز اٹھانا جانتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں معاشرے میں ہر طرف خرابی پھیل جاتی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ انداز فکر اصلاح کا ہر دروازہ بند کر دیتا ہے۔ ہمارے جیسے اکا دکا لوگ توجہ دلاتے ہیں تو ان کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ہی ثابت ہوتی ہے۔ مگر درحقیقت یہ راستہ تباہی کا راستہ ہے۔ دنیا میں کوئی قوم اور فرد اس طریقے پر دیر پا اور حقیقی ترقی نہیں پا سکتا۔ یہ دنیا دینے سے ترقی کرنے کے اصول پر چلتی ہے۔ لینے، مانگنے، عذر پیش کرنے، دوسروں کو الزام دینے والے لوگوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔

بہرحال میں نے اپنی ذمہ داری پوری کی۔ اس طرح کہ بکنگ کرانے والی سائٹ پر جا کر نئے آنے والوں کو یہاں کے اسٹاف کے بارے میں متنبہ کر کے یہاں نہ ٹھہرنے کا مشورہ دیا۔ گرچہ دیانت داری کے تقاضے کے پیش نظر یہ ضرور بتایا کہ یہاں کا ناشتہ بہترین تھا۔ تاہم اس ہوٹل کے علاوہ ہم نے باقی تمام ہوٹلوں کے فیڈ بیک میں دل کھول کر ان کی تعریف کی۔

یہ بھی بدقسمتی سے ہمارے ہاں ایک مسئلہ ہے کہ لوگ کسی چیز کا فیڈ بیک نہیں دیتے۔ کبھی دیتے بھی ہیں تو اس وقت جب کبھی کسی کے خلاف بہت غصہ آیا ہو۔ کسی کی تعریف کرنے یا اس کا اعتراف کرنے کا رجحان یہاں بہت کم ہے۔ اس کے نتیجے میں اچھے لوگوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور برے لوگوں کا حوصلہ بلند ہوتا ہے۔

مسائل کے باوجود

جیسا کہ عرض کیا اس ہوٹل میں ہمیں کئی پہلوؤں سے مسلسل مسائل کا سامنا رہا۔ مثلاً کمرے کا لاک کئی دفعہ خراب ہوا۔ وائی فائی اکثر نہیں چلتا تھا۔ ہم چھٹی منزل پر تھے اور لفٹ دو تین دفعہ خراب ملی۔ تاہم یہ زندگی کا اصول ہے کہ یہاں کبھی چیزیں ایک جیسی نہیں رہتیں۔ آسانی اور

مسائل ساتھ ساتھ آتے جاتے رہتے ہیں۔انسان کی اصل کامیابی یہ ہے کہ وہ مسائل کے باوجود مطمئن رہے۔اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ چیزوں کو اللہ کے حوالے کر دیا جائے۔ انسان جس وقت چیزوں کو اللہ کے حوالے کرتا ہے تو وہ اللہ کی مدد کو اپنے شامل حال کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کئی پہلوؤں سے اپنے بندوں کی مدد کرتے ہیں۔ایک یہ کہ فوری طور پر ان کو سکون قلب کی نعمت عطا کرتے ہیں۔دوسرے ہر معاملے کو بہتر طریقے سے حل کرتے ہیں۔تیسرے ان مسائل کے بدلے میں انسان کو آخرت کا بہترین اجر دیتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان مسائل پیش آنے پر کچھ نہ کرے۔وہ ہر مسئلے کا ممکنہ حل تلاش کرے۔لیکن جب مسئلہ حل نہ ہو تو ان مسائل کو اللہ کے حوالے کر دے اور ساتھ ساتھ ان مسائل سے توجہ ہٹا کر ان نعمتوں کی طرف مبذول کر دی جائے جو ملی ہوئی ہیں۔یہی مسائل کے باوجود مطمئن رہنے کا راز ہے۔

اکوافلورا

گوریم سے واپسی پر ائیرپورٹ سے شہر آتے ہوئے اسریٰ نے میری اہلیہ کے ساتھ یہ طے کر لیا تھا کہ اگلے دن یعنی ہفتے کو وہ ہمیں حضرت ابو یوب انصاری کے مزار، اس کے قریب واقع پیری لوٹی کے مقام اور ایک شاپنگ سنٹر اکوافلورا لے کر جائے گی۔

پروگرام کے مطابق اگلے دن ہفتے کو ہم روانہ ہوئے۔اس دفعہ ہم ٹاکسم سے کباتش خود چلے گئے جہاں اسریٰ اپنی ایک نئی دوست اوزگی کے ساتھ ہماری منتظر تھی۔آج مترجم کی ذمہ داری اوزگی کے سر تھی۔ یہ لوگ میٹرو میں لے کر ہمیں روانہ ہوئے۔ راستے میں اوزگی نے میٹرو کی متعدد سہولیات سے ہمیں آگاہ کیا۔مثلاً اس نے یہ بات ہمیں بتائی کہ میٹرو میں داخل ہوتے وقت جب ہم اپنا کارڈ اسکین کرتے ہیں تو سسٹم زیادہ سے زیادہ سفر کا کرایہ کاٹ لیتا ہے۔اب ہم اگر

پہلے اتر گئے ہیں تو ہم اترتے وقت ایک اور مشین سے اپنا کارڈ اسکین کر لیں۔ جس کے بعد وہ اضافی کاٹے گئے پیسے واپس کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس نے ایک جگہ اتر کر ہمارے پیسے واپس کروائے۔

ہمیں اکوافلورا کے شاپنگ سنٹر جانا تھا۔ اس تک میٹرو نہیں جاتی تھی۔ چنانچہ یہاں سے ہم ٹیکسی لے کر روانہ ہوئے اور تھوڑی دیر میں منزل پر جا پہنچے۔ یہ استنبول کے بڑے شاپنگ مال میں سے ایک ہے۔ یہاں پر دنیا کا سب سے بڑا تھیم پر مبنی اکوریم بھی موجود تھا۔ چنانچہ میں اپنے بیٹے کو لے کر یہ اکوریم دکھانے چلا گیا اور یہ تینوں خواتین شاپنگ سنٹر دیکھنے لگیں۔

یہ اکوریم اس پہلو سے منفرد تھا کہ یہاں نہ صرف مختلف اقسام کی سمندری حیات موجود تھیں بلکہ ان کو مختلف سمندروں کی تھیمز پر یکجا کیا گیا تھا۔ جیسے بحیرہ اسود، بحرہ قلزم یا بحیرہ مرمرہ وغیرہ میں پائی جانے والی رنگ برنگی اور عجیب وغریب مچھلیاں اور سمندری مخلوق یہاں الگ الگ رکھی گئیں تھیں۔

میں نے اپنے بیٹے کے ہمراہ یہ سارا ایکیوریم دیکھا اور اللہ کی قدرت اور صناعی کے نمونے دیکھتا رہا۔ یہاں کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ دیواروں پر کندہ تصویروں اور مجسموں کے ذریعے ان مختلف بحری اور ساحلی جنگوں اور ان کے اہم کرداروں کو نمایاں کیا گیا تھا جو ترکی کے ساحلوں پر لڑی گئی تھیں۔ ان میں قدیم ترین جنگ ٹراجن وار تھی۔ یہ وہی مشہور زمانہ ٹرائے اور ہیلن والی جنگ تھی جسے یونان کے شاعر ہومر نے اپنے نظموں میں لافانی بنا دیا اور جس سے اب ہالی وڈ کی فلموں نے ہر عام آدمی کو روشناس کرا دیا ہے۔ یہ جنگ بارہ سو قبل مسیح کے قریب لڑی گئی۔ اس میں ایک طرف یونانی تھے جو بحیرہ ایجین عبور کر کے آئے تھے اور دوسری طرف ٹرائے کی یونانی نوآبادی تھی جو موجودہ ترکی کے بالکل مغربی ساحل پر واقع تھی۔

اس قدیم ترین جنگ سے لے کر اس جدید ترین جنگ کا بھی ذکر تھا جو کمال اتاترک کی قیادت میں لڑی گئی۔ بیسویں صدی کے آغاز پر ترکی خلافت کی تمام تر شان و شوکت ختم ہوچکی تھی۔ عثمانی خلافت موجودہ ترکی سے باہر شمالی افریقہ، جزیرہ نما بلقان، یونان اور مشرق وسطیٰ میں بمشکل تمام اپنا قبضہ باقی رکھے ہوئے تھی۔ مگر ہر جگہ اسے پے در پے جنگوں اور بغاوتوں کا سامنا تھا۔ یہاں تک کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی۔ ترکی نے اس امید پر جرمنی کے ساتھ جنگ میں شمولیت اختیار کی کہ کامیابی کے نتیجے میں اس کے وہ یورپی مقبوضات اسے مل جائیں گے جو پچھلی صدیوں میں اس کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔

مگر معاملہ الٹا ہی ہوگیا۔ جرمنی اور اس کے اتحادیوں کو شکست ہوگئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ عثمانی خلافت کے تمام مقبوضات اس کے ہاتھ سے نکل گئے۔ حتیٰ کہ استنبول میں بھی اتحادی افواج داخل ہوگئیں۔ یہ وہ وقت تھا جب مصطفیٰ کمال نے انقرہ کو مرکز بنا کر ایک متوازی حکومت قائم کرلی۔ اس سے قبل مصطفیٰ کمال اتاترک کی جو کہ ایک فوجی افسر تھے یہ شہرت تھی کہ جس جنگ کی قیادت وہ کرتے ہیں اس میں کہیں ترکی کو شکست نہیں ہوئی۔ ہر محاذ پر انھوں نے اپنے دشمنوں کو شکست دی تھی۔ اس میں پہلی جنگ عظیم کی گیلی پولی کے محاذ کی وہ مشہور جنگ بھی شامل ہے جس میں اتحادی افواج نے ترکی پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ کیا اور اتاترک نے غیر معمولی بہادری سے ان کا کئی ماہ مقابلہ کرکے ان کو بدترین شکست دی۔

مصطفیٰ کمال نے اناطولیہ سے ہر جگہ اتحادی افواج کے اس حصے کو جو یونانی فوج پر مشتمل تھا شکست دے کر باہر نکالا۔ اتحادیوں کو اندازہ ہوگیا کہ جلد یا بدیر اتاترک ان کو شکست دے کر استنبول سے بھی نکال دے گا۔ چنانچہ وہ ایک معاہدے کے تحت خود ہی وہاں سے نکل گئے۔ یوں ترکی کی خودمختاری مکمل طور پر بحال ہوگئی۔ قوم نے مصطفیٰ کمال کو اپنا نجات دہندہ اور قوم کا باپ

اتاترک تسلیم کرلیا۔اتاترک صرف ترکی ہی نہیں برصغیر کے مسلمانوں کے بھی رول ماڈل بن گئے کیونکہ اس پورے عرصے میں یہاں کے مسلمان ترکی کے حالات سے براہ راست متعلق رہے تھے۔تحریک خلافت سے لے کر اقبال کے ترکی کے بارے میں کہے جانے والے لافانی اشعار سب اس بات کے گواہ ہیں کہ یہاں کے عوام کو ترکی سے کتنی گہری جذباتی وابستگی تھی۔

جدیدیت

بدقسمتی سے اتاترک نے قوم کو جدید بنانے کا جو راستہ اختیار کیا وہ مذہب کا کفن بن گیا۔اسلام کو بالجبر ریاست ہی نہیں بلکہ معاشرے اور تہذیب سے بھی نکالنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔تاہم بدیع الزماں نورسی جیسے اہل علم نے حکومت کے مقابلے سے ہٹ کر خاموشی سے کام کر کے عوام میں دینی روح بیدار رکھی۔جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک صدی کے اندر اندر ان کے جبریہ سیکولرازم کے بجائے ایک مذہب پسند حکومت ترکی میں قائم ہے۔جدیدیت کے اس عمل میں مذہب کے حوالے سے اتاترک نے جو کچھ کیا درست نہ تھا۔مگر جو ایک سازشی تھیوری ہمارے ہاں مشہور کر دی گئی ہے کہ اتاترک ایک یہودی تھا، یہ بات اپنی کمزوریوں کو نظر انداز کر کے اپنی ہر شکست اور ناکامی کا الزام اغیار پر ڈال دینے کی عادت کے سوا کچھ نہیں۔

اُس دور میں مذہب دشمنی تنہا ترکی میں ہونے والا کوئی عمل تھا۔ترکی سوویت یونین اور یورپ کے جس جغرافیے کے درمیان گھرا ہوا تھا وہاں دونوں طرف یہی کچھ ہو رہا تھا۔اہل یورپ کا سامنا جس جمود پسند مسیحی مذہبیت سے پڑا اس نے رفتہ رفتہ مذہب کے خلاف بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔تاہم وہاں بغیر کسی جبر کے مذہب کو اجتماعی اور انفرادی زندگی سے نکال دیا گیا۔جبکہ روس میں سیکولرازم نے حکومت کی طاقت کی بنیاد پر مذہب کو اجتماعی زندگی سے نکال باہر کیا تھا۔

ترکی میں بھی مذہبی جمود اپنے عروج پر پہنچا ہوا تھا۔خلافت کے سیاسی ادارے کو چونکہ مذہبی

تقدس حاصل تھا اور اہل مذہب کو خلافت کی طرف سے مکمل تائید حاصل تھی، اس لیے حکمرانوں کے خلاف جو بھی لاوا پکتا اس کا رخ مذہب کی طرف بھی ہو جاتا تھا۔ دوسری طرف یورپ کی دیکھا دیکھی جب ترکی والوں نے سائنسی اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے کچھ آگے بڑھنا چاہا تو اہل مذہب کی طرف سے اس کی مزاحمت کی گئی۔ معاشرہ ہمیشہ تغیر پذیر رہتا ہے جبکہ اہل مذہب قدامت کی بیڑیوں میں اسے جکڑ کر رکھنا چاہتے ہیں۔ یہیں سے ایک فکری اور عملی تصادم شروع ہو جاتا ہے۔ یہ تصادم انیسویں صدی میں ترکی میں جاری رہا۔ بیسویں صدی میں جب سیکولر طبقات کو اقتدار ملا تو انھوں نے اہل مذہب کے ساتھ ساتھ مذہب کو بھی دیس نکالا دے دیا۔ یورپ، روس اور آخر میں ترکی سب کے ساتھ یہی ہوا۔ یہ چونکہ ایک غیر فطری اور انتہا پسندانہ عمل تھا اس لیے اس دور کا خاتمہ ہوا اور اسی ترتیب سے مذہب کی واپسی ہوئی۔ یعنی پہلے مغرب، پھر روس اور پھر ترکی میں مذہبی فکر کا احیا ہوا۔

جبر کا خاتمہ

میرے نزدیک اللہ تعالیٰ دنیا کو اس جگہ لے آئے ہیں جہاں انسانیت کا آخری اور حتمی امتحان شروع ہو رہا ہے۔ یعنی اب نہ مذہبی جبر رہا ہے اور نہ سیکولر جبر۔ اب ہر شخص اپنے نیک و بد میں آزاد ہے۔ اب نہ کوئی آپ کو نیکی پر مجبور کرے گا نہ بدی پر۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ دنیا بھر میں انسانیت کا پیغام پہنچا دیں گے۔ اور پھر انسانوں کے پاس یہ موقع ہو گا کہ پوری آزادی کے ساتھ اپنا فیصلہ سنائیں۔ جب انسان اپنا فیصلہ سنا دیں گے تو اس کے بعد آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ سنائیں گے۔ موجودہ دور میں جبر کا خاتمہ اسی اختتام کا آغاز ہے۔

شاپنگ سنٹر، ساحل اور ائیر پورٹ

فلورا شاپنگ سنٹر ایک وسیع و عریض شاپنگ سنٹر تھا جو بحیرہ مرمرہ کے حسین ساحل سمندر پر

واقع تھا۔شاپنگ سنٹر کے عقب میں لب ساحل کھانے پینے کے لیے چھتریوں والے ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے۔شاپنگ سنٹر بلندی پر تھا اور نیچے تک جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ایکیوریم جاتے ہوئے ہم نے یہ طے کیا تھا کہ خواتین سے ہم اسی جگہ پر ملیں گے۔

جب ہم ایکیوریم دیکھ چکے تو میں اپنے بیٹے کے ساتھ باہر نکلا اور اسی جگہ پہنچ گیا۔اسریٰ، اوزگی اور میری بیگم تینوں وہاں موجود تھیں۔اس جگہ سے ایک طرف تو بحیرہ مرمرہ کا دور تک پھیلا نیلگوں سمندر بہت خوبصورت لگ رہا تھا دوسری طرف فضا میں بھی ایک دلچسپ نظارہ موجود تھا۔شاپنگ سنٹر سے ذرا دور اتاترک ائیر پورٹ تھا۔جہاز لینڈنگ کے لیے سمندر کی طرف سے آتے تھے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ سمندر سے اوپر فضا میں دور سے ایک ہی قطار میں جہاز آرہے ہیں۔ جہاں تک ہماری حد نگاہ تھی ہم نے یہ دیکھا کہ ایک وقت میں چار طیارے ایک کے پیچھے مسلسل آرہے ہیں اور ہر منٹ میں جہاز ہمارے سامنے سے گزر کر لینڈ ہورہا ہے۔

میرا خیال تھا کہ شام کے وقت یہاں بیٹھنا یقیناً ایک شاندار تجربہ ہوتا ہوگا۔ کیونکہ سمندر مغرب کی سمت تھا اس لیے غروب آفتاب کا خوبصورت نظارہ بھی یہاں سے دیکھنا ممکن ہوتا ہوگا۔دنیا بھر میں لوگوں نے اپنے ساحلی مقامات کو بہترین تفریحی مقامات میں بدل دیا ہے، مگر پاکستان کے سب سے بڑے ساحلی شہر کراچی جو خوبصورت ترین ساحلی مقامات کا حامل ہے وہاں سردست تو پینے کے پانی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔جو قوم دریائے سندھ کے پاس ہونے کے باوجود پینے کے پانی کا مسئلہ حل نہ کرسکے،اس کے ساحلی مقامات اگر تباہ حال ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

ہماری ادھوری کہانی......

دھوپ کی وجہ سے ہم یہاں زیادہ دیر نہ رکے اور اگلی منزل کی طرف روانہ ہوگئے۔اب ہمیں

حضرت ابوایوب انصاری کے مزار کی طرف جانا تھا۔مگر اس سے قبل پیری لوٹی کی پہاڑی سے شہر کا نظارہ بھی پروگرام میں شامل تھا۔ پیری لوٹی دراصل ایک فرانسیسی ناول نگار کا نام تھا جس نے جنگ بلقان، پہلی جنگ عظیم اور ترکوں کی جنگ آزادی میں ترکوں کی زبردست حمایت کی تھی۔ وہ کئی دفعہ استنبول آیا اور اسی علاقے میں قیام کیا تھا۔اس کا پہلا ناول بھی استنبول ہی پر تھا۔ چنانچہ ترکی کی حکومت نے اسے خراج تحسین پیش کرنے کے لیے پہاڑی پر موجود کیفے کا نام اس کے نام پر رکھ دیا اور یہ پہاڑی اسی کے نام سے مشہور ہے۔

یہ پورا علاقہ حضرت ابوایوب انصاری کے مزار اور ان سے منسوب مسجد کی وجہ سے ایوب ڈسٹرکٹ ہی کہلاتا ہے۔ یہ گولڈن ہارن کی مشہور سمندری خلیج پر واقع ہے جو استنبول کی ایک پہچان ہے۔ پیری لوٹی یہاں کی ایک بلند پہاڑی ہے جہاں سے گولڈن ہارن اور اس کے پار شہر کا نظارہ دور دور تک نظر آتا ہے۔اس کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس پہاڑی تک پہنچنے کے لیے کیبل کار لگی ہوئی ہے۔ ہم اسی کیبل کار کے ذریعے سے پہاڑی تک پہنچے۔ یہاں شہر کا نظارہ کرنے کے لیے ایک جگہ بنی ہوئی تھی۔ یہاں سے ہم نے ایک خوبصورت ڈوبتی شام میں گولڈن ہارن کی سطح پر چلتی کشتیوں اور دور تک پھیلے شہر کو دیکھا۔شام ڈھل گئی اور تاریکی پھیلنے لگی تو اس پھیلتے اندھیرے سے لڑنے کے لیے رفتہ رفتہ شہر کی روشنیاں جگمگانا شروع ہوئیں۔ان کا ساتھ دینے کے لیے آسمان کے جھلمل تارے بھی ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہ منظر گویا کہ ایک طلسماتی منظر تھا۔ بلندی سے دور تک کا نظارہ، کھلا آسمان، سمندر کا پانی ان میں سے ہر چیز انسان کو بہت اچھی لگتی ہے۔ پروردگار کی مہربانی تھی کہ اس نے ہم گنہ گاروں کے لیے یہ ساری چیزیں ایک ساتھ جمع کر دی تھیں۔ان مہربان لمحات میں اس حسین منظر نے ہمیں گویا کہ اپنا اسیر بنالیا تھا۔

مگر میری نظر بار بار آسمان سے پھسلتی ہوئی پہاڑی ڈھلوان کی طرف جارہی تھی۔ یہاں

ایک قبرستان تھا۔ ہر قبر اپنی خاموش زبان میں آج کے منکرین خدا وآخرت سے ایک ہی سوال کررہی تھی۔ایسا کیوں ہے سمندراوردھرتی لاکھوں برس سے قائم ودائم ہیں۔آسمان اوران پر موجودتارے اربوں سال کی زندگی پائیں۔اورابن آدم...... جواس کائنات کی سب سے زیادہ بامعنی تخلیق ہے...... جوسوچتا، دیکھتا، سنتا اور کائنات کے جمال سے محظوظ ہوتا ہے۔وہ بس چند برسوں کے بعدمرجاتا...... مٹی ہوجاتا...... فنا ہوجاتا ہے۔یہی اگرانسان کی آخری حقیقت ہے تو اس کائنات میں اس سے زیادہ بھونڈا مذاق کوئی اورنہیں ہوسکتا۔

پھر یہ انسان اگرشعوروفکراورذوق جمال ہی کا حامل ہوتو پھر بھی یہ بات گوارا کی جاسکتی ہے، مگر یہ انسان ایک اخلاقی وجود ہے۔ یہ خیر وشر کا مکمل شعوراپنے اندر رکھتا ہے۔اس انسان کے پاس کائنات میں استثنائی طور پر یہ اختیار ہے کہ وہ ایک دائرے میں جو چاہے وہ عمل کرے۔ یہ انسان ہی ہے جواپنے سوئے اختیار سے کسی کی جان، مال، آبروکونقصان پہنچادیتا ہے۔ یہ انسان ہی ہے جوسارے اختیار کے باوجوداپنے شر سے لوگوں کو بچاتا بلکہ ان کے لیے سراپا احسان اور ایثار بن جاتا ہے۔

ایسی بامعنی خصوصیات کا حامل انسان اگرایسی بامقصد کائنات میں رہ کراس طرح بے معنی طور پرمرجائے تو اس سے زیادہ بے ہودہ بات کا تصورنہیں کیا جاسکتا۔ ہماری کہانی اِس دنیا میں ادھوری ہے۔ یہ کہانی مرنے کے ساتھ ختم نہیں ہوتی۔اس کہانی کو پورا ہونا ہے۔پیری لوٹی کی یہ حسین شام گواہی دے رہی تھی کہ ایک روز یہ ادھوی کہانی پوری ہوگی۔

یہ کائنات بے مقصد طور پرنہیں بنائی گئی۔نہ اس میں موجودانسان اس طرح بے معنی طریقے پرمل کرختم ہونے والے ہیں۔ایک دن آئے گا جب کائنات کا خالق اور مالک مرنے والوں کوزندہ کرے گا۔جیسے مردہ زمین بارش کے بعدسبزے کودوبارہ اگادیتی ہے۔پھرلوگوں سے ان

کے اخلاقی اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ یہ کائنات ہمیشہ کے لیے صالحین کی بادشاہی میں دے دی جائے گی۔ اور بدکار جہنم کے کوڑا خانے میں جگہ پائیں گے۔

ان دیکھا ایمان

خدا کا وجود علم، عقل اور فطرت کے پیمانوں پر اتنا زیادہ ثابت ہے کہ اس سے زیادہ ثابت اور کوئی چیز ہمارے علم میں نہیں۔ میں نے اپنی زیر تصنیف کتاب ''دلائل القرآن'' میں ان سارے علمی، عقلی اور فطری دلائل کو جمع کر دیا ہے جو قرآن مجید اس حوالے سے پیش کرتا ہے اور جن کے بعد خدا کے انکار کی کوئی گنجائش کسی معقول آدمی کے پاس نہیں۔ تاہم انسان کی یہ بنیادی کمزوری ہے کہ وہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے اصول پر زندگی گزارتا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ انھوں نے انسان کو جس امتحان میں ڈالا ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو بن دیکھے خدا کو ماننا اور اس کی عبادت کرنا ہے۔ ورنہ خدا جیسی بلند اور طاقتور ہستی کی حضوری میں عظیم اور طاقتور فرشتے لرزتے ہیں تو انسانوں کی کیا مجال ہے کہ وہ اس کے حضور چوں چراں کر سکے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہوتے ہوئے بھی انسانوں کے سامنے نہیں آتے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا فائدہ اٹھا کر شیطان نے پچھلے زمانوں میں انسان کو شرک میں مبتلا کیا۔ انسان اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کی صرف اس لیے پرستش کرتا تھا کہ وہ نظر آتے تھے۔ دور حاضر میں شیطان نے انسان کی اسی کمزوری کی بنا پر الحاد کو پیدا کیا ہے کہ خدا ہوتا تو نظر آ جاتا۔ کائنات کے غیر معمولی نظام کی وہ یہ توجیہ کرتے ہیں کہ یہ سب اسباب کی کارفرمائی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسباب بھی تو اللہ نے بنائے ہیں۔ جواب ملتا ہے کہ یہ اتفاق کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ اتفاق وہ ہوتا ہے جو اتفاق سے ہو جائے۔ یعنی ایک دو چیزیں غیر معمولی ہو جائیں تو وہ اتفاق کہلاتا ہے۔ جو غیر معمولی چیزیں تواتر کے ساتھ اور ایک مقصد کے تحت

سامنے آرہی ہوں، اس کو منصوبہ بندی کہتے ہیں۔ مذہب کی اصطلاح میں اس کو قدرت کہتے ہیں۔ یہی وہ منصوبہ بندی اور علم و قدرت پر مبنی صناعی ہے جو اس کرہ ارضی پر ہر جگہ نظر آتی ہے۔ یہ اگر اتفاق ہے تو بہتر ہوگا کہ ڈکشنری میں اتفاق اور منصوبہ بندی دونوں کی تعریف بدل دینی چاہیے۔

میری اہلیہ، اسریٰ اور اوزگی اس منظر کو دیکھنے کے ساتھ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ان تین خواتین کی باہمی گفتگو کی مہربانی کہ میں تنہا اس منظر کو دیکھنے کے قابل ہوا جہاں افق کے پار ایک دوسری دنیا اور اسباب کے پیچھے مسبب الاسباب کی ہستی نظر آرہی تھی۔ اس دنیا اور اس ہستی کا کچھ تذکرہ قارئین کی نذر بھی کر دیا۔

اسکندر کباب

پیری لوٹی پر رات ہو چکی تھی۔ مجھے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے مزار پر جانے کی جلدی تھی۔ میرے توجہ دلانے پر اسریٰ اور اوزگی وہاں جانے کے لیے روانہ ہوئیں۔ مگر اب تقریباً نو بجے کا وقت ہو رہا تھا اور سب کو بھوک لگنے لگی تھی۔ لنچ ہمارے معمولات میں ویسے ہی شامل نہ تھا۔ چنانچہ طے پایا کہ پہلے کھانے کے لیے چلیں۔ واپسی میں کیبل کار کے بجائے ایک ٹیکسی لی جس کے ذریعے سے ہم سیدھے ایوب سلطان مسجد کے قریب اس جگہ اترے جہاں کھانے پینے کے ریسٹورنٹ تھے۔

ہمارے دوست ندیم اعظم صاحب جو اس طرح کی چیزوں کی بڑی رغبت رکھتے ہیں، انھوں نے جانے سے قبل استنبول کے تمام اہم مقامات کی تفصیل کے ساتھ ہمیں یہاں کے اسکندر کباب کھانے کی بھی تلقین کی تھی۔ پہلے تو میں اسے کسی کباب ہاؤس کا نام سمجھا اور یہی سمجھ کر اسریٰ کو اس کے بارے میں بتایا، مگر اس نے یہ تصحیح کی کہ یہ اصل میں ایک خاص قسم کے کباب

کا نام ہے اور یہ ڈش اٹھارہویں صدی میں اسکندر آفندی نامی ایک صاحب نے ایجاد کی تھی۔

ریسٹورنٹ پہنچ کر میں نے اسکندر کباب اور باقی لوگوں نے اپنی پسند کی چیزوں کا آرڈر دیا۔ پہلے دن کے بعد سے میں نے یہ شرط عائد کر رکھی تھی کہ اس طرح کی تمام چیزوں کے پیسے میں ہی دوں گا۔ چنانچہ ہم نے دل کھول کے چیزیں منگوائیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے کھایا۔ خیر کباب واقعی اچھے تھے۔ ورنہ اس سے قبل کملیکا ہل پر اسریٰ نے اپنی پسند سے ایک ترکی ڈش کا انتخاب کیا تھا جو ہمیں زیادہ پسند نہیں آئی تھی۔ شاید ترکی لوگ مصالحے کم ڈالتے ہیں۔

ترکی کے حالات

یہاں ہم سکون سے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ میں نے اوزگی اور اسریٰ سے ترکی کے حالات کے بارے میں تفصیل سے معلوم کیا۔ گفتگو ظاہر ہے کہ انگریزی میں اوزگی سے ہو رہی تھی، مگر وہ بیچ بیچ میں اسریٰ سے بات کر کے اس کی رائے معلوم کر کے مجھے بتاتی رہی تھی۔ اوزگی عراقی النسل عربی خاندان کی لڑکی تھی۔ مگر پیدائشی ترک تھی۔ حلیے اور خیالات کے لحاظ سے کمال ازم کے دور میں پروان چڑھنے والی مغربی نسل ہی کی طرح تھی۔

وہ طیب اردگان کی سخت مخالف تھی۔ بقول اس کے طیب اردگان مذہب کو استعمال کر رہے ہیں اور اس کے آخری نتائج ترکی کے لیے ایسے ہی خوفناک ہوں گے جیسے پاکستان میں مذہب کے استعمال کے نتائج نکلے۔ میں نے معاشی پالیسیوں کا کریڈٹ اردگان کو دینا چاہا تو اس نے اس کی بھی مخالفت کی۔ بقول اس کے جو معاشی ترقی ہو رہی ہے وہ اصلاً ایک خاص طبقے کی ترقی ہے جبکہ غریب و امیر کا فرق بڑھ رہا ہے۔ میں نے استنبول میں گاڑیوں اور خوشحالی کا ذکر کیا تو وہ بولی کہ یہ سب کریڈٹ کارڈ اور بینکوں سے ملنے والے قرضوں کا نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک نقطہ نظر ہے۔ دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ طیب اردگان کے عہد میں ترکی نے بے حد ترقی کی۔ لیرا جو

ایک زمانے میں بہت بے وقعت تھا اب کافی بہتر ہوگیا ہے۔ٹورازم کے علاوہ چھوٹی صنعتوں میں ترقی ہوئی ہے۔سیکولرازم کے جبر کا خاتمہ ہوا ہے۔

تاہم میں نے اس موقع پر اس سے کوئی بحث نہیں کی۔لیکن یہ ایک دوسرا نقطہ نظر سامنے آ گیا۔تاہم شام کی جنگ کے حوالے سے یہ لوگ دل و جان سے حکومت کی پالیسی کے حامی تھے۔تاہم تاریخ یہ بتاتی ہے کہ طاقت ور ممالک کے لیے جنگ جتنی مفید ہوتی ہے، ترقی پذیر اور کمزور ممالک کے لیے اتنی ہی تباہ کن ہوتی ہے۔

ترکی میں ہونے والی حالیہ دہشت گردی نے ٹورازم کو کم کر دیا ہے اور ترکی اربوں ڈالر کی آمدنی سے محروم ہوگیا ہے۔اسی طرح مذہب اگر سیاست میں استعمال ہونے لگے تو تاریخ بتاتی ہے کہ پھر معاشرے تباہی کی طرف بڑھتے ہیں۔خیال رہے کہ میں نے یہ نہیں کہا کہ دین نے اجتماعی اور حکومتی سطح پر کوئی حکم نہیں دیا۔اس کا انکار تو کوئی منکر شریعت کر سکتا ہے۔یہ عرض کیا ہے کہ سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کو استعال کرنا با اعتبار نتیجہ تباہ کن ہوتا ہے۔پھر مزید یہ کہ حالیہ دنوں میں ترکی میں انقلاب کی ناکام کوشش کے بعد جس طرح فتح اللہ گولن کے حامیوں کو کچلا گیا ہے، اس سے بھی معاشرے میں ایک مستقل کشمکش بڑھے گی۔جبکہ شام کی جنگ کے ساتھ ترکی؛ امریکہ اور مغرب سے بھی تصادم کے راستے کی طرف بڑھ رہا ہے۔جبکہ سیکولر اور مذہبی طبقات کی ایک باہمی کشمکش پہلے ہی ترکی معاشرے میں جاری ہے۔

میرے نزدیک ترقی کرنے والی اقوام کو ہمیشہ تصادم سے بچنا چاہیے۔چین اس کی بہترین مثال ہے۔اسی طرح امریکہ نے بھی دوسری جنگ عظیم سے پہلے براہ راست کسی جنگی تصادم میں حصہ نہیں لیا تھا۔یہی اس کی غیر معمولی ترقی کا راز بن گیا۔مگر ترکی نے ایک غلط راستے پر قدم رکھ دیا ہے۔مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے ترکی کی ترقی متاثر ہوگی۔

امن و امان کے معاملات میں اوزگی نے بتایا کہ شہر میں قتل، ڈاکہ زنی وغیرہ کے معاملات بہت کم ہیں۔ البتہ جیب کترنے کے معاملات عام ہے۔ خواتین کو تنگ کرنا، گھورنا یا ان کے خلاف دیگر جرائم بہت کم ہیں۔ حالانکہ یہاں ہر جگہ مغربی خواتین تنہا بھی گھومتی ہیں اور خود ترکی کی بہت سی خواتین بھی مغربی لباس ہی پہنتی ہیں۔

استنبول میں ہر جگہ اور خاص کر ایوب ڈسٹرکٹ اور سلطان احمد ڈسٹرکٹ کے علاقوں میں باحجاب خواتین اور لڑکیاں نظر آئیں۔ لیکن نقاب کم کم ہی نظر آیا۔ بقول میری اہلیہ کے جو نقاب پوش خواتین نظر آئیں، وہ بھی عرب تھیں۔ مقامی خواتین زیادہ تر اوورکوٹ اور اسکارف میں تھیں۔ مسجدیں بھی آباد ہیں۔ ترکی میں مذہبی جذبہ بہت گہرا ہے جسے اتاترک کا جبر بھی ختم نہ کرسکا۔ یہاں سیکڑوں برس سے تصوف کی روایت بہت مضبوطی سے قائم تھی۔ بدیع الزماں نورسی، فتح اللہ گولن جیسے لوگوں کی جدوجہد سے یہ صوفیانہ اسلام زندہ رہا۔ اس وقت سیاسی اسلام بشکل اردگان اور صوفی اسلام بشکل گولن میں ایک تصادم برپا ہوگیا ہے۔ لیکن یہ یاد رہنا چاہیے کہ ترکی میں سیاسی اسلام سے کہیں زیادہ صوفی اسلام مضبوط ہے۔ اس کی فکری اور تاریخی اساسات بہت مضبوط ہیں۔ یہ ملک رومی کا ہے۔ تصوف کے ان سلاسل کا ہے جو صدیوں سے یہاں موجود رہے ہیں۔

طیب اردگان کو جو مقبولیت حاصل ہے، اس میں اصل کردار ان کے دور میں ہونے والی معاشی ترقی کا ہے۔ یقیناً مسلم روایات پر سے پابندی اٹھانے کے عمل کی بھی لوگوں نے بہت تحسین کی ہے، مگر اب سے پہلے گولن کے سارے ساتھی ان کے حمایتی تھے۔ اب صورتحال بہت مختلف ہوگی۔ آئندہ آنے والے چند برسوں میں اس کا فیصلہ ہوجائے گا کہ ترکی کا رخ کیا ہوگا۔ تاہم اس کا شدید اندیشہ ہے کہ اردگان کی مقبولیت اور ترکی کی ترقی دونوں خطرے میں پڑ چکی

ہیں۔ ترقی پذیر قوموں کے لیے تصادم اچھی چیز نہیں ہوتا۔

ایوب سلطان مسجد

ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو عشا کی اذان ہوگئی۔ ہم پیدل چلتے ہوئے مسجد میں پہنچے۔ خواتین الگ ہوگئیں اور میں اپنے بچے سمیت مسجد کے مرکزی ہال میں ہونے والی جماعت میں شامل ہوگیا۔ یہ وہی تاریخی ترکی طرز کی مسجد تھی۔ یعنی ایک مرکزی ہال جس پر ایک بڑا سا گنبد بنا ہوا تھا۔ وہی خوبصورت نقش ونگار اور وہی بڑے بڑے فانوس۔

مرکزی ہال کے بالمقابل حضرت ابوایوب انصاری کا مزار تھا۔ یہ اپنی ذات میں ایک الگ عمارت تھی جس کا دروازہ باہر سے تھا۔ جبکہ مسجد کے اندر ایک جالی دار کھڑکی کے سامنے کھڑے لوگوں کو دیکھ کر اندازہ ہوگیا کہ یہی ان کی قبر کی جگہ ہے۔ یہ ترکوں کے لیے مقدس ترین مقام ہے۔ چنانچہ ہر وقت لوگ یہاں موجود رہتے ہیں۔ اور لوگوں کے ساتھ ایک نیا شادی شدہ جوڑا بھی موجود تھا۔ دلہن لباس عروسی میں تھی اور دولہا بھی دولہا بن کر ہی آیا تھا۔ غالباً یہ دونوں اپنی نئی زندگی کے آغاز پر حصول برکت کے لیے آئے تھے۔

مسجد کے دروازے کے برابر میں ابن اثیر کی مشہور کتاب اُسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ جو صحابہ کرام کی زندگی کے بارے میں ایک نوعیت کا انسائیکلوپیڈیا ہے، سے ایک عربی عبارت حضرت ابو ایوب انصاری کے بارے میں درج تھی۔ جس میں قسطنطنیہ پر مسلمانوں کے پہلے حملے اور اس میں آپ کی وفات کے بعد یہاں آپ کی تدفین کا واقعہ بیان ہوا تھا۔ میں نے اپنے بیٹے کو عبارت کا ترجمہ سنایا۔ پھر آسان زبان میں صحابی رسول کے متعلق بتایا۔ اس کا معصوم دماغ ابھی تک یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ نماز ختم ہونے کے بعد بھی اتنی دیر سے ہم یہاں کیوں کھڑے ہیں۔

قسطنطنیہ اور مسلمان

حدیث کی مختلف کتابوں میں ایک صحیح روایت اس طرح آتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کا وہ پہلا شخص جو قیصر کے شہر پر حملے کرے گا، اس کی مغفرت کر دی گئی۔ اس بشارت کی وجہ سے جب پہلی دفعہ حضرت امیر معاویہ کے زمانے میں مسلمانوں کا لشکر قسطنطنیہ کے لیے روانہ ہوا تو اس میں جلیل القدر صحابہ کرام اور شخصیات شامل تھیں۔ جن میں سیدنا حسین، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ ابن عمر کے علاوہ حضرت ابوایوب انصاری بھی شامل تھے۔

حضرت ابوایوب انصاری کو اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت عطا کی تھی کہ مکہ کا بدر کامل اور آفتاب ہدایت جب مدینہ کی سرزمین پر طلوع ہوا تو اس مینارہ نور ہستی کی میزبانی کا شرف آپ ہی کو نصیب ہوا۔ اسی نسبت سے آپ میزبان رسول کہلائے۔ قسطنطنیہ پر حملہ کرنے والے اس پہلے لشکر کا شہرہ ہوا تو دیگر جلیل القدر صحابہ کرام کے ہمراہ آپ بھی اس سعادت میں حصہ لینے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہ 48 ہجری کا واقع ہے جب آپ کی عمر 80 برس کے قریب تھی۔

یہ ایک انتہائی سخت اور مشکل مہم تھی۔ منزل دور، بحری راستہ، موسم سخت اور سامنے قسطنطنیہ کا ناقابل تسخیر شہر۔ مگر حوصلہ اور عزم جوان تھا چنانچہ آپ نے پوری ہمت سے لشکر کا ساتھ دیا۔ تاہم محاصرہ طویل ہوا اور اسی دوران میں علیل ہو گئے۔ بوقت انتقال آپ نے سالار قافلہ کو یہ وصیت کی کہ مجھے دشمن کی سرزمین میں جہاں تک ممکن ہو اندر جا کر دفن کرنا۔ چنانچہ مسلمانوں کے لشکر نے آپ کو شہر کی دیوار کے پاس دفن کیا۔ قسطنطنیہ تو اس حملے میں فتح نہ ہو سکا مگر اہل ترکی کو یہ شرف حاصل ہو گیا کہ وہ تا قیامت میزبان رسول کے جسدِ خاکی کی میزبانی کریں۔

قسطنطنیہ کی فتح

تاہم اس کے بعد بھی مسلمانوں نے کئی دفعہ قسطنطنیہ پر حملہ کیا۔ اس کی وجہ شاید روایات میں

آنے والی بعض پیش گوئیاں ہوں۔ جیسے ایک روایت بہت مشہور ہے کہ یقیناً تم قسطنطنیہ فتح کروگے اور وہ امیر کیا ہی خوب ہوگا اور وہ لشکر کیا ہی خوب لشکر ہوگا۔ مگر یہ روایت ضعیف ہے۔ تاہم بعض دیگر روایات میں فتح قسطنطنیہ کی پیش گوئی موجود ہے۔ مگر اس کے باوجود قسطنطنیہ کی فتح پہلے حملے کے کم و بیش آٹھ صدی بعد ہی ممکن ہوئی جب 1453 میں سلطان محمد فاتح نے اسے فتح کیا۔ مسلمانوں کی تمام تر فوجی قوت و طاقت کے باوجود اس فتح میں تاخیر کا سبب اس شہر کا جغرافیہ تھا۔

قسطنطنیہ محض ایک شہر نہ تھا۔ یہ ایک تاریخ تھی ۔ ایک مذہب تھا۔ عظمت کی ایک علامت تھی ۔ مگر ان سب کے ساتھ یہ ایک آہنی حصار بھی تھا۔ یہ ایک نا قابل تسخیر شہر تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دنیا کی عظیم ترین سلطنت یعنی رومی ایمپائر جو بعد میں بازنطینی ایمپائر کہلائی ، اس کا دارالخلافہ تھا۔ قدرت نے اس شہر کو ایسا جغرافیہ عطا کیا تھا کہ اس کو فتح کرنا بہت مشکل تھا۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے استنبول کا جغرافیہ سمجھ لیجیے۔ موجودہ استنبول کا ایک حصہ ایشیا میں ہے اور دوسرا یورپ میں ۔ یورپی حصے میں دور تک آبنائے باسفورس کے پانی کی ایک خلیج بنی ہوئی ہے۔ جو گولڈن ہارن کہلاتی ہے۔ اس کے ایک طرف گلاطہ ٹاور اور ٹاکسم کا علاقہ ہے اور دوسری طرف سلطان احمد کا وہ علاقہ جس میں توپ کاپی اور آیا صوفیہ وغیرہ موجود ہیں ۔

قسطنطنیہ کا قدیم شہر اس حصے میں واقع تھا جسے اب ہم سلطان احمد کہتے ہیں۔ سلطان احمد کے ایک طرف یہی گولڈن ہارن کا پانی ہے۔ باقی دو اطراف بحیرہ مرمرہ کا سمندر ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا کہ سلطان احمد ایک پہاڑی علاقہ ہے ۔ یہ پہاڑی علاقہ اصل زمین سے آگے ایک جزیرہ نما کی طرح باہر نکلا ہوا ہے جس کے تین طرف پانی ہے۔ پہاڑی ہونے کی بنا پر یہاں کوئی ساحل نہیں جہاں کوئی فوج لنگر انداز ہو کر اس پر حملہ کر سکے۔ اس جزیرہ نما کی چوتھی سمت مغرب

میں بازنطینی ایمپائر کی پوری سلطنت موجود تھی جو بلقان اور مشرقی یورپ میں پھیلی ہوئی تھی۔

اب یا تو کوئی فاتح پوری بازنطینی سلطنت کو مغربی سمت سے فتح کرتا ہوا بالکل آخر میں آ کر اس شہر کا محاصرہ کرے یا پھر سمندر کی سمت سے اس کا محاصرہ کرکے اس کی واحد بندرگاہ جو گولڈن ہارن میں واقع تھی اس پر قبضہ کرکے شہر میں داخل ہو۔ مگر سوال تھا کہ یہ کیسے کیا جائے۔ رومی سلطنت کا اپنا بحری بیڑہ تھا۔ شہر کی حفاظت کے لیے ایک بہت بڑی دیوار بنی ہوئی تھی جس پر متعین فوجیوں کے تیروں سے بچ کر نکلنا بہت مشکل تھا۔ وہ اوپر کھڑے ہوکر جب نیچے گولڈن ہارن میں موجود حملہ آور بحری بیڑہ پر تیروں کی بوچھاڑ کرتے تو ان کا بچنا بہت مشکل تھا۔ دوسرے یہ کہ خشکی کے راستے کسی طرح محاصرہ کر بھی لیں تب بھی یورپ کے سخت جاڑے میں یہ محاصرہ ہر حال میں ختم کرنا پڑتا کیونکہ برفباری کسی بھی فوج کو تباہ کرنے کے لیے کافی تھی۔ جبکہ قلعے کی موٹی دیواریں اور سپلائی لائن ایسے کسی بھی محاصرے کو کئی ماہ تک آسانی سے جھیل سکتی تھی۔

ان سب حقائق کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف جو چیز جاتی تھی وہ یہ کہ مسلمان تاریخ میں زیادہ تر قسطنطنیہ کے مشرق میں ایشیا میں موجود تھے۔ ان کے لیے یہاں تک پہنچنے کی ایک ہی شکل تھی کہ بحری راستے سے یہاں تک آ کر اس کا محاصرہ کرتے۔ ایسے کسی محاصرے سے فتح کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

تاہم سلطان محمد فاتح کے تخت نشین ہونے تک صورتحال اس پہلو سے تبدیل ہوچکی تھی کہ مسلمانوں کی ایک بہت طاقتور سلطنت یعنی سلطنت عثمانیہ قسطنطنیہ کے بالکل برابر میں قائم ہوچکی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ سلطنت پھیل کر بلقان کی سمت میں پہنچ گئی تھی۔ گویا مسلمان پہلی دفعہ بازنطینی سلطنت کے عقب میں خشکی پر موجود تھے۔ دوسری طرف بازنطینی سلطنت اپنی طبعی عمر پوری کر کے قریب المرگ تھی۔

اسی پس منظر میں سلطان محمد نے انیس سال کی عمر میں تخت نشین ہونے کے دو برس بعد ہی قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا۔ تاہم قسطنطنیہ اس حالت میں بھی کوئی تر نوالہ نہیں تھا۔ اول تو شہر کی دیواریں بہت مضبوط تھیں دوسرے قیصر نے گولڈن ہارن کے دہانے پر آر پار ایک موٹی آہنی زنجیر لگوا کر بحری جہازوں کا داخلہ بند کر دیا تھا۔ جس کے بعد بندرگارہ کسی حملے سے بالکل محفوظ ہوگئی۔ چنانچہ شہر میں داخلے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہا تھا۔

سلطان نے ان دونوں مسائل کا علاج کر لیا۔ شہر کی دیواروں کو ڈھانے کے لیے اپنے زمانے کی سب سے بڑی توپ بنوائی گئی ۔ جبکہ بحری جہازوں کو آبنائے باسفورس سے گولڈن ہارن پہنچانے کے لیے اس نے خشکی میں جہازوں کے لیے ایک راستہ بنوایا۔ یہ راستہ تیل ملے ہوئے لکڑی کے تنوں پر مشتمل تھا۔ ان پر رکھ کر بحری جہازوں کو موجودہ گلاطہ ٹاور کے علاقے سے ہوتے ہوئے گولڈن ہارن میں اتار دیا گیا۔

اب صورتحال عثمانیوں کے حق میں ہو چکی تھی، مگر شہر کی دیواروں کو توڑنا بہت مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ محاصرہ گرما کے آغاز پر 6 اپریل کو شروع ہوا تھا اور مئی کا آخر آ گیا تھا، مگر دیوار ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی، گرچہ کمزور پڑ چکی تھی ۔ عثمانیوں کا مسلسل جانی نقصان ہو رہا تھا۔ سلطان نے قیصر کو صلح کی آخری پیشکش کی کہ پرامن طور پر شہر حوالے کر دیا جائے تو قیصر کو سلطنت کے ایک حصہ کا گورنر مان کر خود مختاری دے دی جائے گی اور تمام لوگوں کو جان مال آبرو کا مکمل تحفظ دیا جائے گا۔ قیصر نے یہ پیشکش رد کر دی۔ آخر کار 29 مئی کو فیصلہ کن حملہ کیا گیا۔ رومیوں نے جان توڑ مزاحمت کی ۔ مگر فصیل شہر کے ایک کمزور حصے سے سلطان کی فوج اندر داخل ہوگئی۔ جس کے بعد شہر فتح ہو گیا۔

ایک تقابل

ایک بات یہاں قابل توجہ ہے۔ وہ یہ کہ دنیا میں ہر دور میں یہ دستور رہا ہے کہ طاقتور ریاستوں کے حکمران اپنی طاقت کے بل بوتے پر جہاں تک ممکن ہوتا ہے قبضہ کرتے چلے جاتے ہیں۔یہی عثمانی سلطنت تھی جو بڑھتے بڑھتے پورے مشرقی یورپ اور پھر آسٹریا تک جا پہنچی تھی۔اسے ہم اپنی عظمت کے کھاتے میں لکھتے ہیں۔مگر جب اسپین پر مسیحی قبضہ کرتے ہیں تو ہم اس پر مرثیہ کہتے ہیں۔اس عاجز کے نزدیک اپنی کامیابی پر قصیدہ خوانی کرنا یا شکست پر مرثیہ پڑھنا نادانی ہے۔اصل چیز ہے سبق سیکھنا۔سبق یہ ہے کہ جو کمزور ہوتا ہے اسے شکست قبول کرنا ہوتی ہے۔اس لیے دوسروں کو الزام دینے کے بجائے اپنی کمزوریوں کو دور کرنے پر توجہ دینا چاہیے۔آج بھی دنیا کے کچھ مسلم ممالک پر غیر مسلموں کا قبضہ ہے تو یہ کسی سازش کا نہیں ہماری کمزوری کا نتیجہ ہے۔ رہی سازش کی بات تو وہ بھی کمزور کے خلاف ہی کامیاب ہوتی ہے۔ طاقتور لوگ تو سازش کرنے والوں کا بھرکس نکال دیتے ہیں۔

موجودہ دور میں سب سے بڑی کمزوری جہالت اور اپنے تعصّبات کو حقائق پر ترجیح دینا ہے۔ یہ دونوں چیزیں الحمدللہ ثم الحمدللہ ہمارے ہاں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ہمیں ان کو دور کرنا چاہیے نہ کہ دوسرے کو الزام دے کر اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالیں۔

طاقت،علم،دعوت

بات کچھ لمبی ہورہی ہے مگر ایک اور اہم بات پر توجہ دلائے بغیر چارہ نہیں ہے۔وہ یہ کہ فتح قسطنطنیہ گرچہ عثمانیوں اور کل عالم اسلام کے لیے ایک بہت بڑی فتح تھی،مگر اس نے بالواسطہ طور پر آنے والی صدیوں میں مغرب کو وہ عالمی قوت بنادیا جس کی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔فتح قسطنطنیہ نے ایک طرف عثمانیوں کو عالم اسلام میں ایک برتری دلادی تو دوسری طرف انھیں ایک عظیم قوت بنادیا جو ایشیا کے ساتھ یورپ کی بھی سب سے بڑی طاقت بن گئی۔اس فتح نے

یورپ کی تسخیر کے دروازے کھول دیے اور عثمانیوں کو رومیوں کی عظمت کا جانشین بنا دیا۔

تاہم دوسری طرف یورپ کی یہ شکست آنے والے دنوں میں ایک بڑی فتح کی نوید بن گئی۔ اس شکست نے نفسیاتی طور پر پورے یورپ کو ہلا کر رکھ دیا۔ صلیبی جنگوں میں یورپ کی شکست کے بعد اس مزید شکست نے اہل یورپ میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ ان کا مذہبی، علمی، سماجی ڈھانچہ ہر اعتبار سے قابل اصلاح ہے جو دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چنانچہ احیائے علم کی زبردست تحریک پیدا ہوئی۔ اس میں قسطنطنیہ سے جانے والے اہل علم و فضل نے کلیدی کردار ادا کیا۔ یوں طاقت کے میدان میں شکست کھا کر یورپ نے آنے والی صدیوں میں علم کے میدان میں کامیابی حاصل کر کے دنیا کو فتح کر لیا۔

مسلمانوں کے لیے عظیم موقع

دور جدید میں یہی موقع ایک دوسرے پہلو سے مسلمانوں کے لیے پیدا ہو گیا ہے۔ اہل مغرب کے ہاتھوں طاقت کے میدان میں مکمل اور بار بار شکست کھانے کے بعد اور علمی طور پر بہت پیچھے ہونے کے باوجود مسلمانوں کے لیے دو عظیم مواقع پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک انفارمیشن ایج نے اسلام کی دعوت کا دنیا میں ہر جگہ پہنچنا ممکن بنا دیا ہے اور دوسری طرف بڑے پیمانے پر مسلمانوں نے مختلف معاشی اور سیاسی وجوہات کی بنا پر ہجرت کی ہے۔ ان دونوں کی وجہ سے اب ممکن ہو چکا ہے کہ طاقت اور علم کے میدان میں شکست کھانے والے دعوت کے میدان میں دنیا کو فتح کر لیں۔

مینیا ترک

ہم ابا بیٹے کافی دیر تک مسجد میں خواتین کا انتظار کرتے رہے۔ آخر کار تینوں خواتین نمودار ہوئیں اور ہم باہر نکلے۔ ہوٹل واپس آنے کے لیے ٹیکسی کی۔ ہمیں چھوڑنے کے بعد اسریٰ اور

اوزگی اپنی منزل کی طرف بڑھ گئیں۔

اگلے دن ہمارا ارادہ مینیا ترک پارک یا لٹل ترکی جانے کا تھا۔ انفارمیشن سنٹر سے ہم نے وہاں پہنچنے کا طریقہ دریافت کیا۔ اس دفعہ یہ معلوم ہوا کہ وہاں ایک بس سیدھی جاتی ہے۔ یہ بس میٹرو اسٹیشن سے ایک منزل نیچے واقع روڈ پر آتی تھی۔ اس بس سے ہم مینیا ترک پارک پہنچے۔ کل گولڈن ہارن کے ایک کنارے پر ہم پیری لوٹی گئے تھے اور آج اس کے دوسرے کنارے پر بنے اس پارک میں ہم موجود تھے۔ اس پارک میں ترکی کی تمام تر اہم عمارتوں جیسے بلو مسجد، آیا صوفیہ وغیرہ کے چھوٹے چھوٹے سے ماڈل بنے ہوئے رکھے تھے۔ ہر ماڈل کے پاس ایک آڈیو سسٹم نصب تھے جس پر اپنا پاس اسکین کرنے کی صورت میں وہاں سے اس عمارت کے بارے میں تمام تر معلومات بیان ہونا شروع ہو جاتی تھیں۔ عمارتوں کے علاوہ بعض ماڈل پورے پورے قلعوں کے تھے۔ گوریم کی فیری چمنیاں اور ہاٹ ائیر بیلون کا ماڈل بھی بنا ہوا تھا۔ ہماری رہائش گاہ یعنی ٹیکسم اسکوائر اور گلاطہ ٹاور کا چھوٹا سا ماڈل بھی تھا۔ اس کے علاوہ بچوں کے کھیلنے کے لیے جھولے بھی بنے ہوئے تھے۔ یہ ایک بڑی دلچسپ اور معلوماتی جگہ تھی۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ تمام کی تمام معلومات ترکی زبان میں تھیں۔ اس لیے مقامی لوگوں خاص کر بچوں اور طلباء کے لیے تو یہ ایک بڑی سہولت تھی، مگر ہمارے جیسے سیاح ترکی سنتے اور اپنا منہ بسور کر رہ جاتے۔

تاہم اس طرح کی چیزوں کو دیکھنا اور ان کے ساتھ تصویریں بنانا بھی سیاحوں کے لیے ایک بڑا اچھا تجربہ تھا۔ مختلف اہم عمارات کے ساتھ ائیر پورٹ اور جہاز، ٹرین اور پانی کے تالاب میں چلتے چھوٹے سے بحری جہاز بھی موجود تھے۔ ایک جگہ کیبل کار کا بھی ماڈل بنا تھا اور پہاڑی سے وادی تک دو چھوٹی چھوٹی کیبل کاریں آتی جاتی رہتی تھیں۔ جبکہ ایک ماڈل موٹر وے اور اس پر چلتی چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی گاڑیوں کا بھی تھا۔ مقامی عمارات کے ساتھ بین الاقوامی عمارات بھی

اس منصوبے کا حصہ تھیں، مگر ابھی تک ان کا ماڈل نہیں لگایا گیا تھا مگر بیت المقدس اور قبۃ الصخرا وغیرہ کا ماڈل موجود تھا۔

میرے نزدیک بچوں کو ایجوکیٹ کرنے اور سیاحوں کو اپنے بہترین مقامات سے متعارف کرانے کے لیے یہ ایک بہترین آئیڈیا تھا۔ مگر ہم کس منہ سے اپنے ملک میں اس ماڈل کو دہرانے کا مشورہ دیں۔ اس لیے کہ اس ملک کے لوگوں کو بجلی اور پانی جیسی لازمی بنیادی سہولتوں کے لالے پڑے ہیں۔ خاص کر جس شہر میں میں رہتا ہوں وہاں حکمران کوڑے کے ڈھیر اٹھانے، پانی فراہم کرنے جیسی بنیادی سہولیات فراہم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ جب تک وفاقی حکومت نے فوج کی مدد سے آپریشن شروع نہیں کیا تھا ہر روز بیس تیس لوگوں کا قتل معمولی بات تھی۔ کبھی بھولی بھٹکی اس شہر میں بارش ہو جائے تو سزا کے طور پر پورا دن شہر کی لائٹ بند ہونا معمول کی بات ہے۔

ایسے میں کرنے کا صرف ایک ہی کام ہے کہ جمہوری عمل کے تسلسل کی حمایت کی جائے اور جمہوری حکمرانوں کو قابو کرنے کے لیے ان کے اقتدار کا عرصہ تین یا چار سال مقرر کیا جائے۔ ساتھ میں شفاف الیکشن اور حکمرانوں کے احتساب کے عمل کو یقینی عمل بنایا جائے۔

چھوٹے صوبے

ترکی کی آبادی پاکستان سے تین گنا کم ہے یعنی تقریباً ساڑھے سات کروڑ۔ مگر قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کے اس کے 81 صوبے ہیں۔ بڑے صوبے یا ریاستیں بادشاہی نظام کی علامت ہیں۔ کیونکہ اس میں حکمرانوں کی ہوس اقتدار کی تسکین کے زیادہ سے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ لیکن مقصد اگر عوام کی خدمت ہے تو بڑا صوبہ اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ صوبہ یا انتظامی یونٹ جتنا چھوٹا ہوگا عام آدمی کے مسائل اتنی ہی تیزی اور آسانی سے حل ہوں گے۔ دنیا

بھر میں جمہوری حکومتوں نے عوام کی خدمت کی غرض سے پہلے سے موجود صوبوں کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ مگر پاکستان میں اس کے بالکل برعکس کیا گیا۔ پہلے تو ون یونٹ کے نام پر مغربی اور مشرقی پاکستان کے دو انتظامی یونٹ بنائے گئے۔ جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان الگ ہو گیا۔ پھر چار دیوہیکل صوبے بنائے گئے۔ اندازہ کیجیے کہ اس وقت پنجاب کی آبادی دس کروڑ اور سندھ کی ساڑھے پانچ کروڑ کے قریب ہے۔

پچھلے دس برسوں میں جب ہماری سیاسی ایلیٹ نے یہ سمجھ لیا کہ کوئی پارٹی مکمل پاکستان میں اقتدار حاصل نہیں کر سکتی بلکہ اہم پارٹیاں صرف صوبوں تک محدود ہو گئی ہیں تو انھوں نے اٹھارہویں ترمیم کے ذریعے زیادہ تر مالی اختیار صوبوں کو منتقل کیے۔ اب ہر پارٹی قوم پرستی کی بنیاد پر اپنے صوبے سے منتخب ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ مرکز میں جیت گئے تو اچھی بات ہے ورنہ صوبوں میں اور اس کے بعد مکمل اختیارات سے حکومت کرنے اور لوٹ مار کے بھرپور مواقع تو موجود ہی ہیں۔ مگر درحقیقت یہ پاکستان کو مزید تقسیم کرنے کا راستہ ہے۔ یہ صورتحال اگر تبدیل نہیں کی گئی تو اگلے بیس تیس برسوں میں اس کا شدید اندیشہ ہے کہ پاکستان میں مزید تقسیم ہو جائے گی۔ چھوٹے صوبے بنانا ہمارے بیشتر مسائل کا حل ہے۔

اصل کام

ان بنیادی سیاسی اور انتظامی اصلاحات کے ساتھ ساتھ ضروری ہے کہ فکری قیادت نے قوم کو جن لایعنی نشانوں کی طرف دوڑا رکھا ہے ان کے بجائے اصل نشانے یعنی اعلیٰ اخلاقی رویے کو نصب العین بنا کر قوم کے سامنے پیش کیا جائے۔ نظام تعلیم کو اسی اصول پر از سر نو منظم کیا جائے۔ تعلیمی نظام کے لیے کم از کم دس فی صد بجٹ وقف کیا جائے اور پوری قوم کے لیے صرف ایک نظام تعلیم مقرر کیا جائے۔ ایک نظام تعلیم ایک قوم بناتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں دس نظام تعلیم ہیں

جو دس طرح کی قوم پیدا کر رہے ہیں۔

جب تعلیم یافتہ اور اعلیٰ اخلاقی انسان پیدا ہونا شروع ہوں گے تو ایک نسل میں معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔ قومی اصلاح کی راہ کا کوئی شارٹ کٹ نہیں ہوتا۔ یہی وہ راستہ ہے جو آخر کار دنیا میں ہماری عزت و وقار کا سبب بنے گا۔

دنیا میں پاکستان کی عزت

مینیا ترک کو جب ہم پورا دیکھ چکے تو میری اہلیہ بچے کو جھولوں میں بٹھانے لے گئیں۔ میں ایک جگہ سائے میں نشست پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ برابر میں ایک عمر رسیدہ ترک جوڑا بیٹھا ہوا تھا۔ خاتون نے مجھ سے میرے متعلق پوچھا۔ میں نے بتایا کہ میں پاکستانی ہوں تو بہت خوش ہوئیں اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا کہ پاکستان ہمارا دوست ملک ہے۔ اس سے قبل گوریم میں بھی ہم پاکستان اور پاکستانیوں کے حوالے سے اسی طرح کے الفاظ سن چکے تھے۔

ترکی اب شاید ان اکا دکا ملکوں میں سے ایک ملک ہے جہاں پاکستان کے متعلق کچھ حسن ظن رہ گیا ہے۔ ورنہ پچھلے دنوں ایک دوست جو سری لنکا گئے تھے بتایا کہ وہاں بھی ائیر پورٹ سے باہر نکلتے ہی پولیس نے پوری فلائٹ کو چھوڑ کر صرف مجھے دھر لیا اور پولیس اسٹیشن لے جا کر پوری تحقیق کی۔ صرف اس وجہ سے کہ میں پاکستانی ہوں۔ وجہ پولیس نے خود بتائی کہ پاکستانی چونکہ منشیات لے کر آتے ہیں اس لیے ان سے تفتیش ضروری ہوتی ہے۔ خیال رہے کہ اب سری لنکا کا بھی ویزہ لینا پڑتا ہے، ورنہ میں ایک زمانے میں جب یہاں گیا تھا تو بغیر کسی تکلف کے ائیر پورٹ سے نکلا اور اطمینان سے پورا سری لنکا گھوم کر آیا تھا۔ اسی طرح ملائیشیا گیا تھا تو سنگاپور کے بارڈر پر ویزہ مل گیا تھا۔ اب تو وہاں بھی ویزہ لے کر جانا پڑتا ہے۔

انسان اور خدا

اسی نشست پر بیٹھے بیٹھے میں ان چھوٹے چھوٹے ماڈلوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک خدا اور انسان کا تعلق ایک نئے پہلو سے سمجھ میں آیا۔ خدا اپنی ذات میں یکتا ہے، اس جیسا کوئی نہیں۔ تاہم صفات کے پہلو سے، چاہے بہت ہی کم درجہ میں سہی، انسان خدا کا ایک عکس ہے۔ دیکھنے، سننے بولنے کی استعداد کے علاوہ اختیار، ارادہ، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت، خیر و شر کا شعور اور ذوق جمال وہ چیزیں ہیں جن میں انسان خدا کا عکس لیے ہوئے ہے۔ اس پہلو سے انسان کو گویا چھوٹا سا ''خدا'' بنا کر زمین پر بھیجا گیا ہے۔

جو انسان اب اس دنیا میں بظاہر صاحبِ اختیار ''خدا'' ہوتے ہوئے اپنی اصل حیثیت یعنی بندہ ہونے کو دریافت کر لے اور سرکشی کا راستہ چھوڑ کر بندگی کا راستہ اختیار کر لے تو اللہ تعالیٰ اسے خدا نہ سہی کائنات کا بادشاہ ضرور بنا دیں گے۔ اور جو غافل اور سرکش اس معمولی سی مہلت میں ملے کچھ اختیارات کو پا کر اپنے رب کو بھول گیا کل قیامت کے دن اس کو جہنم کے قید خانے میں بند کر دیا جائے گا۔ اس وقت یہ چھوٹا ''خدا'' جان لے گا کہ اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں تھی۔

مصالحہ بازار، والدہ سلطان مسجد اور دوبارہ گلاطہ برج

مینیا ترک سے ہم جلد ہی واپس ہو گئے۔ چنانچہ شام فارغ تھی۔ ہمارے جانے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ میری اہلیہ میں خواتین کی وہ خاص حس بیدار ہو چکی تھی جسے شاپنگ کہتے ہیں۔ اسریٰ اور اوزگی نے انھیں بتایا تھا کہ ایمینو نو اسٹیشن کے پاس ایک اچھا بازار ہے۔ اس لیے شام کو وہاں کے لیے نکلے۔ کباتش سے میٹرو ٹرین میں بیٹھ گئے اور ایمینو نو اسٹیشن پر اتر گئے۔

بازار میٹرو اسٹیشن سے اتر کر ہی واقع تھا، مگر اس وقت بند ملا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ آج اتوار تھا۔ البتہ ساتھ واقع اسپائس بازار کھلا ہوا تھا۔ اس بازار میں مصالحہ جات اور کھانے پینے کی دیگر اشیا کی بہتات تھی۔ یہ چیزیں اس کثرت اور خوبصورتی کے ساتھ سجی ہوئی تھیں کہ گاہک کچھ

خریدے بغیر واپس نہ ہوسکتا۔ جبکہ دیگر اشیا کی دکانیں بھی موجود تھیں۔ بیگم نے ان سے کچھ خریداری کی۔ اذان ہوگئی تو ہم نے قریب واقع ینی جامع یعنی نئی مسجد میں نماز پڑھی۔ یہ مسجد نام کی نئی تھی ورنہ تو سترہویں صدی میں خلیفہ وقت کی ماں صفیہ سلطانہ نے اس کو تعمیر کرایا تھا۔ اسی لیے اس کو والدہ سلطان مسجد بھی کہا جاتا ہے۔

مسجد ترکی طرز تعمیر کا دلکش نمونہ تھی۔ وہی ایک مرکزی اور نقش و نگار سے مزین گنبد۔ وہی ایک مرکزی فانوس۔ یہاں البتہ ایک خاص بات یہ تھی کہ مٹھائی تقسیم ہورہی تھی، مجھے اندازہ ہوا کہ رمضان کی آمد کی خوشی میں ہورہا ہے۔ کیونکہ آج چاندرات تھی۔

ہم کچھ دیر مسجد میں رک کر باہر نکلے تو اندھیرا پھیل چکا تھا اور روشنیاں جل رہی تھیں۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہ جگہ کچھ مانوس سی ہے۔ اس پر اہلیہ نے توجہ دلائی کہ سامنے گلاطہ برج ہے اور وہی جگہ ہے جہاں بیٹھ کر ہم نے اسریٰ اور فلس کے ساتھ ڈنر کیا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ یہ علاقہ گولڈن ہارن کے دہانے پر تھا۔ یعنی یہاں سے باسفورس کا پانی زمین پر گویا کہ ایک یو ٹرن لے کر ایک بڑے دریا کی طرح آگے بڑھتا ہے۔ پہلے ہم یہاں اسریٰ کے ساتھ گاڑی میں آئے تھے تو برج کے دوسری طرف اترے تھے۔

ہمارا وائی فائی دو دن سے خراب تھا۔ چنانچہ میں نے اہلیہ سے کہا کہ ہم اسریٰ کے کزن کے ریسٹورنٹ میں جا کر اس سے ملتے ہیں اور اس کے ذریعے سے اسریٰ کو اپنی خیریت کی اطلاع دے دیتے ہیں۔ پھر اسریٰ ہماری خیریت کی اطلاع پاکستان دے دے گی کیونکہ اس کا میرے بھتیجے سے رابطہ تھا۔ چنانچہ ہم پیدل چلتے ہوئے برج کے اس حصے میں پہنچے اور آخر کار اس درجنوں ریسٹورنٹ میں سے اس خاص ریسٹورنٹ کو ڈھونڈ ہی لیا جہاں ہم نے کھانا کھایا تھا۔

ترکی نمی دانم

تاہم یہاں ہمیں بڑے سخت مرحلے سے دوچار ہونا پڑا۔ تمام ریسٹورنٹ والوں کی طرح یہاں کے ملازمین بھی ہمیں گاہک سمجھ کر اندر بلانے لگے۔ ہم اندر چلے گئے اور انگریزی میں ریسٹورنٹ کے مالک کے بارے میں پوچھنے لگے تو جواب میں ملازمین انواع اقسام کے کھانوں کی تفصیل بتانے لگتے۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ ان کا دھیان کھانوں سے ہٹا کر اپنی بات کی طرف لگائیں۔ مگر وہ کچھ سننا ہی نہیں چاہتے تھے۔ سوائے اس کے کہ ہمیں کوئی کھانا پسند کروادیں۔ ایک ملازم جس نے اس روز ہمارے لیے کھانا لگایا تھا، اس کو ہم نے یاد دلانے کی کوشش کی کہ ہم فلاں فلاں دن آئے تھے، مگر وہ بھی نہ سمجھ سکا۔ ظاہر ہے کہ گاہک تو بہت آتے ہیں، شکل کون یاد رکھتا ہے۔

تھک ہار کے ہم واپس لوٹ گئے۔ برج پر جاتے ہوئے میری اہلیہ کو یاد آیا کہ اس روز موبائل سے جو تصویریں لی تھیں ان تصویروں میں ایک میں اسریٰ کا کزن بھی موجود تھا۔ چیک کیا تو معلوم ہوا کہ ان کی یادداشت نے بالکل درست کام کیا تھا۔ ہم دوبارہ لوٹے اور اس دفعہ کچھ کہنے سننے کے بجائے ملازمین کو وہ تصویر دکھادی۔ جس کے بعد انھوں نے برابر والے ریسٹورنٹ سے اسریٰ کے کزن کو بلا دیا۔ وہ فوراً ہم کو پہچان گیا۔ اس کی انگریزی بھی بہت اچھی تھی۔ چنانچہ ہم نے اس کو بتایا کہ ہمیں اسریٰ سے رابطہ کرنا ہے۔ اس نے فوراً اس کو فون ملایا۔ مگر ظاہر ہے کہ اسریٰ بھی انگریزی نہیں بول سکتی تھی۔

اس کا آسان حل یہ نکالا گیا کہ اس نے اپنے ریسٹورنٹ کے وائی فائی سے ہم کو کنکٹ کر دیا۔ جس کے بعد بذریعہ تحریر اسریٰ سے رابطہ ہو گیا۔ بلکہ اسریٰ ہی سے کیا وہیں بیٹھے بیٹھے ہم نے پورے خاندان سے رابطہ کر لیا۔ کیونکہ دو دن سے وائی فائی خراب تھا اور سب سے رابطہ منقطع تھا۔ اس دوران میں اس نے ہمیں کھانے کی آفر کی جو ہم نے شکریہ کے ساتھ منع کر دی۔ البتہ

موقع غنیمت جان کر میں نے اس سے کہا کہ ہمیں دودھ والی چائے چاہیے۔اس شرط پر کہ ہم پیسے دیں گے ورنہ نہیں پیئں گے۔اس کے تمام تر اصرار کے باوجود ہم پیسوں والی شرط پر قائم رہے۔ میں نے اسے بتایا کہ شام کے وقت دودھ والی چائے ہمارا معمول ہے اور ترکی میں دودھ والی چائے کا کوئی تصور ہی نہیں۔ یہاں آ کر ہم اس عیاشی سے محروم تھے۔اس کا شکریہ کہ وہ ہماری بات مان گیا اور ہم نے اس روز اسی خوبصورت مقام پر بیٹھ کر شام کی چائے پینے کی عیاشی کر لی۔

تاہم آج یہاں اس روز کی طرح رش نہ تھا۔گرچہ آج چھٹی کا دن تھا۔مگر آج چاندرات کی وجہ سے کم لوگ یہاں موجود تھے۔چائے پی کر ہم نے بل دیا اور رخصت ہونے لگا تو وہ دوبارہ آ گیا اور کہنے لگا کہ آپ لوگوں کو میرا بھائی ہوٹل چھوڑ دے گا۔اس کا ٹرانسپورٹ کا کام ہے۔ہم اس کا شکریہ ادا کر کے روانہ ہوئے اور ہوٹل پہنچے تو اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے اصرار کیا مگر وہ پھر بھی نہ مانا۔یوں ایک اور اچھی اور پرلطف شام رب کی عنایتوں اور ترکوں کی محبتوں کے ساتھ تمام ہوئی۔

ترکی کی شاپنگ

جیسا کہ عرض کیا کہ روانگی کا مرحلہ آ رہا تھا۔اس لیے اہلیہ نے شاپنگ شروع کر دی تھی۔ ہماری تو رہائش ہی عین شاپنگ کے مرکز میں تھی۔یعنی استقلال ایوینیو۔ہم اپنے ہوٹل سے نکل کر پہلے ٹاکسم اسکوائر آتے اور وہاں سے استقلال ایوینیو آ جاتے۔ہمارا یہاں آنا معمول بھی تھا اور مجبوری بھی کہ ہر راستہ یہیں سے آگے بڑھتا تھا۔کھانا یہیں ملتا تھا اور اب شاپنگ کے لیے بھی یہاں آنا پڑ رہا تھا۔

ترکی شاپنگ کے لیے ایک بہتر جگہ تھی۔ یہاں چیزیں دنیا کے کئی ممالک کی بہ نسبت سستی ہیں۔ترکی لیرا ایک زمانے میں بہت کم قیمت کا تھا۔ایک زمانے میں ایک ڈالر کے دس ہزار لیرا

آتے تھے۔مگراب معاشی ترقی کے بعد یہ کافی بہتر ہوگیا ہے اوراب ایک ڈالر میں تقریبا تین لیرا آتے ہیں۔شایداسی پس منظر میں وہاں چیزیں مقابلتاً سستی ہیں۔جبکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ عام استعمال کی چیزیں معیاری ہوتی ہیں۔پاکستان میں تو جتنی بھی مہنگی چیزخریدیں،ان کا خالص اورمعیاری ہونا بہت مشکل ہوتا ہے۔

خواتین کی عریانی اورمرد

میری اہلیہ کو خاتون ہونے کی بنا پر شاپنگ اوردکانوں سے جتنی دلچسپی تھی، مجھے اس عمل سے اتنی ہی وحشت ہے۔اس لیے میں اکثر دکانوں کے باہر کھڑا ہوکراس کی شاہراہ اوراس پر موجود رش کو دیکھتا رہتا۔ مجھے اکثر لوگ سعودی سمجھتے۔شروع شروع میں تو مجھے اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔بعد میں احساس ہوا کہ شاید کچھ میری داڑھی کی وجہ سے کچھ اہلیہ کے باپردہ لباس کی وجہ سے وہ یہ سمجھتے تھے۔سعودی ٹورسٹ یہاں کثرت سے تھے۔ان کے لیے خاص عربی کھانوں کی بہت سی دکانیں تھیں۔ان کے ایجنٹ باہر کھڑے رہتے اور ہر جگہ عربی زبان میں مخاطب کر کے مجھے اندرآنے کی دعوت دیتے۔ مجھے سعودی عرب کے اپنے قیام کی بنا پر عربی کھانوں سے واقفیت تھی اورعام بول چال کی تھوڑی بہت عربی میں جو وہیں سیکھی تھی ان کو جواب دے کرآگے بڑھ جاتا۔

استقلال ایوینیو پر ہر رنگ ونسل کے لوگ ملتے۔مگرزیادہ ترمغربی رنگ میں رنگے ہوتے تھے۔سڑک پر مغربی تہذیب کی خرابیاں عام نظرآتی ہیں۔شراب نائٹ کلب، ہاتھوں سے لے کر ہونٹوں کو باہم ملائے مردوزن، نیم عریانی سب یہاں موجودتھا۔ایک وقت تھا کہ میں اس طرح کی چیزوں کو دیکھ کر سخت متوحش ہوجاتا تھا۔میں ایک قدامت پسند شخص ہوں جس کی فکری تربیت میں ''پردہ'' جیسی کتاب کے مصنف مولانا مودودی،مغربیت کے سخت ترین ناقد مولانا ابو الحسن ندوی جیسے مفکرین شامل ہیں۔

تاہم جب سے میرا ذہن مسلم تہذیب کے ایک نمائندے کے بجائے ایک داعی کا ذہن بنا ہے، میری سوچ یکسر تبدیل ہوگئی ہے۔ مجھے اس تبدیلی کا احساس پہلی دفعہ 2008 کے بنکاک کے سفر میں ہوا۔ جب مجھے اسی طرح کی کسی چیز سے نفرت کے بجائے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ یہی کیفیت یہاں بھی رہی۔ میں نے خود کو ایک داعی کے طور پر جب رکھا تو محسوس ہوا کہ یہ لوگ نفرت کے نہیں ہمدردی کے مستحق ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب اس طرح کی چیزوں کو دیکھ کر قلم تلوار بن جاتا تھا۔ تحقیر و تذلیل کے جذبات پیدا ہوتے اور دوسروں پر تنقید، طنز اور تعریض کے تیر برساتے تھے۔ مگر اب یہ لوگ اپنی اولاد کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔ اولاد کے لیے تو صرف دل سے دعا نکلتی ہے یا اصلاح کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ جہاں تک انسانی حیثیت میں عریانی کو محسوس کرنے کا تعلق ہے تو برسہا برس میں اللہ تعالیٰ نے اسے ہینڈل کرنے کا طریقہ سکھا دیا ہے۔ وہ یہ کہ کبھی نظر جھکانے کا موقع ہوتا ہے اور کبھی نظر ہٹانے کا۔ ایک مرد کو اپنی نفسیات کے خلاف جا کر یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ اس دنیا میں نسوانی بدن حظ (Enjoyment) اٹھانے کے لیے نہیں، مردوں کے امتحان کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ اگر کوئی خاتون اپنے جسم اور خدوخال کو خود نمایاں کرتی ہے تو یہ اس کا مسئلہ ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی نگاہ اور دل کا جواب دینا ہے۔ ساری توجہ اسی پر ملحوظ رہنا چاہیے۔

تاہم جہاں تک ایک عام پاکستانی کا تعلق ہے، اس کے لیے مغربی کلچر کی سب سے پہلی چیز جو قابل توجہ بنتی ہے وہ خواتین کی نیم عریانی ہے۔ مگر باقی دنیا اب مختلف جگہ پر آ چکی ہے۔ وہاں کوئی نگاہ کسی کا تعاقب نہیں کرتی۔ کوئی نظر ان کے جسم سے آر پار نہیں ہوتی۔ کوئی آوارہ ان پر فقرہ نہیں کستا۔ کوئی ہوس پرست رش کا فائدہ اٹھا کر ان کے جسم کو مس کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ چیزیں عام طور پر بند معاشروں کی پیداوار ہوتی ہیں جن میں ساری ذمہ داری خواتین کی ہوتی

ہے۔ مردوں کو کوئی سبق نہیں دیتا کہ ان کی کیا ذمہ داری ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ قرآن کا یہ سبق کہ مردوں کو اپنی نگاہیں نیچے کرنا چاہیے کم از کم پبلک مقامات پر اہل مغرب نے اس طرح اپنایا ہے کہ وہ خواتین کو گھور کر نہیں دیکھتے۔

وہ جس کے خزانے ختم نہیں ہوتے

سڑک پر جگہ جگہ موسیقی بج رہی ہوتی تھی۔ کہیں کوئی مقامی فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا ہوتا تھا۔ لوگ سکے ڈال کر اس کے فن کی داد دیتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ بھیک مانگنے کا ایک مہذب طریقہ بھی ہے۔ میرے پاس جب سکے بچ جاتے میں ایسے لوگوں کو دے دیتا۔ ایک دفعہ رات کے ایک بجے کے قریب ہم استقلال ایوینیو سے گزر رہے تھے کہ ایسے ہی ایک گلوکار پر سے گزر ہوا۔ میں نے جیب کھنگالی تو معلوم ہوا کہ سکے پیچھے ختم ہو چکے ہیں۔

مجھے لمحے بھر میں احساس ہوا کہ اس کائنات میں ایک ہی ہستی ہے کہ اس کی عطا کے سکے کبھی ختم نہیں ہوتے۔ اس کے خزانوں کو کوئی زوال نہیں۔ نہ اس کا حوصلہ دینے کے لیے کبھی کم پڑتا ہے۔ نہ اس کی فیض رسانی میں کوئی کمی آتی ہے۔ نہ اس کی برکتیں ماند ہوتی ہیں نہ اس کے فضل کی بہار کو کبھی خزاں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ وہ مانگنے والوں کو بھی دیتا ہے۔ نہ مانگنے والوں کو بھی دیتا ہے۔ مجرموں کو بھی دیتا ہے۔ مشرکوں کو بھی دیتا ہے۔ ملحدوں کو بھی دیتا۔ مایوسوں کو بھی دیتا ہے۔ امیدواروں کو بھی دیتا ہے۔ طلبگاروں کو بھی دیتا ہے۔ وہ سب کو دیتا ہے، مگر وفاداروں کو نہیں دیتا......ان پر تو وہ اپنی رحمتیں برساتا ہے۔ ان پر تو اپنا فضل انڈھیلتا ہے۔ ان پر تو عطا کی بوچھاڑ کر دیتا ہے۔ ہاں ان کے لیے اس کی عطا کا پیمانہ یہ فانی دنیا نہیں جس کی حیثیت ایک مچھر کے پر اور ایک مردہ بکری سے زیادہ نہیں۔ کیا کسی محبوب کو مردہ بکری دی جاتی ہے؟ کسی وفادار کو گھٹیا مچھر پیش کیے جاتے ہیں؟ وفاداروں کو تو وہ آسمانی بادشاہی دیتا ہے۔ فردوس بریں دیتا ہے۔

بہشت کے مراتب بلند دیتا ہے۔ابدی رفعتیں دیتا ہے۔

ہاں دنیا سے ضرورت کی چیزوں سے ان کو محروم نہیں رکھتا۔اچھی بیوی، باسہولت گھر، نیک اولاد اور سب سے بڑھ کر خدا کی وفاداری کا وہ جذبہ جو ہر تعصب پر غالب آجائے، اگر کسی کے پاس ہے تو وہ اطمینان رکھے، اسے دنیا میں بھی سب کچھ مل چکا ہے۔

ڈولما باپیلس اور شام کی چائے

اگلے دن ہم ہوٹل سے نکلے۔ پہلے ہم نے ڈولما باپیلس جانے کا ارادہ کیا۔کباتش سے اس کا دس پندرہ منٹ کا پیدل راستہ تھا۔ یہ اسی جگہ سے کچھ آگے واقع تھا جہاں سے فیری اسکودر اور پرنس آئی لینڈ وغیرہ کے لیے روانہ ہوتی تھی۔ثنا کے ساتھ رات میں اسکودر جاتے ہوئے ساحل پر یہی سب سے نمایاں عمارت تھی اور ہم نے سوچا تھا کہ اس میں بھی جائیں گے کیونکہ اب یہ ایک میوزیم بن چکا تھا۔

یہ پیلس سلطان عبدالمجید کے حکم پر 1843 سے 1856 کے عرصے میں تقریباً 35 ٹن سونے کے برابر رقم خرچ کر کے تعمیر ہوا۔ اس کی تعمیر کی وجہ یہ تھی کہ یورپ کی دیگر اقوام کے بادشاہوں کے محلات میں جو سہولیات اور اُس دور کی تعیشّات جمع تھیں وہ توپ کاپی کے قدیم محل میں نہ تھیں۔ چنانچہ 258 کمروں اور گیارہ ایکڑ پر مشتمل یہ عظیم الشان محل جو کہ ترکی کا سب سے بڑا اور مہنگا محل تھا تعمیر کیا گیا۔تاہم اس پر اٹھنے والے انتہائی بھاری اخراجات نے ترکی کی معیشت کو ڈانواں ڈول کر دیا اور آنے والے برسوں میں ترکی یورپ کا مرد بیمار قرار پایا۔

اتفاق کی بات ہے کہ ہم پیر کے دن یہاں پہنچے اور اُس روز یہاں پر چھٹی تھی۔ اس لیے سیاحوں کا یہاں داخلہ ممکن نہ تھا۔ خیر ہم نے اس کا ازالہ اس طرح کیا کہ محل کے برابر میں باسفورس کے ساحل سے متصل ایک ہوٹل تھا۔ یہاں جا کر ہم نے دودھ والی چائے کے بارے

میں دریافت کیا۔ چائے تو تھی مگر دودھ والی نہ تھی۔ اتفاق سے برابر میں ایک ترکی صاحب موجود تھے جو امریکہ میں رہتے تھے۔ انھوں نے ویٹر کو ترکی میں سمجھایا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ جس کے بعد وہ قہوے کے ساتھ الگ سے دودھ لے کر آیا۔ خاص طور پر ہمارے لیے دودھ والی چائے بنا کر لایا۔ اب ہم تھے، دودھ والی چائے تھی، باسفورس کا نیلگوں ساحل تھا، باسفورس کے پار براعظم ایشیا کا کنارہ تھا اور سمندر پر چلنے والی کشتیاں اور جہاز تھے۔ ان سب نے مل کر اس سہ پہر کا لطف دوبالا کر دیا اور ہمیں پیلس میں نہ جانے کا افسوس نہیں ہوا۔ بس عبرت کا ایک مقام دیکھنے سے رہ گیا کہ محل رہ جاتے ہیں، بادشاہ گزر جاتے ہیں۔ دنیا میں کوئی محل کسی بادشاہ سے وفا نہیں کرتا۔ اسی طرح کوئی گھر بھی مالک سے وفا نہیں کرتا۔ دو میں سے کوئی ایک انجام مقدر ہوتا ہے۔ محل نہیں رہتا یا بادشاہ نہیں رہتا۔ مالک نہیں رہتا یا گھر نہیں رہتا۔ بس اللہ رہتا ہے اور اس کا نام رہتا ہے۔

گرینڈ بازار

محل کے برابر میں اسی زمانے کی بنی ہوئی ایک اور والدہ سلطان مسجد میں ہم نے نماز عصر ادا کی۔ یہ ایک چھوٹی مگر خوبصورت ترکی طرز تعمیر کی مسجد تھی۔ نماز کے بعد ہم اپنی اگلی منزل یعنی گرینڈ بازار کی طرف روانہ ہو گئے جو اسپائس بازار کے اسی علاقے سے قریب تھا جہاں ہم کل گئے تھے۔

گرینڈ بازار دنیا کا سب سے قدیم اور بڑا بازار تھا جو باقاعدہ ایک مارکیٹ کی شکل میں چھت کے نیچے بنایا گیا تھا۔ اس کی تعمیر قسطنطنیہ کی فتح کے بعد 56-1455 میں شروع ہوئی۔ گویا تقریباً سات صدیوں سے یہ بازار یہاں موجود ہے۔ یہاں چار ہزار دکانیں ہیں اور روزانہ لاکھوں سیاح اور خریدار یہاں سے خریداری کرتے ہیں۔ سن 2014 میں یہاں نو کروڑ

سے زاید سیاح آئے تھے۔

قارئین شاید یہ سوچ رہے ہوں کہ سات صدیوں سے اس بازار کے قائم رہنے کی کیا وجہ ہے۔ یہ بازار اپنی تاریخ کے بیشتر عرصے میں دراصل سلطنت عثمانیہ کی طاقت، عظمت اور معاشی استحکام کی علامت رہا۔ خلافت عثمان اُس دور کی متمدن دنیا کے عین وسط میں واقع تھی۔ یہ ان تمام علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی جو براعظم ایشیا، افریقہ اور یورپ کے سنگم پر واقع تھے۔ دنیا کے تمام اہم بحری اور بری راستوں پر عثمانیوں کا کنٹرول تھا۔ چنانچہ تمام تجارتی قافلے ان کے مراکز سے ہوکر گزرتے تھے۔ جس کے نتیجے میں دنیا میں پائی جانے والی ہر چیز نہ صرف استنبول آتی بلکہ یہاں کہ لوگ معاشی خوشحالی کی بنا پر اسے خرید بھی سکتے تھے۔

اس کی درجنوں گلیوں میں واقع ہزار ہا دکانوں کو دیکھنے کا ہمارے پاس وقت نہیں تھا۔ تاہم ہر جگہ خریداروں اور سیاحوں کو شاندار اور سجی سجائی دکانوں میں شاپنگ کرتے دیکھا۔ جس دکان میں جو سامان موجود تھا وہ بہت خوب تھا اور بہت زیادہ تھا۔ ان میں سے سونے اور زیورات کی دکانیں سب سے زیادہ چمک دمک والی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ سونے سے پیلی ہو رہی ہیں۔ باقی ہر طرح کی دکانیں بھی موجود تھیں۔ بازار بہت صاف ستھرا اور نفیس تھا۔ ہر گلی میں دور دور تک دائیں بائیں سیکڑوں دکانیں تھیں۔ گلیوں کی چھتیں ہموار نہیں تھیں بلکہ نصف دائرے کی شکل میں گولائی میں بنی ہوئی تھیں جس سے نہ صرف بہت خوبصورتی آگئی تھی بلکہ بازار کے بند ہونے کی وجہ سے گھٹن کا جو احساس پیدا ہوسکتا تھا وہ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ چھتوں پر خوبصورت ٹائلز اور نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ ہر گلی میں ہزاروں سیاحوں اور خریداروں کا رش تھا، مگر ہوا، روشنی، صفائی غرض کسی پہلو سے کوئی منفی تاثر پیدا نہیں ہو رہا تھا۔

میرے لیے ان بازاروں میں صرف یہی کشش تھی کہ ان کو دیکھ کر آخرت کے بازار یاد

آجاتے ہیں۔ جنت کے بازاروں میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے جو نعمتیں رکھی ہیں، ان کا آج اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔لیکن انسان اپنی دکانوں کو سجانے اور چمکانے کے بعد جتنا خوبصورت اور پرکشش بنادیتے ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے جنت کی دکانوں کا حسن و جمال، تنوع، بوقلمونی اور ورائٹی کیسی شاندار ہوگی۔

لیکن ان بازاروں سے خریداری کا اعزاز انھی لوگوں کو ملے گا جو اس دنیا میں ایمان اور اخلاق کے تقاضے پورے کرتے رہے۔ یہ دنیا آخرت کے لیے کمانے کی جگہ ہے۔جس نے ایمان و اخلاق کے تقاضے پورے کر کے یہاں نیکیاں کمالیں، کل قیامت کے دن یہ نیکیاں جنت کی کرنسی اور کریڈٹ کارڈ میں بدل جائیں گی۔

سلیمانیہ مسجد

سلیمانیہ مسجد گرینڈ بازار سے قریب تھی۔ تھوڑی دیر بعد ہم گرینڈ بازار سے مسجد کے لیے روانہ ہوئے۔لیکن یہ قریب کا فاصلہ چڑھائی کا فاصلہ تھا۔سلیمانیہ مسجد ترکی کی سات پہاڑیوں میں سے تیسری پہاڑی پر تھی۔اس چڑھائی کا ہمیں اندازہ نہیں تھا۔خیر بمشکل تمام ہم وہاں پہنچے۔

لیکن سچی بات یہ ہے کہ جب مسجد پہنچے تو وہاں کا جمال اور کمال دیکھ کر ساری تکان دور ہوگئی۔ یہ شہر کی سب سے بڑی اور شاندار مسجد تھی۔عصر کی نماز کا وقت قریب تھا اس لیے ہم پہلے سیدھا مسجد گئے۔ غیر مسلم خواتین کو مسجد میں داخلے کی اجازت تھی۔لیکن ان کو لانگ اسکرٹ اور اسکارف دیا جارہا تھا۔تا کہ وہ برہنہ ٹانگوں اور ننگے سر مسجد میں داخل نہ ہوں۔

خواتین اور مسجد

اس مسجد میں جا کر مجھے اور اہلیہ کو جو سکون ملا اس کی کچھ تفصیل آگے آرہی ہے۔میری اہلیہ کو یہاں اور اس سے قبل ترکی کی ہر مسجد میں بہت سکون ملا تھا۔مگر ہماری یہ بدقسمتی ہے کہ ہم نے

عورتوں کے اوپر مسجد کے دروازے بند کردیے ہیں۔ اس دور میں تو اب یہ عملی ضرورت بھی بن گئی ہے کہ سفر اور ملازمت پر نکلنے والی خواتین مسجد میں جگہ نہ ہونے کی بنا پر نماز قضا کر دیتی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں لوگ خواتین کو مسجد میں داخلے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہیں۔ اس ممانعت کے حوالے سے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ یا تو کسی خاص موقع محل کی بات ہے یا اس کا تعلق خواتین کی اپنی ترجیحات سے ہے۔ کوئی شخص ایک حدیث پیش نہیں کرسکتا جس سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ خواتین کا مسجد میں داخلہ منع ہے۔

دو باتیں جو خواتین میں مسجد میں جانے کی ممانعت کے حوالے سے پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ خواتین کی گھر میں نماز باعث فضیلت ہے۔ مگر گھر کی فضیلت سے مسجد کی ممانعت کیسے ثابت ہوتی ہے؟ اس لیے ہر مسجد میں خواتین کے لیے جگہ ہونی چاہیے۔ خاص کر اس مسجد میں جس میں عید کی نماز ہوتی ہے کیوں کہ صحیح حدیث کے مطابق حضور نے عید کی نماز کے لیے خواتین کا مسجد میں آنا ضروری قرار دیا ہے۔ تاریخی طور پر بھی ہم جانتے ہیں کہ دور رسالت اور خلافت راشدہ دونوں میں خواتین مساجد میں جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ دورِ رسالت میں مسجد سے واپس جاتے ہوئے ایک خاتون کا ریپ ہوگیا۔ پھر بھی مسجد نبوی میں خواتین کا نماز کے لیے آنا بند نہیں کیا گیا۔

ایک اور بات یہ کہی جاتی ہے کہ خواتین زیب و زینت کے ساتھ مسجد جاتی ہیں جس سے فتنہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اگر کوئی ایسی بات ہے تو اس کا درست طریقہ یہ ہے کہ ان کو سمجھایا جائے کہ وہ مسجد میں اللہ کی حدود کی پابندی کر کے آئیں۔ ممانعت کر دینا تو کوئی طریقہ ہی نہیں، نہ اس سے کوئی خیر پیدا ہوگا۔ ویسے بھی حضور کے زمانے میں جب صفیں آگے پیچھے ہوتی تھیں تب یہ کوئی فتنے والی بات تھی۔ اب تو بڑی سہولت یہ ہوگئی ہے کہ مسجدوں میں خواتین کا حصہ

مردوں سے بالکل الگ بنایا جاسکتا ہے۔اب اس اعتراض کا تو ویسے ہی کوئی محل نہیں رہا۔ پھر بھی خواتین کو توجہ دلاتے رہنا چاہیے۔

قرآن اور رمضان

سلیمانیہ مسجد روایتی ترکی طرز پر بنی ایک عالیشان مسجد تھی۔یعنی پہلے بڑا سا صحن اور پھر مرکزی حصہ جو گنبد کی شکل میں تھا۔اس مسجد کا مرکزی حصہ بھی اتنا ہی شاندار اور وسیع تھا۔مرکزی حصے پر وہی بلند گنبد والی چھت۔ چھت پر خوبصورت نقش ونگار تھے۔ چھت اور دیواروں پر کھڑکیاں موجود تھیں جن پر لگے شیشوں سے اندر آنے والی روشنی دن میں مسجد کو روشن رکھتی تھی۔ مرکزی گنبد کی چھت سے لٹکتا ہوا بڑا سا فانوس جو زمین سے تقریباً دس فٹ اوپر موٹے تاروں کی مدد سے معلق تھا،اس میں لگے درجنوں بلبوں سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔اس کے علاوہ بے شمار چھوٹے چھوٹے فانوس بھی معلق تھے۔ ہر فانوس میں دو درجن سے زیادہ بلب تھے۔ زمین پر دبیز قالین بچھا تھا۔

آج پہلا روزہ تھا۔ ہم مسجد پہنچے ایک قاری صاحب رمضان کے حوالے سے آیات کی تلاوت کررہے تھے۔اس خوبصورت ماحول میں خوبصورت تلاوت کا اثر ویسے ہی بہت زیادہ تھا، مگر رمضان کی آمد کے احساس نے ایسی کیفیت پیدا کردی کہ جسے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ترکی کی ہر مسجد نے مجھے بہت مسحور کیا۔مگر یہاں آکر جو کیفیت ہوئی وہ ناقابل بیان تھی۔ایسی روحانیت، ایسا سکون، ایسا اطمینان۔ سچی بات ہے کہ دل چاہتا تھا کہ نہ لمحے ختم ہوں، نہ یہ وقت گزرے، نہ یہ شام کبھی غروب ہو، نہ کبھی ہم یہاں سے رخصت ہوں۔

مگر وقت ہمارا غلام نہیں ہے۔ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی مرضی کا تابع ہے۔ چنانچہ یہ وقت بھی گزر گیا۔ جماعت کھڑی ہوئی۔ ہم نے عصر کی نماز ادا کی۔اور قبلے کی سمت واقع کھڑکی

سے اس مسجد کے بنانے والے سلیمان عالیشان کے مزار کو دیکھا۔ وہ شہنشاہ جس کے قدموں میں دنیا کے تین براعظم تھے۔ جس کی ہیبت سے دنیا لرزتی تھی۔ جس کی عظمت کا اعتراف اپنے اور غیروں سب نے کیا۔ وقت اس کے لیے بھی نہیں رکا۔ نصف صدی تک دنیا کے تین براعظموں پر حکومت کرنے والا شہنشاہ جس نے نصف صدی تک پورے دبدبے سے حکومت کی۔ جس کے دبدبے کے آگے کھڑے ہونے کے الزام میں اس نے اپنے ہی دو سگے بیٹے قتل کر دیے، وقت نے اس کا ساتھ بھی نہیں دیا۔

میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ مسجد سے باہر نکل کر جاؤں۔ مگر سلیمان کا مزار اور اس سے متصل حورم سلطان کا مزار آواز دے رہا تھا کہ آؤ اور عبرت کی نگاہوں سے ہمیں دیکھو۔ اور دنیا کو یہ بتاؤ کہ ایک آدمی سے لے کر شہنشاہ اعظم اور ملکہ معظّمہ جیسے لوگ بھی خدا کی قدرت کے سامنے کتنے بے بس ہیں۔ ہم بوجھل قدموں سے مسجد سے باہر نکلے اور سلیمان اور حورم کے مزار کی طرف بڑھنے لگے۔

سلیمان عالیشان کی عظمت

سلطان سلیمان عثمانی سلطنت کا دسواں سلطان اور اپنے باپ سلیم کے بعد عالم اسلام کا دوسرا خلیفہ تھا۔ اس کے دور میں عثمانی خلافت اپنے اس عروج پر جا پہنچی تھی جو اس کے بعد کبھی ممکن نہ ہوسکا۔ ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے اسے عروج پانے کے سارے مواقع عطا کر دیے تھے۔ وہ 1520 میں اپنے باپ سلیم کی وفات کی بعد صرف 24 سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ دیگر ترک سلاطین کی بہ نسبت اسے اقتدار کے لیے اپنے بھائیوں سے کوئی رسہ کشی نہیں کرنا پڑی کہ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کا باپ خود ایک زبردست سلطان تھا جس نے عثمانی سلطنت کو آٹھ برسوں کے مختصر دور حکومت میں ایک عظیم عالمی قوت اور خلافت میں بدل دیا تھا۔

سلطان سلیم دور سے قبل سلطنت بس موجودہ ترکی اور بلقان تک محدود تھی، مگر اس نے مصر، شام، فلسطین اور موجودہ سعوی عرب کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ سلطنت کی توسیع کی اسی پالیسی کو سلیمان نے جاری رکھا۔ قدرت نے اس مقصد کے لیے اسے طویل وقت دیا اور وہ 46 برس یعنی تقریباً نصف صدی حکمران رہا۔ اس کے پاس بہترین فوج، قابل سپہ سالار اور وفادار اور باصلاحیت وزیر اور مشیر رہے۔ اس کے دور میں سلطنت کا رقبہ دوگنا ہوگیا اور صرف ایران کو چھوڑ کر پورے مشرق وسطیٰ، آسٹریا تک نصف یورپ، شمالی افریقہ اور سمندر کی سمت میں پورے بحیرہ روم پر اس کا اقتدار قائم ہوگیا۔ اس کی سلطنت کا رقبہ ڈیڑھ کروڑ مربع کلومیٹر تک جا پہنچا۔ دنیا کے مرکز میں موجود تین براعظموں پر مشتمل سلطنت کی حکمرانی، انسانی تاریخ کی وہ عظمت تھی جو سلطان سلیمان سے پہلے کسی کو حاصل ہوئی نہ بعد میں ہوسکی۔

سلیمان نے فتوحات ہی نہیں کیں بلکہ ایک بہترین نظام حکومت بھی متعارف کرایا۔ اس کی وجہ سے اسے سلیمان قانونی (قانون ساز) بھی کہا جاتا ہے۔ وہ ذاتی طور پر ایک جرنل ہونے کے ساتھ جس نے حکومت کے دس برس میدان جنگ میں گزارے، ایک شاعر اور نگینے تراشنے کے ہنر میں بھی یکتا تھا۔ وہ علم و ادب کا دلدادہ تھا اور اس کے دور میں کلچر، آرٹ اور علم و فن کو بھی بھرپور سرپرستی ملی۔ کچھ اور نہیں یہی سلیمانیہ مسجد جو کہ اس دور کے مشہور ماہر تعمیرات سنان کی بنائی ہوئی ہے، اس کے اعلیٰ ذوق کا تعارف کراتی ہے۔ غرض سلیمان جس کو سلیمان عالیشان کا خطاب دیا گیا، عثمانی خلافت یا مسلمانوں کی تاریخ ہی کا نہیں بلکہ انسانی تاریخ کا ایک انتہائی کامیاب اور طاقتور حکمران تھا جس نے معاشی، فوجی، سیاسی اور تہذیبی لحاظ سے عثمانی سلطنت کو اپنے بام عروج پر پہنچادیا۔

اداسی، موت اور غفلت

سلیمان کا مقبرہ مسجد سے متصل ایک احاطے میں بنا ہوا تھا۔ یہ ایک چھوٹا قبرستان تھا جس میں دیگر عمائدین سلطنت کے ساتھ اس کی بیوی حورم سلطان کا مقبرہ بھی تھا۔ دونوں مقبرے ہشت پہلو یا آٹھ کونوں والے تھے۔ سلیمان کے ساتھ اس کی چہیتی بیٹی ماہ نور سلطان بھی دفن تھی۔

عظمت کے اس تذکرے کے ساتھ جو اوپر بیان ہوا ہم اپنی آنکھوں کے سامنے اس قبرستان میں عبرت کا عجیب نمونہ دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے مسجد کے ماحول میں جس روحانیت نے ہمارا احاطہ کرلیا تھا ان قبروں کے سامنے وہ روحانیت گہری افسردگی میں ڈھل چکی تھی۔

قبر کا گڑھا ہر عظمت کا آخری انجام ہے۔ مگر نجانے انسان کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے انسانی عظمت کی رفعتوں کو تہہ خاک دفن ہوتا دیکھتا ہے، مگر خود ایسے جیتا ہے جیسے اسے نہیں مرنا۔ وہ بولتا ہے اور بولتا چلا جاتا ہے۔ وہ کماتا ہے اور کماتا چلا جاتا ہے۔ وہ ظلم کرتا ہے اور کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ دوسروں کی جان، مال، آبرو کو نقصان پہنچاتا اور دوسروں کا حق تلف کرتا اور کرتا چلا جاتا ہے۔

اور، اور بس اور کی ہوس انسان کو اندھا کیے رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ زندگی کی سواری اسے موت کی منزل پر لا ڈالتی ہے۔ اس وقت انسان جان لیتا ہے کہ دنیا کچھ بھی نہیں تھی۔ ہرگز کچھ بھی نہیں تھی۔ موت کے بعد انسان جب آخرت کی حقیقتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا تو پکار اٹھے گا کہ کاش مجھے دوبارہ دنیا کا ایک پل بھی مل جائے تو میں اس ابدی بادشاہی کو پالوں جس کے سامنے سلیمان عالیشان کی بادشاہی بھی کوئی چیز نہیں۔

مگر آج یہ انسان کسی صورت اِس دنیا کے پار اُس دنیا کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں۔ نجانے یہ انسان جو دنیا کی ہر چیز محسوس کرسکتا ہے، آخرت کی زندگی کو محسوس کرنے میں اس قدر عاجز کیوں

ہے۔ایسا لگتا ہے کہ انسان کا ڈی این اے مرنے کے لیے نہیں بنایا گیا۔اس میں یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ موت کی حقیقت کو دیکھ سکے۔

سلیمان اور حورم کے مقبروں کے سامنے کھڑے ہو کر ہم دونوں میاں بیوی اداسی اور افسردگی کے گہرے احساس میں ڈوب چکے تھے۔اس اداسی نے ترکی سے رخصت ہونے تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔

ہر عروج را زوال است

سلیمان کے ساتھ حورم کا تذکرہ بار بار ہو رہا ہے تو ضروری ہے کہ اس کا بھی کچھ تعارف کرایا جائے۔حورم سلطان کا، میرے نزدیک، بہترین تعارف یہ ہے کہ یہ بہترین ذوق لطیف کے حامل سلطان عالیشان کی وہ محبت تھی جس نے بالواسطہ طور پر عثمانی خلافت کو اس کے عین عالم عروج میں زوال کے راستے پر ڈال دیا۔

حورم کا تعلق یوکرین سے تھا۔اس کا اصلی نام ریکسلا نہ بیان کیا جاتا ہے۔یہ ایک کنیز کے طور پر محل میں لائی گئی اور سلیمان کی تخت نشینی کے بعد اس کے دل کو بھا گئی۔اُس دور میں دستور یہ تھا کہ دنیا بھر سے حسین اور باصلاحیت کنیزیں خرید کر محلات میں لائی جاتی تھیں۔ان میں سے چند ہی کو یہ اعزاز حاصل ہوتا تھا کہ وہ بادشاہ کی منظورِ نظر بن سکیں۔حورم سے پہلے دو کنیزیں گلفام اور ماہ دوراں اسی حیثیت میں موجود تھیں۔ان میں سے ماہ دوراں سلطان کے پہلے بیٹے مصطفیٰ کی ماں بھی بن چکی تھی۔مصطفیٰ اپنی خاندانی روایات کے عین مطابق انتہائی قابل اور بہادر شہزادہ اور جانشین سلطنت بھی تھا۔مگر آنے والے برسوں میں حورم نے اس کی موت کا انتظام کروا کے عثمانی سلطنت کو ایک بہترین حکمران سے محروم کر دیا۔حورم نے رفتہ رفتہ سلطان کو اپنا گرویدہ بنالیا اور تمام شاہی روایات کے خلاف سلطان نے نہ صرف حورم سے باقاعدہ شادی کر لی بلکہ اسے ایک

سے زیادہ بچے پیدا کرنے کی اجازت بھی دے دی۔

حورم کا سلطان پر اثر ورسوخ بڑھنا شروع ہوا۔اس نے اپنی اور سلطان کی محبوب بیٹی ماہ نور سلطان کو ایک درباری رستم پاشا سے جو عمر میں اس سے 22 برس بڑا تھا بیاہ دیا۔ یہ دراصل شاہی دربار میں اس کے اثر ورسوخ بڑھانے کا ایک راستہ تھا۔جس کے بعد اس نے سلیمان کے سب سے قریبی مشیر اور وزیراعظم ابراہیم پاشا کو نشانہ بنایا جو کہ شہزادہ مصطفیٰ کا زبردست حامی تھا۔اس نے بتدریج ابراہیم پاشا کے تعلقات بادشاہ سے خراب کروائے اور آخرکار ابراہیم اپنی کچھ غلطیوں کی وجہ سے بادشاہ کے ہاتھ قتل ہو گیا۔حورم نے رستم کو وزیراعظم بنوادیا۔جس کے بعد حورم اور رستم پاشا نے رفتہ رفتہ بادشاہ کو شہزادہ مصطفیٰ کے خلاف کردیا اور آخرکار بادشاہ نے شہزادہ مصطفیٰ کو بھی قتل کرادیا۔

اب حورم کا راستہ بالکل صاف تھا۔ایک طرف دربار میں اس کا اثر رسوخ بہت بڑھ گیا اور دوسری طرف اس کی اپنی اولاد کا تخت کا وارث بننا یقینی ہو گیا۔مگر وہ شہزادہ مصطفیٰ کے قتل کے چند سال بعد سلیمان کی زندگی ہی میں وفات پا گئی۔ مصطفیٰ کے بعد حورم اور سلیمان کے دو بیٹے بایزید اور سلیم رہ گئے تھے۔ان میں سے بایزید بھی قابل تھا۔مگر بادشاہ کا رجحان سلیم کی طرف تھا جو کہ بالکل عیاش مگر بادشاہ کے لیے ایک یس مین تھا۔ چنانچہ بایزید نے بھی بغاوت کی اور وہ بھی بادشاہ کے ہاتھوں مارا گیا۔سلطنت کے دو بہترین شہزادوں کے قتل کے بعد جب سلیمان کا انتقال ہوا تو عثمانی خلافت اپنی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک انتہائی نااہل شخص یعنی شہزادہ سلیم کے ہاتھ آئی۔کہا جاتا ہے اسے حسین کنیزوں کے ساتھ دادعیش دینے اور شراب پینے کے سوا کسی چیز میں دلچسپی نہ تھی۔اس کا عہد سلطنت عثمانیہ کے دور زوال کا آغاز تھا۔گرچہ یہ سلطنت اتنی عظیم تھی کہ اس زوال کو نمایاں ہوتے ہوئے صدی دو صدی کا عرصہ لگ گیا۔ہم تک جو تاریخی واقعات منتقل

ہوئے ہیں، اگر ان کی صحت درست ہے تو اس زوال میں حورم سلطان کا بنیادی ہاتھ تھا۔

عورتوں کی سلطنت

عثمانی خلافت کے آغاز سے لے کر سلیمان تک دس سلطان گزرے جو ایک سے بڑھ کر ایک قابل اور بہادر تھے۔ مگر حورم کے ساتھ ہی عثمانی سلطنت کا عجیب دور شروع ہوا۔ اس دور میں تقریباً ایک صدی سے زاید عرصے تک عملی طور پر بادشاہ کی حیثیت ایک عضو معطل کی سی ہوتی تھی اور اصل اقتدار حرم کی خواتین کے ہاتھ میں ہوتا جو کہ والدہ سلطان یا پھر ملکہ سلطان ہوا کرتی تھیں۔ جس طرح حورم نے رستم پاشا کے ذریعے سے دربار کے فیصلے اپنی مرضی کے مطابق کروانے کی روایت ڈالی، آنے والے دور میں یہ روایت نااہل بادشاہوں کی موجودگی میں پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی گئی۔ عثمانی تاریخ میں یہ دور عورتوں کی سلطنت کا دور کہلاتا ہے۔

تقریباً سوا صدی پر محیط حرم کی خواتین کے بالواسطہ اقتدار کا یہ دور دربار کی اندرونی کشمکش، وزیروں اور حرم کی خواتین کی کشمکش اور خود حرم کی خواتین کی باہمی کشمکش اور سازشوں سے اس طرح عبارت ہے کہ بے اختیار قرآن کی آیت ''اِنَّ کَیۡدَکُنَّ عَظِیۡمٌ '' یاد آجاتی ہے۔ بعض تاریخی روایات کے مطابق اُس دور میں حرم کی خواتین سازشوں کے ذریعے سے ایک دوسرے کے لیے کام کرنے والی کنیزوں کو خاموشی سے ختم کرادیتیں۔ ان کی لاشیں بوریوں میں ڈال کر ایک بھاری پتھر اس بوری سے باندھ دیا جاتا اور پھر اس بوری کو توپ کاپی محل سے نیچے باسفورس میں پھنکوادیا جاتا تھا۔ بھاری پتھر کی وجہ سے یہ بوریاں سمندر کی تہہ ہی میں بیٹھ جاتیں۔ مگر لاش پانی بھرنے کے بعد اوپر اٹھنا چاہتی۔ جس کے بعد ایسا لگتا کہ پانی کی تہہ میں آٹے کی بوری سیدھی کھڑی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس زمانے میں کچھ غوطہ خوروں نے سمندر کی تہہ میں یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سیکڑوں بوریاں پانی کی تہہ میں کھڑی ہوئی تھیں۔

سلطنت عثمانیہ کی یہ خوش نصیبی تھی کہ اُس دور میں مشرق میں تیمور لنگ جیسا کوئی اولوالعزم حکمران نہ تھا اور مغرب ابھی ایک علمی اور فکری انقلاب کے ابتدائی مرحلے میں تھا۔ چنانچہ سلطنت کو بظاہر اس عرصے میں کوئی نقصان نہ پہنچا۔ حالانکہ سلیمان کے وقت صورتحال یہ تھی کہ جب اس نے آسٹریا کا محاصرہ کیا تو اہل یورپ کے نزدیک یورپ پر عثمانیوں کا قبضہ اسی طرح ناگزیر ہو چکا تھا جس طرح قسطنطنیہ کے دو تین ناکام محاصروں کے بعد عثمانیوں نے آخر کار اسے فتح کر ہی لیا تھا۔ مصطفیٰ زندہ رہتا تو پورے یورپ پر عثمانی اقتدار قائم کر دیتا۔

میں کبھی تصور کی آنکھ سے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ سلیمان کے بعد مصطفیٰ تخت نشین ہوتا اور سوا صدی کی یہ خواتین کی سلطنت قائم نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ تخیل کی آنکھ یہ منظر دکھاتی ہے کہ اسپین سے مسلمانوں کے خاتمے کے بجائے جرمنی، برطانیہ اور فرانس میں مسلمان داخل ہوتے اور یورپ کا فکری انقلاب مسلمانوں کے زیر اثر رونما ہوتا۔ تاہم تاریخ میں اگر مگر اور کاش نہیں ہوتا۔ میں نے انسانی تاریخ سے ایک ہی بات سیکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو انفرادی طور پر اچھے برے اعمال کی آزادی دی ہے۔ مگر اجتماعی طور پر تاریخ جلد یا بدیر وہ راستہ اختیار کرتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے مقدر کر دیا ہے۔

یورپ کا عروج مقدر تھا۔ یہ واقعہ دنیا کے اختتام کا آغاز تھا۔ اس کے بعد صنعتی انقلاب اور پھر انفارمیشن ایج کا آنا مقدر تھا۔ اور اب سارے قرآئن یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کی دعوت کا دنیا میں پہنچنا مقدر ہے۔ دنیا کے خاتمے سے قبل اسلام کی دعوت کا دنیا بھر میں پہنچنا ایک لازمی عمل ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اب اس واقعے کو ہونے سے نہیں روک سکتی۔

جو قارئین تاریخ سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے، ان سے معذرت۔ مگر یہ ممکن نہ تھا کہ سلیمانیہ مسجد جایا جائے اور سلیمان عالی شان اور حورم سلطان کا ذکر نہ کیا جائے۔ مگر ان دونوں کے

مقبروں نے دل پر عجیب اداسی طاری کر دی تھی۔

شہر کا اداس نظارہ

شام ڈھل رہی تھی۔ سلیمانیہ مسجد کی پر شکوہ عمارت کے گہرے سائے سلیمان اور حورم کے مقبروں پر چھا رہے تھے۔ ہم نے چاہا کہ مسجد کے دیگر حصوں کو بھی دیکھا جائے۔ مسجد کے احاطے میں دور دور تک پھیلا سبز گھاس کا قالین آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ ہم اس سے گزر کر ہر طرف گئے۔ یہ مسجد صرف ایک مسجد نہ تھی بلکہ ایک پورا تعمیراتی کمپلیکس تھا جس میں مختلف نوعیت کی عمارات تھیں، مگر سب سے اچھا اور خوبصورت منظر وہ تھا کہ جہاں استنبول کی اس تیسری پہاڑی سے باسفورس اور گولڈن ہارن کا پانی اور اس کے پار کا علاقہ نظر آ رہا تھا۔ یہ ایک بالکل منفرد منظر تھا جہاں سے بیک وقت ایشیا اور یورپ نظر کے سامنے تھے۔ دائیں سمت باسفورس کے پیچھے ایشیائی حصہ تھا جس میں اسکودر اور پہاڑی پر کملیکا ہلز پر نصب ٹاور دور ہی سے نظر آ رہے تھے۔ جبکہ عین ہمارے سامنے گولڈن ہارن کے پار پھیلا ہوا یورپی علاقہ اور گلاطہ ٹاور اور ٹیکسم وغیرہ نظر آ رہے تھے۔

میں نے احاطے کی اس دیوار کے ساتھ کھڑے ہو کے اپنے بیوی بچے کو سلیمان اور حورم کی کہانی سنائی۔ شہزادوں کے قتل کا سن کر میری بیوی کا دل بھی اداس ہو گیا۔ اس اداس دل کے ساتھ ہم اس خوبصورت منظر کو زیادہ انجوائے نہیں کر سکے۔ ہمارے لیے یہ شہر کا ایک اداس نظارہ تھا۔ آخر کار بھاری دل کے ساتھ ہم وہاں سے واپس ہو گئے۔

ٹیکسم پر افطاری

واپسی پر ٹیکسم پر ایک عجیب منظر دیکھا۔ ہزاروں افراد کرسیوں پر بیٹھے ہوئے روزہ کھلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ جبکہ ایک بلند اسٹیج پر کچھ گلوکار ساز اور موسیقی کے ساتھ بڑی دلکش آواز میں

حمد ونعت پڑھ رہے ہیں۔روزہ کھولنے والوں میں مقامی ہی نہیں بلکہ بہت سے مغربی سیاح بھی تھے۔جبکہ بیشتر ہمارے جیسے مسلمان سیاح تھے۔ان میں سے بیشتر کا روزہ نہیں تھا۔

ایسے میں روزہ داروں کو روزہ کھلوانے کے لیے یہ کوئی مناسب جگہ نہ تھی۔مگر اس پہلو سے یہ بہت اچھا طریقہ تھا کہ غیر مسلموں کے سامنے اسلامی شعائر کا تعارف سامنے آجاتا۔دعوت کا ایک طریقہ تو یہ ہوتا ہے کہ آپ اسلام کی تفصیل بیان کریں۔دوسرا یہ ہے کہ ہم اسلامی شعائر کا ایک نمونہ ان کے سامنے رکھ دیں۔ان میں سب سے بڑی چیز نماز اور اذان ہے۔ترکی کی اذانیں واقعی اس معاملے میں بڑی کمال کی تھیں۔ہمارے ہاں تو یہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ جس درجہ کریہہ الصوت موذن ڈھونڈا جاسکے اس کو ڈھونڈ کر لایا جائے اور اس سے اذان دلوائی جائے۔اس میں بے چارے موذن کا کیا قصور ہے۔جس طرح کی تنخواہ ان کو ملتی ہے، اس میں اسی سطح کے لوگ آئیں گے۔یہی معاملہ مساجد کے ائمہ کی قرأت کا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نماز، اذان اور نماز میں کی جانے والی قرأت اسلام کا ایک انتہائی خوبصورت تعارف ہے۔عام مسلمانوں کو مسجد سے قریب لانے کا بھی یہ ایک بہترین نسخہ ہے۔دوسری طرف غیر مسلموں کے لیے مسلمانوں کی نماز بڑی کشش کا باعث ہوتی ہے۔ہم مسلمانوں کے لیے تو یہ معمول کا نظارہ ہے ورنہ رکوع اور سجدہ اور قیام کو جب دور سے کھڑے ہو کر دیکھا جاتا ہے تو یہ ایک انتہائی پرکشش عمل ہوتا ہے۔یہی معاملہ حج کا ہے۔اگر کوئی مسلمانوں کو حج کرتا ہوا دیکھ لے تو ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اس منظر سے متاثر نہ ہو۔

روزے کی افطاری بھی اسی طرح کا ایک ذریعہ ہے۔یہ اسلام کا خاموش تعارف ہے جو خود اللہ تعالیٰ نے اسلامی عبادات میں رکھ دیا ہے۔یہ اپنی ذات میں ایک کمال کی چیز ہے۔مگر ہم مسلمان اپنے دین اور عبادات کی اسپرٹ سے واقف ہیں نہ ان کی ظاہری فارم کی قوت کو سمجھتے

ہیں۔ نہ ہم میں دعوتی مزاج ہے نہ ہمیں اپنے دین کو دوسروں تک پہنچانے سے بہت زیادہ دلچسپی ہے۔ ورنہ یہی چیزیں نجانے کتنے لوگوں کے دلوں میں اسلام کی محبت پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں

ہم نے جب اس ٹور کا پلان بنایا تھا تو اس میں یہ قطعی طے تھا کہ رمضان سے پہلے ہم واپس لوٹ چکے ہوں گے۔ مگر ویزہ بہت دیر سے ملا۔ ویزہ ملا تو ایک خیال یہ آیا کہ رمضان کے بعد سفر کرلیا جائے۔ مگر باوجوہ یہ خیال رد کردیا۔ بعد میں ترکی میں جو حالات پیدا ہوئے اور مجھے آسٹریلیا کا جو سفر درپیش ہوا، ان سارے حالات کی بنا پر محسوس یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے درست فیصلہ کروادیا۔ ورنہ بعد میں شاید یہ سفر اس طرح ممکن ہی نہیں رہتا۔ آغاز سفر میں تاخیر کی بنا پر واپسی بھی کچھ دیر سے ہوئی اور دو ابتدائی روزے ہمیں استنبول میں گزارنے پڑ رہے تھے۔

مگر پہلا روزہ بلکہ چاندرات ہوتے ہی مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوچکی تھی۔ گرچہ اس سفر میں ہم دوپہر کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ عملی طور پر تو ہم روزہ ہی رکھ رہے تھے۔ مگر میں اپنے مزاج کے لحاظ سے دین کی رعایت سے فائدہ اٹھانے کا قائل ہوں۔ اس سے انسان میں ایک طرف اپنے عجز کا احساس زندہ رہتا ہے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی بے پناہ محبت کا احساس ہوتا ہے کہ وہ ہماری کس طرح رعایت کرتا ہے۔ وہ قدیر مطلق ہے جو چاہے حکم دے اور ہر فرمان کی شکل میں اسی طرح پکڑ لے جیسے زمانہ قدیم کے بادشاہوں کے ایک حکم پر بڑے بڑے لوگوں کے سر قلم ہوجاتے تھے۔ مگر وہ طاقت کی اس انتہا کے باوجود نہ سختی کرتا ہے، نہ پکڑنے میں جلدی کرتا ہے۔ بلکہ جو مطالبات رکھے گئے ہیں، ان میں بھی انسانی عجز کی رعایت کرتا ہے۔

سو رمضان شروع ہونے کے باوجود میں نے روزہ نہیں رکھا اور اس رعایت کا فائدہ اٹھانے

کا فیصلہ کیا کہ یہ روزے رمضان کے بعد پورے کر لیے جائیں۔ مگر رمضان شروع ہونے کا احساس، روزے کے دن بغیر روزہ رکھے گزرنے کا احساس اور بغیر روزے کے لوگوں کو روزہ افطار کرتے دیکھنے کے احساس نے طبیعت پر ایک عجیب طرح کی کیفیت طاری کر دی۔ یہ کیفیت اپنے عاجز اور گنہ گار ہونے کے احساس کی تھی۔ یہ کیفیت محرومی اور پیچھے رہ جانے کے احساس کی تھی۔ یہ کیفیت ابر کرم کی برسات میں اپنا حصہ نہ پانے کی کیفیت تھی۔

اس دنیا میں محرومی کا یہ احساس بڑی نعمت ہے۔ اس لیے کہ یہی احساس انسان کو زندہ رکھتا ہے۔ یہی احساس انسان میں اپنی کمی کی تلافی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ یہی احساس آنسوؤں اور دعاؤں سے پروردگار سے جڑنے پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ احساس نہ ہو تو انسان اپنی نگاہوں میں بہت نیک ہو جاتا ہے۔ مگر پھر خدا کی نگاہوں سے گرنے کا بڑا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔

رمضان کے ان دو دنوں میں شعیب بن عزیز کے یہ اشعار بہت یاد آتے رہے گرچہ ان اشعار کا رمضان سے کوئی تعلق نہیں۔

اب اداس پھرتے ہو سردیوں کی شاموں میں
اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں
اب تو اس کی آنکھوں کے میکدے میسر ہیں
پھر سکون ڈھونڈو گے ساغروں میں جاموں میں
دوستی کا دعویٰ کیا عاشقی سے کیا مطلب
میں ترے فقیروں میں ، میں ترے غلاموں میں
جس طرح شعیب اس کا نام چن لیا تم نے
اس نے بھی ہے چن رکھا ایک نام ناموں میں

ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں

آخری دن اہلیہ نے باقی ماندہ شاپنگ پوری کی۔ سامان پیک کیا اور جانے کے لیے ہم تیار ہو گئے۔ اس وقت تک سہ پہر ہو چکی تھی۔ پروگرام یہ تھا کہ ایک دفعہ پھر پرنسز آئی لینڈ کا چکر لگایا جائے۔ ہمیں وہاں رکنا نہیں تھا صرف آنا اور جانا تھا۔ پیش نظر یہ تھا کہ سمندر میں سورج ڈوبنے کا منظر دیکھیں گے۔ وہاں سورج ساڑھے آٹھ پر ڈوبتا تھا۔ امید یہ بھی تھی کہ شام کے وقت پرنسز آئی لینڈ کی خوبصورتی کچھ نکھر بھی جائے گی اور پچھلی دفعہ کی کسر بھی نکل جائے گی جب عین دوپہر اور سخت دھوپ میں یہاں آئے تھے۔

تاہم جب تک ہم فیری کے اڈے پر پہنچے چھ بجے والی فیری نکل چکی تھی۔ اگلی کے لیے ایک گھنٹے مزید انتظار کرنا پڑتا۔ جس کے بعد یہ ممکن نہ تھا کہ پرنسز آئی لینڈ پہنچ کر کچھ وقت وہاں گزارا جائے اور پھر غروب آفتاب کے وقت آیا جائے۔

نیکی کا سفر

خیر ان تمام وجوہات کی بنا پر یہ فیصلہ ہوا کہ پرنسز آئی لینڈ جانے کے لیے بہت دیر ہو چکی ہے۔ اس کے بجائے کملیکا ہلز دوبارہ چلتے ہیں۔ وہاں اسریٰ کے ساتھ ہم گئے تھے، مگر سارا دن سفر کی تکان اور رات کے اندھیرے کی بنا پر اسے ٹھیک سے نہیں دیکھ سکے تھے۔ چنانچہ ہم اسی سمت روانہ ہوئے۔ یہ ہمارا میٹرو کارڈ سے آخری سفر تھا۔ ہم نے راستے میں میٹرو اسٹیشن سے میٹرو کارڈ میں کافی پیسے ڈلوا دیے تھے۔ اس لیے اس کارڈ میں کافی پیسے بچ گئے تھے۔ روانگی کے وقت میں نے یہ کارڈ اسریٰ کو یہ کہہ کر دے دیا کہ بس میں سفر کرنے والی اپنی کسی سہیلی کو دے دینا۔ کیونکہ اس کے پاس گاڑی تھی اور اس کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔

یہ گویا اس خاتون کی نیکی کا سفر تھا جس نے ابتداء میں ہمارے ساتھ نیکی کی تھی اور ہمارے

کارڈ میں اضافی رقم ڈلوائی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت نے یہ چاہا کہ کسی ترکی کو یہ کارڈ کہیں زیادہ رقم کے ساتھ واپس لوٹا دیا جائے۔ اس رب کا شکر ہے کہ جس نے یہ کرم کیا۔ رہی وہ خاتون تو اس کا اجر اس کے رب کے ہاں محفوظ ہے۔ کسی کی نیکی آخرت میں ضائع ہو اس کا تو کوئی سوال ہی نہیں، مگر دنیا میں بھی نیکی کے بطن سے ہمیشہ خیر پھوٹتا ہے۔ ہاں اکثر ہم اس خیر سے واقف نہیں ہو پاتے۔ یہ بات قیامت کے دن ہی کھلے گی کہ ہماری نیکی نے آگے بھی بہت سفر طے کیا تھا۔

دوبارہ کملیکا ہلز

کملیکا ہلز پہلی دفعہ تو اسریٰ لے گئی تھی۔ اس لیے راستوں پر غور ہی نہیں کیا۔ اب خود جانا تھا۔ پہلے فیری میں بیٹھ کر اسکودر کے یورپ سے ایشیا پہنچے۔ پھر وہاں سے لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک وین کملیکا ہلز تک جائے گی۔ وین میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو اس نے پہاڑی راستے پر سفر شروع کیا۔ ایک ایک کر کے مسافر اترتے گئے۔ منزل نہ اب آتی نہ تب آتی۔ سارے مقامی لوگ تھے۔ ان سے کیا پوچھتے اور کس زبان میں پوچھتے۔ وین پورے علاقے کا چکر لگاتی ہوئی تقریباً پون گھنٹے میں خالی ہو چکی تھی۔ جب ایک دو مسافر رہ گئے تو میں نے ڈرائیور کے پاس جا کر بتایا کہ کملیکا ہلز جانا ہے۔ اس نے جواب میں جو کچھ کہا وہ میں نہ سمجھ سکا۔ تاہم یہ سکون ہو گیا تھا کہ میری منزل ان کے سمجھ میں آ گئی ہے۔ کیونکہ اس نے مجھے اطمینان سے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔۔ واپس ہوتے وقت یہ اندازہ ہوا کہ ڈرائیور نے ہمیں یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ وین وہاں تک نہیں جاتی بلکہ کسی قریبی اسٹاپ سے وہاں تک پیدل کا راستہ تھا۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ ہم کچھ نہیں سمجھ رہے تو اس نے ہمیں بالکل قریب لے جا کر اتارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

بہرحال آخری مسافر کے اترنے کے بعد صرف ہم لوگ وین میں رہ گئے۔ ڈرائیور نے وین بھگائی اور ایک ویران جگہ پر جا کر کہا کہ اتر جاؤ۔ میں نے واپسی کا پوچھا تو اس کی بات کا مفہوم

میں یہ سمجھا کہ یہیں آجانا۔ خیر اترے تو وہاں آدم نہ آدم زاد۔ ذرا بلندی کی طرف چلے تو وہی جگہ آ گئی جہاں اسریٰ نے اپنی گاڑی پارک کی تھی۔ جان میں جان آئی کہ صحیح جگہ آئے ہیں۔ چلتے ہوئے ہم اصل جگہ پر پہنچ گئے۔ یہاں ہم تھے اور ہماری تنہائی۔ کوئی ایک شخص بھی یہاں نظر نہیں آرہا تھا۔ دکانیں بھی بند تھیں۔ نہ مقامی لوگ تھے نہ ٹورسٹ۔

لیکن اس میں کوئی شک نہیں رات کے مقابلے میں شام کی اس روشنی میں اس جگہ کا حسن پوری طرح نکل کر سامنے آیا تھا۔ یہ ایک پہاڑی پر واقع ایک بہت بڑی ہموار جگہ تھی جس پر پارک بنا ہوا تھا۔ ہر طرف گھاس کے خوبصورت قطعات، ان میں جگہ جگہ لگے ہوئے پھولوں کی خوش رنگ کیاریاں، سیکڑوں درخت اور ہر طرف سے استنبول کا ایک بالکل مختلف نظارہ۔

باسفورس کی سمت یورپی حصہ صاف نظر آرہا تھا۔ یہاں بنا ہوا باسفورس برج، گلاطہ ٹاور، توپ کاپی سب نظر آرہے تھے۔ اس کے مخالف سمت میں ہم گئے تو وہاں سے استنبول کا ایشیائی حصہ دور دور تک پھیلا ہوا نظر آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوا کہ استنبول کتنا بڑا شہر ہے۔ اسی سمت میں صبیحہ ایرپورٹ واقع تھا۔ جبکہ دائیں سمت بحیرہ مرمرہ میں واقع پرنسز آئی لینڈ بھی یہاں کھڑے ہو کر دیکھے جاسکتے تھے۔

فضا شفاف اور نتھری ہوئی تھی۔ موسم بہت سرد تھا اور شدید ٹھنڈ تھی۔ تیز ہوا چل رہی تھی۔ مگر منظر کی خوبصورتی ٹھنڈ کے احساس پر غالب تھی۔ بلاشبہ استنبول پر طائرانہ نظر ڈالنے کے لیے اس سے زیادہ بہتر جگہ کوئی اور نہیں تھی۔ یہاں آ کر احساس ہوا کہ اچھا ہوا ہم پرنسز آئی لینڈ جانے کے بجائے یہاں آ گئے۔ اسی دوران میں دو چار لوگ نظر آنا شروع ہو گئے۔ یہ شاید ابھی پہنچے ہوں گے۔ تاہم میرے دل میں یہ اندیشہ تھا کہ واپسی کا کیا ہوگا۔ چنانچہ کچھ دیر بعد ہم نے واپسی کا قصد کیا۔

حسب توقع جس جگہ ڈرائیور نے اتارا تھا وہاں کسی بس کے کوئی آثار نہ تھے۔ بلکہ کسی قسم کی گاڑی کے بھی کوئی آثار نہ تھے۔ایک دکاندار کو بڑے مشکل سے مافی الضمیر سمجھایا تو اس نے ایک سمت اشارہ کردیا۔اللہ کے بھروسے پر چل پڑے۔ یہ ایک خوبصورت اور پہاڑی قصبہ تھا،مگر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ سارا شہر گھروں میں پڑا سورہا ہے۔آدم نہ آدم زاد۔ بس خوبصورت رنگوں کے گھر ہر جگہ نظر آرہے تھے یا خالی سڑکیں یا ان کے کنارے پارک ہوئی نئے ماڈل کی گاڑیاں۔ دس پندرہ منٹ چلنے کے بعد بازار اور مین روڈ کے آثار نمایاں ہوئے،مگر بس معدوم تھی۔دو چار لوگوں سے پوچھا۔آخر کار ایک جگہ بس اسٹاپ نظر آ گیا۔تھوڑی دیر بعد بس آ گئی اور ہم اللہ کا شکر کر کے اس میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔بس خالی تھی اس لیے جلد ساحل پر پہنچ گئی۔ایک دفعہ پھر ہم فیری پر سوار ہوئے۔ سچی بات یہ ہے کہ فیری کا سفر بہت خوبصورت تجربہ تھا۔خاص کر اس نتھری ہوئی ہوا اور دلکش فضا میں جب ٹھنڈی یخ ہوا بدن کی گرمی کو ساتھ لے جارہی ہو، دن کی چادر زمین کے سینے سے ڈھلک رہی ہو، شام کی مدھم روشنی ہر چیز کو خوبصورت بنا چکی ہو، ایسے میں استنبول کا نیلا آسمان اور اس سے کہیں زیادہ حسین نیلا سمندر آپ کو اس طرح اپنے سحر میں جکڑتا ہے کہ سیاح بے اختیار کہہ اٹھتا ہے:

اگر فردوس بر روئے زمین
ہمیں است و ہمیں و ہمیں است

پرودگار کی مہربانی اور عنایت تھی کہ استنبول کی آخری شام بھی بہت خوبصورت اور یادگار رہی۔

وہ آخری دن جو آخری نہ ہوسکا

اگلے دن ہماری روانگی تھی۔سامان تو پہلے ہی پیک تھا۔کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والے

گولڈن ہارن کے پانی کو الوادع کہا اور نیچے اتر گئے۔ ہم نے بہت منع کیا لیکن اسریٰ نے کہا تھا کہ وہی ہمیں چھوڑے گی۔ اس دفعہ اس کی ایک نئ دوست سرجان ساتھ آئی ہوئی تھی۔ گاڑی بھی اسی کی تھی جس میں سامان رکھنے کی مناسب جگہ بھی تھی۔ ائیر پورٹ سے قبل اسریٰ ہمیں اسی فلورا شاپنگ مال پر لے گئی جہاں چند روز قبل اُس کے اوراوزگی کے ساتھ گئے تھے۔ پہلے وہاں کے پارک میں گئے۔ شاپنگ سنٹر سے متصل اور ساحل کے ساتھ ساتھ بنا ہوا یہ پارک بہت خوبصورت تھا۔ ہر جگہ گھاس کے وسیع قطعات، ان میں لگے رنگ برنگے پھول پودے اور ہرے بھرے درخت تھے۔ بڑی حد تک کملیکا ہلز کے پارک جیسا منظر تھا، مگر یہاں برابر میں سمندر بھی تھا۔ پھر اسریٰ ساحل پر قدرے بلندی پر واقع ایک ریسٹورنٹ لے گئی۔ یہاں بلندی سے سمندر کا ایک بہت حسین و دلکش نظارہ ہمارے سامنے تھا۔ دھوپ سے بچنے کے لیے میں نے اپنے سر پر لگی چھتری کھول لی تھی۔ جس کے بعد یہاں بیٹھ کر یہ منظر دیکھنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ یہ تینوں خواتین نیچے سمندر کے قریب چلی گئیں اور میں مرمرہ کے اس حسین رنگ بدلتے سمندر کو دیکھتا رہا جو کبھی سیاہ پانی کی چادر پہن لیتا اور کبھی اسے اتار کر دوبارہ نیلا ہو جاتا۔ سمندر میں دور دور تک بحری جہاز آجا رہے تھے اور اوپر آسمان پر مسلسل ہوائی جہاز اتر رہے تھے۔

زندگی کتنی عجیب ہے۔ میں اپنے زندگی کے سب سے خوبصورت ٹور کے اختتامی مرحلے پر تھا جس کا اختتام بھی اللہ تعالیٰ نے اتنے اچھے انداز میں کرایا کہ شاید اس سے زیادہ اچھا اختتام ممکن نہ تھا۔ مجھے تنہائی کے ان لمحات میں اندازہ ہوا کہ خدا کی مہمانی کیا ہوتی ہے۔ اس کی مہربانی کیا ہوتی ہے۔ اس کی نظر کرم کسی فقیر پر بھی ہو جائے تو وہ بھی بادشاہی کے مزے لے لیتا ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ ہر انسان خدا کا فقیر ہے۔ اس کا بھکاری ہے۔ مگر احمق انسان یہ بات ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہ تو خدا کو بھی ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ جو مانتے ہیں ان کے لیے خدا ایک قومی

دیوتا ہے جس کا کام دوسروں کو جہنم اور ان کو جنت میں بھیجنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اور وہ اپنے حصے کا کام یعنی دنیا کو خدا سے متعارف کرانے کو بھی تیار نہیں۔ نہ ایمان واخلاق کو وہ اپنی زندگی بنانے کو تیار ہیں۔ قرآن مجید کے ایک طالب علم کو سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے لوگوں کے لیے جنت کے دروازے کیسے کھولے جائیں گے؟

میں ان آخری لمحات میں مخلوق کے عکس میں خالق کے رخِ روشن کو دیکھ رہا تھا۔ مخلوق کی مہربانی کے عکس میں رب کریم کی عنایات کو گن رہا تھا۔ کاش یہ عنایات جس طرح اس دنیا میں بلا استحقاق ہوئی ہیں وہ آخرت میں بھی بلا استحقاق ہو جائیں۔

زحمت جو عنایت بنادی گئی

فلائٹ کا وقت ہونے لگا تو ہم ائیر پورٹ روانہ ہوئے۔ اسریٰ اور سرجان ہمارے ساتھ اندر ہی آ گئیں۔ ترکی میں مسافروں کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی اندر آنے کی اجازت تھی۔ کاؤنٹر پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ جس فلائٹ سے ہم کو جانا تھا وہ کینسل ہو چکی ہے۔ یہ سن کر پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔ یہی سوچا کہ ائیر پورٹ کے قریب کوئی ہوٹل ڈھونڈ کر ایک دن مزید رکا جائے۔ اسریٰ اپنے موبائل سے قریب کے ہوٹل ڈھونڈنے لگی۔ میں نے اپنے موبائل سے اس کے آئی فون کو کنکٹ کر کے وائی فائی تک رسائی حاصل کی اور اپنے ٹریول ایجنٹ کو فون کیا۔ ان کا نام اویس تھا۔ وہ میرے بچے کے کلاس فیلو کے والد اور پڑوسی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ فضائی قوانین کے تحت ائیر لائن آپ کو ہوٹل دینے کی پابند ہے۔ ان کی اس بات سے کچھ ڈھارس بندھی۔ اللہ کی مشیت سے یہ نوجوان جس کی عمر صرف 28 برس تھی دو ماہ بعد اچانک انتقال کر گیا۔ اللہ اس کی بخشش فرمائے۔ ایسی جوان موت باقی لوگوں کے لیے نصیحت ہوتی ہے کہ غافل نہ رہیں بلکہ ہر وقت موت کی تیاری رکھیں۔

خیر ہم نے کاؤنٹر پر معلوم کیا تو انھوں نے ایک اور جگہ بھیج دیا۔ یہاں کچھ انتظار کے بعد ہمیں ہوٹل کی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ روانگی سے قبل ہم اسریٰ سے بڑی گرمجوشی سے مل کر رخصت ہوئے۔اس بے چاری نے اس سفر میں ہمارا بہت ساتھ دیا۔میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کو بہت دعا دی۔

ہوٹل پہنچے جو ائیر پورٹ سے زیادہ دور نہ تھا۔ یہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل تھا۔ یوں اللہ تعالیٰ کی عنایت یہ ہوئی کہ جاتے جاتے ہمیں ایک لگژری ہوٹل کی مہمانی بھی مل گئی۔تین وقت فری کھانا، بہترین کمرہ،ساتھ میں بہت سی دیگر سہولیات بھی میسر تھیں۔ان میں یہ سہولت بھی شامل تھی کہ ان کی گاڑی خود استنبول کے ایک بہت بڑے شاپنگ سنٹر مال آف استنبول لاتی لے جاتی تھی۔

جس کمرے میں ہم مقیم تھے اس کی دیوار میں کھڑکی نہیں تھی بلکہ ایک دیوار کا چار فٹ سے بلند تمام حصہ شیشے کا تھا جس سے باہر کا بہت خوبصورت منظر ہمہ وقت نگاہوں کے سامنے رہتا تھا۔ رات میں اس کھڑکی سے سڑکوں پر دوڑتی گاڑیوں کی روشنیوں کو دیکھنا بجائے خود ایک زبردست چیز تھی۔مجھ پر جو اداسی دو دن سے طاری تھی وہ آج اتر چکی تھی۔میری کیفیت وہی تھی جو رمضان میں ہونی چاہیے تھی۔ یہ رات ویسی ہی رات تھی جیسی رمضان کی دلکش راتیں ہوتی ہیں۔

اگلی صبح اہلیہ کی فرمائش پر مال آف استنبول کا وزٹ کیا۔مگر اس میں کیا کشش تھی؟ سوائے ایک عالیشان شاپنگ سنٹر،شاندار دکانوں، ہر طرح کی اشیائے تعیّشات اشیائے ضرورت اور دیدہ زیب سجاوٹ کے۔بس ایک کام تھا جو کرلیا۔ایک جگہ تھی جسے جا کر دیکھ لیا۔

استنبول کا آخری نظارہ

ایک دن کی اس فری وی آئی پی مہمانی کے مزے لینے کے بعد ہم ائیر پورٹ پہنچے۔ الحمداللہ فلائٹ آن ٹائم تھی۔مگر ہمیں سیٹیں الگ الگ ملیں کہ جہاز بالکل بھرا ہوا تھا۔ہم نے کیبن

کریو سے جہاز میں جاتے ہی درخواست کی تو اس نے ہمیں خود ایک جگہ لے جاکر ایک ساتھ بٹھا دیا۔ باقی آنے والوں کو وہ خود سیٹ کرتا رہا۔

جہاز اڑا تو استنبول کا خوبصورت شہر ایک دفعہ پھر ایک حسین نظارہ پیش کرتے ہوئے سامنے آ گیا۔ استنبول میں مکانوں کی چھتیں سرخ ہوتی ہیں۔ آسمان سے نیچے زمین پر ہر طرف سرخ چھتوں کا منظر سامنے تھا۔ کچھ دیر بعد جہاز اسکودر کے اوپر پہنچا۔ میں نے کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھا تو وہ سارا منظر نگاہ کے سامنے آ گیا جس کو میں اس سفرنامے میں جگہ جگہ بیان کرتا رہا ہوں۔ آبنائے باسفورس کا پانی ایشیا اور یورپ کو جدا کرتا ہوا ایک طرف بحیرہ مرمرہ سے مل رہا تھا اور دوسری طرف گولڈن ہارن کی سمت مڑ رہا تھا۔ گلاطہ ٹاور اور ٹیکسم نظر تو نہیں آ رہے تھے، مگر وہ جس جگہ تھے وہ علاقہ بھی نظر کے سامنے تھا۔ گولڈ ہارن کے دوسرے کنارے پر ایوبیہ سے لے کر سلطان احمد کا سارا علاقہ بھی نظر کے سامنے آ گیا۔ یہاں سے بالکل صاف نظر آیا کہ استنبول کی پہلی پہاڑی جس پر آیا صوفیہ اور توپ کاپی واقع ہیں، سمندر میں خشکی کے ایک مستطیل ٹکڑے کی شکل میں اصل زمین سے آگے نکلی ہوئی ہے۔ اس سے آگے بحیرہ مرمرہ پھیلا ہوا تھا۔ ہم ذرا آگے بڑھے تو پرنسز آئی لینڈ بھی نظر آ گئے۔ میں نے آج تک کسی فضائی سفر میں زمین کا نقشہ اتنے واضح انداز میں نہیں دیکھا۔ میں نے اس منظر کو اپنے کیمرے میں بھی محفوظ کر لیا۔

میں جس دن سفر کے لیے روانہ ہوا تھا اس سے ایک دن پہلے تک اتنا تھک چکا تھا کہ ایک صفحے کا مضمون لکھنا بھی مشکل ہو چکا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس سفر سے میری توانائیاں بحال کر دی تھیں۔ ابن آدم ذریت شیطان سے جنگ کے لیے ایک دفعہ پھر تیار تھا۔

اللہ اکبر اللہ اکبر لاالہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد

آسٹریلیا کا سفر

کھڑکی کھلے گی

میں نے جہاز کی کھڑکی کا شٹر (Shutter) اوپر کیا اور چالیس ہزار فٹ نیچے نظر ڈالی۔ نیچے کے منظر نے میرے اندر ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی۔ یہ بظاہر کوئی خاص منظر نہ تھا۔ سمندر ختم ہو رہا تھا اور زمین شروع ہو رہی تھی۔ یہ زمین براعظم آسٹریلیا کی تھی جو اس وقت دنیا کے غریب اور ترقی پذیر ممالک کے لوگوں کے لیے مواقع کی سرزمین بنی ہوئی ہے۔ مگر میرے لیے اس منظر کو خاص بنا دینے والی چیز یہ نہ تھی بلکہ خدا کی عظمت کا یہ احساس تھا کہ میرے رب نے زمین کو کس طرح پھیلا رکھا ہے۔ ایشیا، امریکہ اور یورپ کے بعد یہ ایک نیا براعظم تھا جہاں میں جا رہا تھا۔ میں زندگی میں پہلی دفعہ دھرتی کے جنوبی حصے میں داخل ہو رہا تھا۔ اللہ رب العالمین کی دھرتی کے ایک بالکل مختلف حصے میں جہاں زمین کے شمالی کے برعکس چاند بھی الٹا ہو کر نکلتا ہے اور موسم بھی الٹ کر آتے ہیں۔ اس نئی جگہ پر ایک عاجز مطلق کو قادر مطلق کے حضور سر جھکانے اور اس کی کبریائی کے اظہار کا موقع مل رہا تھا۔

میں نے برابر والی نشست پر نظر ڈالی۔ میرے برابر میں بیٹھی ہوئی سارہ بہت اطمینان کے ساتھ سو رہی تھی۔ اس کے ابا بھی سو رہے تھے۔ اس کی اماں اور باقی بہنیں پچھلی نشست پر تھیں۔ یہ ایک یہودی خاندان تھا جو انگلینڈ سے آسٹریلیا جا رہا تھا۔ اس بچی کے چہرے کی

معصومیت میں سرکاردوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد صاف لکھا نظر آرہا تھا۔ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پھر اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنادیتے ہیں۔

کھڑکی سے آنے والی روشنی سے سارہ کے ابا کی نیند ڈسٹرب ہوئی تو انھوں نے مجھ سے کھڑکی کا شٹر بند کرنے کے لیے کہا۔ میں نے شٹر گرادیا۔ روشنی ختم ہوگئی۔ میں نے دل میں سوچا۔لوگ دن کی روشنی میں غفلت کی نیند سورہے ہیں۔جن کے پاس روشنی ہے، انھیں اس روشنی میں خدا کی عظمت کو دیکھنے میں خود کوئی دلچسپی نہیں وہ کسی اور کو عظمت خداوندی سے کیا متعارف کرائیں گے۔

سارہ اوراس کے ابا نے دوپہر کے کھانے میں کوشر (یہودی حلال کھانا) کھایا تھا۔سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ میں یہودی آج کے دن تک مچھروں کو چھان رہے ہیں اور اونٹوں کو سالم نگل رہے ہیں۔ یہود نے مسیح کا کفر کیا۔خدا نے فیصلہ کردیا کہ قیامت تک کے لیے اب وہ مسیح کے پیروکاروں سے مغلوب رہیں گے۔پھر سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت بھری ہستی کے ذریعے سے پروردگار نے ان کو سنبھلنے کا ایک موقع دیا۔انھوں نے یہ موقع بھی ضائع کردیا۔مگر افراد تو ابھی بھی نکلتے رہتے ہیں۔ لیوپولڈویز (علامہ محمد اسد) کو کون صاحب علم نہیں جانتا۔ وہ یہودی پیدا ہوئے لیکن اپنی اہلیہ سمیت اسلام قبول کر کے مفسر قرآن اور عظیم مسلم دانشور بن گئے۔

میں نے سارہ کو ایک دفعہ پھر دیکھا۔ وہ چھوٹی سی بچی تقریباً میرے بیٹے کی عمر کی تھی۔ مجھے اس پر بہت پیار آیا۔ میں نے سوچا کہ خدا کو بھی اپنے بندوں پر بہت پیار آتا ہوگا۔اس وقت تو شاید سب سے زیادہ آرہا ہے۔اسی لیے اس نے آج کے انسان کو وہ سب کچھ دے دیا ہے جو کبھی بادشاہوں کو بھی نہیں دیا تھا۔ بحر و بر مسخر ہوگئے۔ فاصلے سمٹ گئے۔انفارمیشن ایج شروع ہوگئی ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ انسانیت کو رحمت اللعالمین کا پیغام پہنچایا جائے۔ خدا نے اس زمین کو

ابتدائی درجے میں جنت بنایا تھا۔ میں مغرب میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور اس سفر میں دوبارہ دیکھا کہ خدا نے انڈسٹریل ایج کا آغاز کیا اور اہل مغرب نے اس کا فائدہ اٹھا کر اس جنت کو مزید بہتر بنا دیا ہے۔ اب خدا نے انفارمیشن ایج شروع کر دی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اپنی کامل جنت کی مکمل اور عالمی منادی کرا دے۔ تاکہ کل جب قیامت کا دن آئے تو کوئی ''سارہ'' یہ نہ کہہ سکے کہ مجھے اگر آپ کی کریم ہستی کا مکمل تعارف مل جاتا تو میں تڑپ کر آپ کی حمد کرتی اور بہشت بریں کی امیدوار ہوتی۔ کوئی انسان یہ نہ کہہ سکے کہ مالک آپ نے سائنس اور سماج کا پورا علم تو کھول کر رکھ دیا، مگر اپنی عطا اور رضا کا مکمل علم نہیں کھولا کہ ہم آپ کی عظمت کے احساس میں ڈوب کر آپ کی تسبیح کرتے اور جنت الفردوس کے امیدوار ہوتے۔

میں نے ایک نظر بند کھڑکی کو دیکھا اور پھر ایک نظر معصوم سارہ پر ڈالی۔ میرے دل نے کہا: اب وقت آ گیا ہے کہ صدیوں سے بند کھڑکیاں کھولی جائیں۔ ہدایت کی روشنی ہر انسان تک پہنچے۔ خدا کی عظمت کا وہ منظر جو آج چند عارفوں کی نگاہوں تک محدود ہے، آنے والے کل میں ہر عام و خاص تک جا پہنچے۔ خدا کی حمد جیسے آسمان پر ہوتی ہے۔ ایسے زمین پر بھی ہو۔ اور جیسے زمین پر ہوتی ہے، ویسے ہی دلوں کی زمین میں بھی کی جائے۔ کھڑکی کھلے گی۔ روشنی ہو گی۔ یہی اٹل فیصلہ ہے۔

اگر گھر والے پیچھے رہ گئے تو

بذریعہ تھائی ائیرویز میری فلائٹ کراچی تا ملبورن براستہ بنکاک تھی۔ ائیرپورٹ پر میری اہلیہ اور میرا بیٹا مجھے چھوڑنے آئے تھے۔ بعد میں اہلیہ نے بتایا کہ میرا بیٹا میری جدائی میں ائیرپورٹ سے روتا ہوا واپس گیا۔ میں بھی ائیرپورٹ پر ہر قدم پر یہ یاد کرتا رہا کہ چند ماہ قبل ترکی کے سفر میں وہ دونوں میرے ساتھ اسی ڈیپارچر لاؤنج میں ہر جگہ موجود تھے۔ اُس وقت میرے اندر

سب سے بڑھ کر جس احساس نے تڑپ پیدا کی وہ یہی تھا کہ کل قیامت کے دن کسی خاندان میں جدائی ہوگئی تو کیا ہوگا۔ اگر ایک انسان جنت میں گیا، مگر اس کے بیوی بچوں کو پیچھے روک لیا گیا تو کیا ہوگا۔ یہ تصور کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ اس سانحے کے بعد بھی جنت، جنت رہ سکتی ہے۔ پروردگار یہ احسان تو اپنے نیک بندوں پر ضرور کرے گا کہ اہل خانہ کے درجات کم ہوئے تو باپ کے پاس بلند درجے میں پہنچادیا جائے۔ مگر اس کا کوئی سوال نہیں کہ کسی کی خاطر اس کے بیوی بچوں کو جہنم سے نکال کر جنت میں پہنچایا جائے۔ کاش ہم سب اپنے گھر والوں کے معاملے میں بھی حساس ہوجائیں۔

تاہم ائیر پورٹ پر ایک اور تجربہ بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جس وقت کسٹم، بورڈنگ، امیگریشن یا سیکیورٹی کے سوال وجواب ہورہے ہوتے ہیں، انسان کو دوسری چیزیں، بشمول پیچھے رہ جانے والے بیوی بچے یاد نہیں رہتے۔ یہی معاملہ حشر کا ہوگا کہ جس وقت اپنا محاسبہ شروع ہوجائے گا تو انسان کو اپنے بیوی بچے بھی یاد نہیں رہیں گے۔ بلکہ یہی وہ موقع ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ انسان چاہے گا کہ اپنی بیوی بچے، ماں باپ، کنبہ بلکہ پوری دنیا کو فدیے میں دے کر اپنی جان چھڑالے، مگر اس روز کوئی فدیہ، بدلہ، سفارش وغیرہ قبول نہیں ہوگی۔

اس روز پہلی دفعہ کراچی ائیر پورٹ پر وہ مشین نصب دیکھی جس میں پورے جسم کا ایکسرے کرلیا جاتا ہے۔ مگر اس کے لیے جس طرح ہاتھ اٹھا کر اور ٹانگیں پھیلا کر مجرموں کی طرح سب کے سامنے کھڑے ہونا پڑتا ہے وہ بہت توہین آمیز طریقہ ہے۔ مگر کسی کی کیا شکایت کیجیے۔ ہم مسلمانوں ہی میں سے بعض انتہا پسندوں نے دنیا کو مجبور کردیا ہے کہ ہر شریف آدمی کی اس طرح برسرعام توہین کی جائے۔ تاہم میرے لیے تو یہ حشر کی اس پیشی کا منظر تھا جس میں اللہ تعالیٰ اپنے علم کی بنیاد پر انسان کا ایکسرے کریں گے۔ ہر انسان کو تمام دنیا کے سامنے حساب کتاب کے لیے

طلب کیا جائے گا۔ اُس روز وہ سارے الفاظ ہوا ہو جائیں گے جنھیں بول کر انسان اپنی برائیوں کو خوبصورتی سے چھپا لیتا تھا۔ اس وقت انسان تمام دنیا کے سامنے بالکل ننگا ہو جائے گا۔ اس کا باطن بالکل کھل کر دنیا کے سامنے آجائے گا۔ بڑے نصیب والے ہیں وہ لوگ جن کا باطن اُس روز ان کے ظاہر سے بہتر نکلے گا۔

زراعت کی حفاظت یا جان کی حفاظت

کراچی تا ملبورن فاصلہ تقریباً گیارہ ہزار کلومیٹر ہے۔ پہلے مرحلے میں رات بھر سفر کے بعد ہم بنکاک پہنچے۔ بنکاک کے سفر میں تکلیف دہ بات شراب کی بدبو تھی۔ مگر کیا کیجیے کہ ایک تو شراب پھر وہ بھی مفت کی۔ اس لیے یار لوگوں نے اپنا حصہ خوب وصول کیا۔ بعض لوگوں کو تو جہاز کے عملے نے مزید شراب دینے سے انکار کر دیا۔ نو بجے اگلا جہاز ملبورن کے لیے روانہ ہوا اور بارہ گھنٹے کے سفر کے بعد منزل پر پہنچا۔ یہاں کراچی سے وقت چھ گھنٹے آگے ہے اس لیے رات ہو چکی تھی۔ ائیرپورٹ پر بہت لوگ تھے۔ امیگریشن کے بعد سامان بھی جلد مل گیا۔ خیال تھا کہ عام رواج کے مطابق سامان لے کر آسانی سے باہر نکل جاؤں گا، مگر دیکھا کہ ایک مرحلہ ابھی باقی ہے جہاں بہت طویل قطار لگی ہوئی تھی۔

معلوم ہوا کہ یہ کسٹم کی لائن ہے اور مسافروں کے سامان میں جس چیز کی کھوج کی جا رہی ہے وہ ہیروئن یا افیم نہیں بلکہ کھانے پینے کی ہر قسم کی اشیاء ہیں۔ کسٹم کے قریب پہنچا تو ایک خاتون نے آکر مجھ سے کھانے پینے کی کسی چیز کے متعلق دریافت کیا تو میں نے بتا دیا کہ میرے پاس کچھ چنے ہیں۔ جس پر مجھے عام لوگوں سے الگ کر کے ایک دوسری لائن میں بھیج دیا گیا۔ یہاں کھڑے ہو کر کسٹم آفیسرز کے ہاتھوں لوگوں کے سامان کا جو حشر ہوتے ہوئے دیکھا تو سعودی عرب یاد آ گیا۔

ایک زمانے میں سعودی عرب میں نشہ آور اشیاء کی تلاش میں لوگوں کے سامان کے بخیے ادھیڑ دیے جاتے تھے۔یہی کچھ اس وقت بعض مسافروں کے سامان کے ساتھ ہو رہا تھا اور چن چن کر سامان سے کھانے پینے کی اشیاء نکال کر الگ کی جا رہی تھیں۔ مجھے اس کی تو فکر نہ تھی، مگر میز بانوں کی زحمت کا احساس تھا جو باہر میرے منتظر تھے۔خیر اللہ نے کرم کیا۔ ہماری قطار سے ایک کتے کو گزارا گیا جو سامان سونگھتا چلا گیا، مگر اسے کسی چیز میں کوئی دلچسپی محسوس نہ ہوئی۔جس کے بعد ہم کو بغیر کسی جرح کے باہر جانے کی اجازت مل گئی۔ میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے باہر کی سمت بڑھ گیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کورنٹائن (Quarantine) کے لوگ ہیں۔ان کا کام مقامی زراعت کو باہر سے آنے والی کسی بھی زرعی بیماری، کیڑوں یا آلودگی سے محفوظ رکھنا ہے تا کہ فصلوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور کیڑے مار دوا کے استعمال کی ضرورت کم سے کم رہے۔

مجھے اس صورتحال پر حکیم سعید مرحوم یاد آ گئے جو کہتے تھے کہ ہم نے اپنی زراعت میں مصنوعی کھاد اور کیڑے مار ادویات سے زہر گھول دیا ہے۔خیر ہم نے تو اپنی پالیسیوں سے زیادہ بڑے زہر اپنے معاشرے میں گھول رکھے ہیں۔حکیم سعید انھی کی نذر ہوئے اور اپنے مطب میں قتل کر دیے گئے۔آج تک ان کے کسی قاتل کو سزائے موت نہیں ہوئی۔سو جس معاشرے میں انسانوں کا قتل معمول کی ایک خبر ہو اور حکیم سعید جیسی ہستی کے قاتلوں کو سزا نہ مل سکے وہاں زراعت کو بچانے کی بات کچھ عجیب لگتی ہے۔اس وقت تو ہمارا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہوگا کہ ہم ایک عام آدمی کی جان کو تحفظ دے سکیں۔ یا کوئی قتل ہو جائے تو ہم مجرموں کو عدالت سے سزا دلوا سکیں۔زراعت کو کیا روئیں، اس وقت یہی ہو جائے تو بہت بڑی بات ہوگی۔

غذا کے علاوہ ایک دوسری چیز جس کے بارے میں سخت تنبیہ آمیز پوسٹر ائیر پورٹ میں لگے

ہوئے تھے وہ یہ تھی کہ بچوں کی پورنوگرافی کے حوالے سے اگر کسی قسم کا کوئی مواد کسی مسافر کے پاس سے برآمد ہوا تو اسے سخت سزا ملے گی۔ اس حوالے سے کچھ عرصے قبل میں نے آسٹریلیا میں پکڑے جانے والے ایک کیس کی تفصیل کہیں پڑھی تھی جس میں ملزم کو سخت سزا ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے ملزم کا تعلق پاکستان ہی سے تھا۔

پھول اور کانٹے

میں باہر نکلا تو عبدالشکور صاحب اپنے تین دیگر ساتھیوں الیاس صاحب، عظیم صاحب اور طاہر صاحب کے ہمراہ میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔ عبدالشکور صاحب سے پہلے ہی سے مستقل رابطہ تھا۔ المورد آسٹریلیا کی طرف سے انھوں نے ہی ایک برس قبل مجھ سے پہلی دفعہ رابطہ کر کے اپریل میں آسٹریلیا آنے کا وقت طے کیا تھا۔ اپریل کا سفر ویزہ دیر سے ملنے کی وجہ سے موخر ہو کر اب اکتوبر میں ہو رہا تھا۔ باقی احباب سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ ان لوگوں سے ملنا خدا کے دین سے مخلص، دلنواز اور بہت اچھے انسانوں سے ملاقاتوں کا وہ آغاز تھا جس کا سلسلہ ملبورن کے بعد سڈنی، برسبین، کینبرا، ایڈیلیڈ اور پرتھ تک جاری رہا۔ دین کی دعوت کا شاید ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آپ کو ہر قدم پر بہت اچھے انسانوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ گرچہ کوئی شخص اقبال کے اس شعر پر عمل کرتا ہو کہ

چمن میں تلخ نوائی میری گوارا کر
کہ کبھی زہر بھی کرتا ہے کارِ تریاقی

تو اسے اندھی مخالفتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے، مگر اس راہ میں ملنے والے اچھے لوگ وہ پھول ہوتے ہیں جن کی وجہ سے اس راہ کے کانٹے بھی گوارا کیے جا سکتے ہیں۔ یہ اچھے لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ نقد انعام ہوتے ہیں جو آخرت کے اجر سے پہلے اِسی دنیا میں اللہ تعالیٰ کی

طرف سے ملتے ہیں۔

ٹھنڈا آسٹریلیا

جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا کہ آسٹریلیا دنیا کے جنوبی حصے میں ہے۔اس وجہ سے یہاں چاند کی گولائی بالکل الٹی سمت میں نظر آتی ہے۔یعنی جب ہمارے ہاں چاند D کی شکل میں ہوتا ہے تو وہاں C کی شکل میں نظر آتا ہے۔موسم بھی ہمارے شمالی حصے کی بہ نسبت بالکل متضاد ہوتے ہیں۔یعنی جب ہمارے ہاں گرمی ہوتی ہے تو یہاں سردی اور جب ہمارے ہاں خزاں ہوتی ہے تو یہاں بہار ہوتی ہے۔میں ستمبر کے آخری ہفتے میں پاکستان سے روانہ ہوا تو گرمیوں کے خاتمے کے بعد خزاں کا آغاز تھا جو کم از کم کراچی میں، کافی گرم ہوتا ہے۔

دوسری طرف آسٹریلیا میں یہ سردیوں کے خاتمے پر بہار کا آغاز تھا۔میرے ساتھ یہاں وہی حادثہ پیش آیا جو کئی برس قبل موسم بہار کے آغاز اور اپریل کے مہینے میں کینیڈا جاتے ہوئے پیش آیا تھا۔یعنی سخت ٹھنڈ لگتی تھی اور وہاں کے لوگ کہتے کہ ٹھنڈ ختم ہو چکی ہے۔یہی بات یہاں کے لوگ کہہ رہے تھے کہ سردی ختم ہو گئی ہے جبکہ مجھے ان سے اتفاق کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

اس کا ایک بہت اہم سبب کراچی کا موسم تھا۔اس شہر کی سردیوں کے بارے میں مزاح کے امام مشتاق احمد یوسفی صاحب فرماتے ہیں کہ جون کے مہینے میں تیس ڈگری درجہ حرارت ہو تو کراچی میں گرمی ہوتی ہے، اور اگر یہاں جنوری میں تیس ڈگری ہو تو پھر اسے سردی کہا جاتا ہے۔ ملبورن کا مسئلہ صرف یہ نہ تھا کہ اس کا درجہ حرارت نو ڈگری تھا۔زیادہ بڑا مسئلہ وہ ٹھنڈی یخ ہوا تھی جس کے بعد سردی چند ڈگری مزید کم ہو کر محسوس ہوتی ہے۔

ملبورن کے بعد میں آسٹریلیا کے تمام اہم شہروں میں گیا۔ان سب جگہوں پر جا کر یہ احساس ہوا کہ آسٹریلیا ایک دوسرے اعتبار سے بھی ٹھنڈا ہے۔یعنی یہاں کی زندگی بہت پرسکون ہے اور

اس میں بہت ٹھہراؤ ہے۔اس پر تفصیل سے بعد میں بات ہوگی۔

دعوتی دورہ

میں ان دوستوں کے ساتھ اپنے میزبان عبدالشکور صاحب کے گھر جا پہنچا۔ کچھ دیر گفتگو کے بعد کھانا لگا تو معلوم ہوا کہ ان کی اہلیہ نے ایک بھرپور دعوت کا اہتمام کرر کھا تھا۔ یہ میرے دعوتی دورے کا ایک ''دعوتی'' آغاز تھا جو اگلے تمام دنوں میں پوری آب وتاب سے جاری رہا۔ ہر روز ایک دعوت ہوتی تو شاید غنیمت تھا۔ یہاں تو حال یہ ہوا کہ ناشتہ، دوپہر اور رات کے کھانے کو ملا کر دن میں تین تین دعوتیں بھی کھانا پڑیں۔ یہ بھی چل جاتا، مگر شاید ہی کوئی دعوت تھی جس میں پانچ چھ ڈشیں نہ ہوں۔ حد یہ ہے کہ آخر میں جب یونیورسٹی آف ویسٹرن آسٹریلیا میں کانفرنس کے دوران میں کھانے کا وقفہ ہوا تو وہاں بھی کہ جہاں کوئی ایک دو ہی پاکستانی تھے، ڈاکٹر ثمینہ یاسمین صاحبہ نے قورمے بریانی کا انتظام کروار کھا تھا۔

اس دعوتی دورے کے اختتام تک میں دو ڈھائی درجن ایسی ڈشیں نوش کر چکا تھا، جو کئی برسوں سے پاکستان میں بھی نہیں کھائیں تھیں۔ میں نے پچھلے دو برسوں میں بڑی مشکل سے سولہ کلو وزن کم کیا تھا۔ اس دورے کے اختتام تک ان میں سے دو کلو وزن دوبارہ بڑھ چکا تھا۔ مجھے آسٹریلیا آ کر یہ لگا کہ خواتین نے ثابت کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ شوہروں سے زیادہ ''دعوت'' کا ذوق رکھتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے اپنے ذوق کو ثابت بھی کر دیا۔ میری دعا ہے کہ بیگمات کا یہ ''دعوتی'' ذوق دعوتِ دین کے ذوق میں بدلے۔ خواتین جب دعوت کے کام میں آتی ہیں تو وہ مردوں سے کہیں زیادہ موثر ہو جاتی ہیں۔

خیر ان دعوتوں نے جلد ہی رنگ دکھا دیا۔ میں سادہ غذا کھانے والا آدمی ہوں۔ میرا معدہ ان حملوں کی تاب کہاں تک لاتا۔ چنانچہ تیسرے دن جب سڈنی پہنچا اور میرے میزبان ڈاکٹر

ذوالفقار صاحب غیر مسلموں کے سر پر کھڑے ہو کر پنیر سے بھرپور دو عدد پزا اپنی نگرانی میں بنوا کر لائے کہ کسی حرام چیز کی آمیزش نہ کر دیں تو میرے معدے نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ جس کے بعد جہاں ممکن ہوا میں نے فرمائش کر کے سبزی اور دال بنوائی۔ خواتین کو بادل ناخواستہ پانچ چھ شاہی ڈشوں کے ساتھ اس فقیر کے لیے ایک فقیری ڈش بھی بنانی پڑی۔

میرا خدا اور میری قوم

میں نے اس سفر پر آنے سے قبل اپنے میزبانوں کو مطلع کر دیا تھا کہ ترکی کے سفر کی وجہ سے میں ایک سفرنامہ لکھ رہا ہوں جس کا سلسلہ آسٹریلیا میں آ کر بھی جاری رہے گا۔ چنانچہ آسٹریلیا کے سفر میں ہر جگہ تقریریں کرنے، سوالوں کے جواب دینے، دعوتیں اٹینڈ کرنے کے علاوہ جو کام میں نے کیا وہ مختلف سیاحتی مقامات کا سفر تھا جس کا انتظام ہر شہر کے میزبانوں نے بھرپور طریقے سے کیا تھا۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال پر سفر کے آخری مرحلے میں ایڈیلیڈ کے میزبان عامر نے یہ تبصرہ کیا کہ جتنا آسٹریلیا آپ دیکھ چکے ہیں، اتنا تو آسٹریلیا میں رہنے والے پاکستانیوں نے بھی نہیں دیکھا۔

میں سفر تفریح کے لیے نہیں کرتا۔ نہ لکھنے کے لیے سفرنامہ لکھتا ہوں۔ سفر اس لیے کرتا ہوں کہ اس خدا کو دیکھوں جو اس کائنات میں بیک وقت ظاہر بھی ہے اور باطن بھی ہے۔ لکھتا اس لیے ہوں کہ جو خدا کائنات کی ہر شے میں ظاہر ہے، مگر لوگوں کی نگاہوں سے مستور ہے، اسے دوسروں کو دکھا سکوں۔ ضمنی طور پر میری یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہماری قوم بھی ترقی یافتہ اقوام کی طرح آگے بڑھے۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ دوسرے ملکوں کی ترقی سے اپنے عوام کو باخبر کر کے ان میں آگے بڑھنے کا جذبہ اور اپنی خرابیوں سے نجات کی تڑپ پیدا کی جائے۔ دوسروں کی تحسین اور اپنے رویوں پر ساری تنقید اسی پس منظر میں ہوتی ہے۔ میرا خدا اور میری قوم، یہی

میرے سفرناموں کا مرکزی خیال ہوتا ہے۔

بارہ حواری اور اخوان الرسول

میرے اس ذوق کے پس منظر میں عبدالشکور صاحب نے یہ طے کررکھا تھا کہ مجھے وکٹوریا ریاست کے سب سے اہم تفریحی مقام Twelve apostles لے کر جائیں گے۔ یہ تعبیر حضرت عیسیٰ کے بارہ حواریوں یا قریبی ساتھیوں کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔مگر یہاں ان سے مراد ساحل سے بالکل قریب سمندر میں کھڑی وہ نوعدد چٹانیں ہیں جو موج ساحل میں گھری تن تنہا صدیوں سے ان موجوں کا مقابلہ کررہی ہیں۔ ان میں سے ایک چٹان سن 2005 میں گرگئی تھی اور اب یہ آٹھ ہی رہ گئی ہیں۔ بارہ حواریوں سے ان کی نسبت کی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ سیدنا عیسیٰ کے یہ گنتی کے حواری ان کے بعد تن تنہا اور نہتے اپنے دور کی پوری مشرکانہ دنیا سے ٹکرا گئے تھے۔آخر کار تین صدیوں بعد مسیحیت دنیا کی سب سے بڑی سلطنت یعنی روم کا سرکاری مذہب اور آج دنیا کا سب سے بڑا مذہب بن چکی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں آنے والوں نے سیدنا مسیح کی ایمان واخلاق کی دعوت میں شرک کی آمیزش کردی۔ یہ اعزاز تو اللہ تعالیٰ نے صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا ہے کہ آپ کے اصل پیغام کو کبھی گم نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اسے ازسرنو دریافت کرنا پڑتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کی ابتداء میں تو صحابہ کرام کی وہ پوری جماعت تھی جس نے دین حق کے ابلاغ کا کام بہت تھوڑے عرصے میں کرڈلا۔مگر اب جب کہ ایمان واخلاق کی آپ کی اصل دعوت اجنبی ہوچکی ہے،آپ کی امت کو بھی ایسے صاحبان دل چاہئیں جو اصل دین کو ڈھونڈیں اور پھر اسے لے کر تن تنہا اور نہتے پوری دنیا سے ٹکرا جائیں۔شاید یہی وہ لوگ ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحیح حدیث میں اپنے بھائی کا جلیل القدر خطاب دیا اور

ان کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔یہی وہ لوگ ہیں جو اُس وقت صحیح دین پوری دنیا میں پھیلا دیں گے جب باقی لوگ اصل دین کی جگہ اپنے مفادات، خواہشات اور تعصّبات کی پیروی کررہے ہوں گے۔

گریٹ اوشن روڈ

میں پچھلی رات سفر کی وجہ سے سو نہیں سکا تھا۔عبدالشکور صاحب کو کچھ تردد تھا کہ آیا میں دن بھر کے اس طویل سفر کے لیے تیار ہوں۔اس رات بھی سوتے سوتے بارہ بج گئے اور پھر فجر قریبی مسجد میں ادا کرنے کے لیے پانچ بجے اٹھ گئے تھے۔مگر چونکہ ملبورن میں میرا قیام بہت کم تھا اس لیے میں تکان کے باوجود چلنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ناشتہ کے بعد ہم روانہ ہوئے۔کل کے ساتھی یعنی الیاس صاحب اور عظیم صاحب ہمارے ہمراہ تھے جبکہ طاہر صاحب نہیں آسکے تھے۔

عبدالشکور صاحب نے بتایا کہ آسٹریلیا کے لوگوں کے لیے یہ جگہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ تھی۔اس عجوبے تک جانے کا راستہ یعنی گریٹ اوشن روڈ یا عظیم سمندری سڑک بھی بلاشبہ دنیا کے خوبصورت ترین راستوں میں سے ایک تھا۔زندگی کے سفر میں بعض اوقات منزل سے زیادہ راستہ خوبصورت ہوتا ہے۔اس راستے کی مثال ایسی ہی تھی۔اس چھ گھنٹے کے راستے میں اتنے خوبصورت مناظر ساتھ ساتھ رہے کہ آنکھوں کی بینائی اور خدا کی صناعی، دونوں پر خدا کی حمد کرتے رہے۔

خدا کی جنت بھی ایسی ہی جگہ ہوگی۔اہل جنت جنت میں سویا نہیں کریں گے۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انھیں کبھی کوئی تکان لاحق نہیں ہوگی کہ اسے مٹانے کے لیے انھیں سونا پڑے۔مگر دوسری حقیقت مجھ پر اس وقت واضح ہوئی جب راستے میں عبدالشکور صاحب نے مجھ سے نیند پوری کرنے کے لیے کہا۔میں نے کچھ دیر آنکھیں بند کیں اور پھر عرض کیا کہ یہاں کی خوبصورتی

مجھے سونے کی اجازت نہیں دے رہی۔ جنت واقعی ایسی جگہ ہوگی کہ جہاں کی خوبصورتی انسان کو سونے اور آرام کرنے حتیٰ کہ آنکھیں بند کرنے کی اجازت بھی نہیں دے گی۔

فضا انتہائی شفاف اور بے آمیز تھی۔اوپر نیلا آسمان اور اس پر جگہ جگہ تیرتے سفید بادل۔ پھر نیچے کے مناظر وقفے وقفے سے بدل رہے تھے۔ راستے میں جگہ جگہ گھاس کے وسیع و عریض میدان آئے۔ان پر چلتی اور چرتی ہوئی سفید بھیڑوں کو دور سے دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ گویا سبز مخملی چادر پر سفید موتی جڑے ہوئے ہیں۔یہ بھیڑیں ان لوگوں کی ملکیت تھیں جو ان وسیع و عریض میدانوں کے پاس تن تنہا گھر بنا کر وہاں رہتے تھے۔مقامی حکومت ہر گھر کے لیے انفراسٹرکچر کی تمام ضروری سہولیات مہیا کرتی تھی۔ان میدانوں میں جگہ جگہ ایک قطار کی شکل میں لگے ہوئے درخت غالباً مختلف مالکوں کے علاقوں کی حد بندیوں کا کام کرتے تھے۔

اس راستے کا ایک حصہ وہ تھا جو جنگل کے بیچ سے گزرتا تھا۔گھنے درختوں کے بیچ سے گزرتی سیاہ تارکول سڑک کی اپنی بڑی خوبصورتی ہوتی ہے۔تاہم اس راستے کی اصل وجہ شہرت اور اس کا سب سے خوبصورت نظارہ سبز پہاڑی راستے کے ساتھ ساتھ نیلے سمندر کا وہ خوبصورت منظر تھا جو دیکھنے والوں کی نگاہوں کو جکڑ لیتا تھا۔ہمیں لینڈ سلائڈ نگ کی وجہ سے کچھ حصہ بند ملا مگر جو دیکھا وہ بہت خوب تھا۔اسی راستے کی وجہ سے اسے گریٹ اوشن روڈ کہا جاتا تھا۔یہ سمندر دراصل بحر جنوبی یا ساؤتھ اوشن (South Ocean) تھا۔

دنیا میں پانچ بڑے سمندر ہیں۔جن میں سے تین بہت مشہور رہیں۔ یعنی بحر الکاہل (Pacific)، بحر اوقیانوس (Atlantic) اور بحر ہند (Ocean Indian)۔قطب شمالی پر واقع بحر منجمد شمالی یا (Arctic Ocean) چوتھا سمندر ہے۔ جبکہ پانچواں سمندر یہ جنوبی سمندر ہے جو قطب جنوبی میں واقع براعظم انٹارکٹیکا (Antarctica) کے اردگرد پھیلا ہوا

ہے۔ انٹا کٹیکا کے اردگرد یہ جما ہوا ہے مگر اس کے بعد یہ عام پانی کی طرح ہی بن جاتا ہے۔ یہ سمندر آسٹریلیا کے جنوبی حصے میں واقع ریاست وکٹوریا سے بھی ملتا ہے جس میں ہم سفر کر رہے تھے۔ تاہم اس کا پانی بہت سرد تھا۔ ہوا بھی ٹھنڈی تھی۔ سرد ہوا کی وجہ سے ساحل خالی پڑا ہوا تھا۔ یہ ساحل شاید موسم گرما کے شباب میں آباد ہوتے ہوں گے۔ یہ میرے لیے بہت غنیمت تھا کہ اس طرح میں اس ساحل اور اس کے خوبصورت مناظر کو دیکھ پایا۔ ورنہ مجھے یقین ہے کہ موسم گرما کے شباب میں یہاں کی ''پر شباب'' سرگرمیوں کی بنا پر میرے میزبان مجھے دور ہی سے ساحل دکھاتے اور یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے کہ یہ کوئی خاص جگہ نہیں ہے۔

خدا کی قدرت خدا کی جنت

یہاں کا ساحل نیلگوں تھا اور ساحل پر موجود پہاڑ سبزے سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ایک پہاڑ کی گھاس کو دیکھ کر لگا کہ گویا یہ گولف کا کوئی خوبصورت میدان ہو۔ میرے لیے یہ بڑا غیر معمولی لمحہ تھا۔ ایک طرف خدا کے جمال کا یہ ظہور اور دوسری طرف اس کی یہ قدرت کہ میں دنیا کے ایک اور براعظم پر موجود تھا۔ میرے سامنے ایک ایسا سمندر تھا جس کا ذکر ابھی تک کتابوں میں پڑھا تھا۔ وہ سمندر جو ایک طرف زمین کے کنارے یعنی قطب جنوبی پر جما ہوا تھا اور اِس جگہ سرکشی کے ساتھ موجیں مار رہا تھا۔ کتنا عجیب اور بے مثل ہے وہ خدا جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے۔

میں نے ایک نظر نیلگوں آسمان اور اس پر تیرتے بادلوں کے ہجوم اور ان سے چھنتی سورج کی روشنی کو دیکھا۔ یہ وسیع و عریض کائنات اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک جہنم ہے۔ یہاں سرد و تاریک خلا ہیں۔ بے آب و گیاہ چٹانیں ہیں۔ آگ کی طرح دہکتے ستارے ہیں۔ زہریلی گیسوں کا مسکن سیارے ہیں۔ میں اس کائنات کے لیے قاتل کائنات کی اصطلاح استعمال کرتا ہوں کہ یہ زندگی کی ہر قسم کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے۔ مگر اچانک اس کرہ ارضی پر آ کر کائنات کی تمام طاقتیں اپنا رخ

بدلتی ہیں اور زندگی کو جنم دینے اور برقرار رکھنے والا ایک نظام بنادیتی ہیں۔

آگ کا گولہ یعنی سورج اپنی قہر سامانی کو بھول کر روشنی اور حرارت کا ماخذ بن جاتا ہے۔ زہریلی گیسیں آپس میں مل کر فضائے لطیف بنادیتی ہیں۔ دن اور رات کا متوازن سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ موسم آنے جانے لگتے ہیں۔ درجہ حرارت بالکل معتدل ہوجاتا ہے۔ ہر چیز ویسی ہی ہوجاتی ہے جیسا اسے ہونا چاہیے۔ پھر انسان کے لیے یہ اس کی ضروریات ہی نہیں ذوق کی تکمیل کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔

ہم ضرورت کے لیے کھانا کھاتے ہیں۔ مگر اس کھانے کی لذت ہمیں سرشار کردیتی ہے۔ ہم زندگی کے لیے سانس لیتے ہیں۔ مگر کیسی لطیف خوشبوئیں ہمارے وجود کو معطر کردیتی ہیں۔ ہم اپنے وجود کے تسلسل کے لیے اپنی نسل بڑھاتے ہیں۔ مگر یہ تعلق ہماری احساسات کی دنیا کو لافانی رنگ بھی دے جاتا ہے۔ یہ چند مثالیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ بنانے والے نے ایک جہنم کے اندر سے انسانوں کے لیے جنت بنادی ہے۔ دورِ شکار میں اس نے انسان کو جینا سکھایا۔ دورِ زراعت میں رہنا بسنا سکھایا۔ صنعتی دور میں اس کی زندگی کو آسائشوں سے بھردیا۔ اور اب اس انفارمیشن ایج میں وہ آخری اور عالمی منادی کررہا ہے کہ یہ دنیا ختم ہونے والی ہے۔ ابدی جنت شروع ہونے والی ہے۔ رب العالمین اگر یہ دنیا بناسکتا ہے تو وہ دنیا بھی بناسکتا ہے۔ کون ہے جو اس کا طلبگار ہے؟ کون ہے جو اس کے لیے خدا سے سودا کرے کہ وہ ہر خواہش، تعصب اور مفاد سے بلند ہوکر خدا کا بندہ بنے گا؟

آسٹریلیا کے اس دورے میں ہر جگہ میں نے لوگوں کو قرآن کریم اور سیرت رسول کی روشنی میں وہی راستہ بتانے کی کوشش کی جو سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ مجھے نہیں خبر کہ کتنے لوگ اس پکار کا جواب دیں گے۔ میں نے برسہا برس میں یہ سیکھا ہے کہ داعی کا کام پہنچانا ہوتا ہے۔ لوگوں کو

بدلنا نہیں ہوتا۔ لوگوں کو بدلنا ہوتو رب العالمین کے ایک اشارے کی دیر ہے۔ مگر یہ اسے مطلوب نہیں ہے۔ اسے وہ لوگ چاہئیں جو اپنی مرضی سے اس کے سامنے جھک جائیں۔ جنت انھی کی وراثت ہے۔ جنت انھی کی ملکیت ہے۔

ایک عجوبہ

راستے میں مختلف جگہ رکتے، کافی پیتے اور علمی وفکری گفتگو کرتے ہوئے ہمارا سفر جاری رہا۔ چھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے جو بلاشبہ خدا کی قدرت کا ایک اور نمونہ تھی۔ ساحل سمندر چونے کے پتھروں یا لائم اسٹون سے تشکیل پایا ہوا ایک پہاڑی سلسلہ تھا۔ مگر جنوبی سمندر کے شدید موسمی اثرات اور تیز وتند ہواؤں نے ہزارہا برس کے عمل میں چٹانوں کو اس طرح تراشا تھا کہ وہ ساحل کی سمت سے دیکھنے پر بل کھاتی اور آگے پیچھے ہوتی ایک بلند اور ہموار دیوار کی طرح نظر آرہی تھیں۔

مگر اصل عجوبہ ان سے کچھ آگے پانی کے اندر الگ الگ کھڑی وہ عمودی چٹانیں تھیں جو کسی موٹے بے ہنگم ستون کی طرح پانی کی سرکش موجوں اور ساحلی ہواؤں سے نبرد آزما تھیں۔ یہ بھی ہزارہا برس کی وہ کاریگری تھی جسے سمندری ہواؤں اور موجوں نے چٹانوں کے کٹاؤ اور تراش خراش کے بعد جنم دیا تھا۔

ساحل سے متصل ایک چٹان آگے نکلی ہوئی تھی جس تک جانے کے لیے بورڈ واک کا ایک راستہ بنا ہوا تھا۔ اس پر جا کر ان تمام چٹانوں کو باآسانی دیکھا جاسکتا تھا۔ ہم وہاں گئے اور خدا کی اس قدرت کو دیکھا۔ وہاں ایک ہیلی کاپٹر سروس بھی چل رہی تھی جس میں بیٹھ کر فضا سے ان چٹانوں اور ساحلی کٹاؤ کی خوبصورتی کا فضائی جائزہ لیا جاسکتا تھا۔ گرچہ وہاں ہوا بہت تیز اور ٹھنڈی تھی، مگر ہم نے جی بھر کے اس منظر کو دیکھا۔

مردوں کے لیے ایک ضابطہ

میں نے ترکی کے سفر میں یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ سفرنامے کے نوٹس کاغذ میں لینے کے بجائے آڈیو اور وڈیو کی شکل میں لینا شروع کر دیے تھے۔ اس پر بعض احباب نے کہا کہ میں فیس بک پر ان میں سے بعض چیزیں لائیو شیئر کر دوں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے عبدالشکور صاحب نے میرے لیے ایک موبائل سم کا بندوبست کر رکھا تھا جس میں انٹرنیٹ بھی تھا۔ آسٹریلیا کے ہر مقام سے میں نے اسی سم سے اپنے فیس بک پیج پر لائیو گفتگو کی۔

یہاں البتہ سگنلز کا مسئلہ تھا اس لیے عبدالشکور صاحب کے موبائل سے کچھ گفتگو کی۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مغرب میں آنے والے کسی بھی شخص کے لیے پہلا مسئلہ خواتین کی نیم عریانی ہوتا ہے۔ اس سے بچنے کا طریقہ قرآن مجید کی اس ہدایت کو یاد رکھنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی مواقعوں پر نگاہ نیچی رکھنے کا حکم دیا ہے۔ ہمارے ہاں پردے کے احکام جب بھی زیر بحث آتے ہیں تو ہمیشہ خواتین ہی پر ساری توجہ ہوتی ہے۔ حالانکہ قرآن نے گفتگو کا آغاز مردوں سے شروع کر کے ان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی نگاہ اور جذبات دونوں پر قابو رکھیں۔

ہمارے ہاں یہ بڑا المیہ ہے کہ مردوں کو اس حوالے سے دی گئی ہدایت زیر بحث نہیں آتیں۔ مردوں کو اگر یہ تربیت نہ دی جائے تو وہ برقعہ پہنے ہوئی خاتون کا بھی ایکسرے کر لیتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اس موقع پر لوگوں کو اسی حوالے سے توجہ دلائی۔

اس حوالے سے ایک اور بات بھی اہم ہے۔ عریانی جب مستقل طور پر سماج کا حصہ بن جائے تو نظر جھکانے سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس وقت غض بصر کے ساتھ اعراض بصر کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ یعنی جب اس طرح کی چیزیں مستقل سامنے آتی رہیں تو انھیں نظر انداز کرنا سیکھیں۔ اصل مسئلہ اس طرح کی چیزوں کے تعاقب کے لیے نظروں کو آزاد چھوڑ دینا ہوتا

ہے۔ وقتی طور پر کوئی لغزش ہو جائے اور ہو جاتی ہے کہ انسان بہرحال انسان ہے تو فوراً لوٹ آنا چاہیے۔ کیلے کے چھلکے پر پاؤں پڑنے سے پھسل کر گر جانا مسئلہ نہیں۔ پھلسنے کے عمل کو انجوائے کرنا قابل اعتراض بات ہے۔

بیرون ملک مقیم پاکستانی اور شہادت حق

ہم کچھ دیر وہاں ٹھہرے اور خدا کی قدرت کی یہ عجیب و غریب صناعی دیکھتے رہے۔ ایک طرف یہ چٹانیں تھیں تو دوسری طرف بحر جنوبی کا پانی جو شروع میں سبز تھا اور پھر تا حد نظر نیلگوں تھا۔ یہ بلاشبہ بہت خوبصورت منظر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دن چڑھتے اور ڈوبتے وقت سورج کی کرنیں جب ان چٹانوں پر پڑتی ہیں تو وہ منظر بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ لیکن ہم کو واپس جانا تھا۔ ہماری منزل بھی دور تھی اور مجھے عین دوپہر میں بھی تیز ہوا کی وجہ سے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ اس لیے ہم کچھ دیر وہاں ٹھہرنے کے بعد روانہ ہو گئے۔

واپس آنے کے لیے عبدالشکور صاحب نے گریٹ اوشن روڈ کے بجائے ہائے وے کا راستہ اختیار کیا جو آدھے وقت میں طے ہو گیا یعنی چھ کے بجائے تین گھنٹے میں۔ اس راستے میں بس سمندر نہیں تھا ورنہ لینڈ اسکیپ بلاشبہ بہت خوبصورت اور دلکش تھا۔ راستے بھر ہم گفتگو کرتے رہے۔ سچی بات یہ ہے کہ جتنا ان دوستوں نے مجھ سے سیکھا ہو گا اس سے کہیں زیادہ میں نے ان سے آسٹریلیا اور ملبورن کے بارے میں جان لیا۔

آسٹریلیا میں غیر ملکی طلبا اور امیگریشن کا رجحان پچھلے ایک دو عشروں میں بہت بڑھا ہے۔ جس کے نتیجے میں بہت سے پاکستانی بھی یہاں آ گئے ہیں۔ مگر دنیا کے دیگر ممالک کی بہ نسبت یہاں آنے والے پاکستانی تمام تر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ یا کم از کم تعلیم یافتہ ضرور ہیں۔ پاکستانی لیبر کلاس یہاں موجود نہیں ہے۔

ملبورن میں میرے میزبان عبدالشکور صاحب اور باقی احباب بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور ماشاء اللہ سب اچھی طرح سیٹ تھے۔ عبدالشکور صاحب ایک آئی ٹی پروفیشنل تھے۔ الیاس صاحب انجینئر تھے۔ طاہر صاحب کا تعلق سپلائی چین سے تھا جبکہ عظیم صاحب اکاؤنٹنٹ تھے۔ یہ سب لوگ تعلیم یافتہ اور صاحب حیثیت ہونے کے باجود طبعًا بہت سادہ مزاج تھے۔ غالبًا اسی سادہ مزاجی کا اثر تھا کہ مجھے محسوس نہیں ہوا کہ ان سے یہ میری پہلی ملاقات ہے۔

ملبورن ہی نہیں بلکہ دیگر مقامات پر ملنے والے پاکستانی بھی سب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ میں نے ایک دو تقریروں میں اس بات کا خاص طور پر ذکر کر کے لوگوں کو یہ توجہ دلائی کہ دورِ جدید میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کی دعوت کو زندہ کرنے کے لیے دو انتظام کیے ہیں۔ ایک یہ کہ انفارمیشن ایج شروع کر دی ہے اور دوسری یہ کہ دنیا بھر میں مسلمان تلاش معاش کے سلسلے میں پھیل گئے ہیں۔ خاص کر مغربی ممالک میں بڑی تعداد میں مسلمان موجود ہیں۔ ان میں پاکستانی کمیونٹی اپنی صلاحیت اور ذہانت کی بنا پر بہت ممتاز ہے۔

آسٹریلیا کے پاکستانی چونکہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور زیادہ تر خوشحال ہیں اس لیے ان کے پاس یہ زیادہ موقع ہے کہ وہ اپنی زندگیوں میں سیٹ ہونے کے بعد باقی وقت خدا کے دین کا تعارف عام کرانے میں وقف کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے دین کو ری ڈسکور کریں۔ یعنی تعصّبات اور خواہشات سے بلند ہو کر یہ دریافت کریں کہ دین کی اصل دعوت ایمان و اخلاق ہے۔ پھر خود اس کا ایک نمونہ بنیں۔ وہ ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جو دنیا میں سب سے زیادہ قابل رہائش یا لیوایبل (Liveable) سمجھا جاتا ہے۔ اب وہ انسانیت کو بتائیں کہ اصل لیو ایبل جگہ جنت ہے۔

ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار کی طرح

یہی گفتگو ان دوستوں کے ساتھ گاڑی میں دوران سفر میں نے ایک دوسرے پہلو سے کی تھی۔ میں نے جس بات کی طرف توجہ دلائی تھی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے دور حاضر میں دین حق کی تعلیمات کو ہر طرح کے اضافوں اور تحریفات سے پاک کر کے ایمان واخلاق کی دعوت کو بالکل کھول کر رکھ دیا ہے۔ اس کے ساتھ انفارمیشن ایج شروع کر کے ابلاغ حق کے نئے مواقع پیدا کر دیے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ انسانی تاریخ میں پیدا ہونے والے عظیم ترین مواقع میں سے ایک ہے۔ اس سے قبل جب بھی دین حق کی دعوت دی جاتی تھی، یہ دعوت دینے والوں کو زندہ آگ میں جلا دیا جاتا تھا، سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا، ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جاتے تھے یا کم از کم اپنے وطن چھوڑ کر دربدر ہونا پڑتا تھا۔ انسانی تاریخ میں یہ پہلی دفعہ ہوا ہے کہ دین حق کے ماننے والے سیاسی، سماجی، تعلیمی اور معاشی غرض ہر پہلو سے کمزور ہونے کے باوجود کسی قسم کے ظلم وستم کا سامنا کیے بغیر دین حق کی دعوت دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد لوگوں کی مرضی ہے کہ مانتے ہیں یا نہیں۔ یہ ان کا اور ان کے پروردگار کا معاملہ ہے۔ خدا زبردستی کسی کو اپنا بندہ نہیں بنانا چاہتا۔ جنت کا سودا وہی خریدے گا جو اپنی آزادانہ مرضی سے اپنی آزادی سے خدا کے سامنے دستبردار ہو جائے۔

دین حق کی دعوت لوگوں تک پہنچانا اصلاً نبیوں کا کام ہے۔ اس کا اجر اتنا زیادہ ہے کہ لوگوں کو اندازہ ہو جائے تو اپنی زندگی کا ہر لمحہ اس کام کے لیے وقف کر دیں۔ مگر بدقسمتی سے بیشتر لوگ اپنی خواہشات اور تعصّبات کے اسیر ہیں۔ اس لیے وہ اس عظیم موقع کو پہچاننے اور اس کا فائدہ اٹھانے سے قاصر ہیں۔

انسانی تاریخ کا یہ ایک بڑا غیر معمولی واقعہ ہے کہ دین حق کے ابلاغ کی جو جدوجہد ہر دور میں انبیا کی سرکردگی میں کی گئی ہے، پہلی دفعہ کسی نبی کی موجودگی کے بغیر کی جا رہی ہے۔ لیکن نبی

کے موجود نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو اہل وفا اس راہ کے لیے اٹھیں گے، وہ خدا کی خصوصی عنایتوں کے ساتھ یہ جنگ لڑیں گے۔ خدا کی نگرانی میں خدا کی جنگ لڑنے کا اعزاز صرف انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا تھا۔ اب یہ اعزاز عام انسانوں کو دیا جا رہا ہے۔ اسی لیے ان لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بھائی کا خطاب دیا تھا۔

یہ اعزاز اتنا بڑا ہے کہ لوگوں کو ذرا سا بھی اندازہ ہو جائے تو اس جنگ میں شریک ہونے کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیں۔ جو اہل دل ہیں وہ تو آج بھی سراپا فریاد ہیں کہ خدا انھیں اس کام کے لیے قبول کر لے۔ وہ سراپا امید ہوتے ہیں کہ ان کے گناہوں کے باوجود اللہ تعالیٰ انھیں قبول کر کے ان اہل وفا میں شامل کر لے جو یہ جنگ لڑیں گے۔ بقول مجروح سلطان پوری:

مجروح لکھ رہے ہیں وہ اہل وفا کا نام
ہم بھی کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار کی طرح

عام آدمی اور دعوت دین

میری تحریروں میں اکثر دعوتِ دین کا ذکر ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہر شخص سارے کام چھوڑ کر اس کام میں لگ جائے۔ قومی اور عالمی سطح پر انذار کرنا عام آدمی کی نہیں اہل علم کی ذمہ داری ہے جو پوری زندگی اس کام کے لیے لگا دیتے ہیں۔ ان اہل علم کو دین کی گہری بصیرت حاصل کرنے کے بعد ہی اس کام کے لیے اٹھنا چاہیے۔ عام آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ ان کی نصرت کرے۔ ان کی کتابیں اور تحریریں پھیلائے۔ عملی پہلوؤں سے ان کے ساتھ تعاون کرے۔ اس طرح یہ کام ایک ٹیم ورک بن جاتا ہے۔

دنیا میں کام تو اس ٹیم ورک کے نتیجے میں ہوگا، مگر جہاں تک اجرِ آخرت کا تعلق ہے تو ضروری نہیں کہ عالم کو زیادہ اجر ملے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک عام شخص کو اس کے اخلاص کی بنا پر عالم سے زیادہ

اجر مل جائے۔اس کے علاوہ ایک عام آدمی کی ذمہ داری یہ ہے کہ اپنے حلقے میں حق کی تلقین کرے اور برائیوں کے خلاف آواز بلند کرتا رہے۔خیر وشر کا شعور عام کرے۔اپنے گھر والوں اور اپنی ذات کے بارے میں حساس رہے۔یہی فرد کی دعوت اور اصل ذمہ داری ہے۔

روح کی غذا

ہم شام تک گھر پہنچے۔فوراً ہی الیاس صاحب کے ہاں جانا تھا۔جن کے ہاں ایک دعوت، کھانے کی متعدد ڈشیں اور بہت سارے احباب منتظر تھے۔ چنانچہ کپڑے بدل کر وہاں روانہ ہوگئے۔وہاں پہلے احباب کے ساتھ سوال و جواب کی نشست ہوئی۔احباب نے بڑے اچھے سوالات کیے۔اس کے بعد پھر لذتِ کام ودہن کی محفل شروع ہوئی۔

کھانے یہاں بھی اور باقی تمام مقامات پر بہت اچھے تھے۔تاہم میری ناقص رائے یہ ہے کہ مہمانوں کے اکرام میں ایک دو ڈشیں بنالی جائیں، مگر اس سے زیادہ کا اہتمام نہیں ہونا چاہیے۔کیونکہ اول اس سے خواتین پر بہت بوجھ پڑتا ہے۔خاص کر آسٹریلیا جیسے ملکوں میں جہاں گھریلو ملازمائیں نہیں ہوتیں۔جس کے نتیجے میں اول تا آخر سارا کام خواتین ہی کو کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اہل دین کی محافل کو اصلاً کھانے کی محفل نہیں ہونا چاہیے۔یہ محفلیں روح کو غذا پہنچانے کا ذریعہ ہونی چاہئیں۔یہاں سے انسان کو معرفت رب اور جنت کے حصول کی خواہش لے کر اٹھنا چاہیے۔ساری توجہ اسی پر رہنی چاہیے۔

دعوت اور کھانے کا سب سے زیادہ نقصان میزبان کو ہوتا ہے جو اتنا اہتمام بھی کرتا ہے اور جس مقصد کے لیے دین کا کوئی طالب علم آتا ہے یعنی دین سیکھنے سکھانے کا عمل، انتظام وانصرام کی وجہ سے اہل خانہ کا سب سے کم دھیان اس پر رہتا ہے۔یہ ایک بڑا نقصان ہے۔

سچ کی تلاش

جیسا کہ عرض کیا کہ میری رہائش عبدالشکور صاحب کے ساتھ رہی۔ان کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ان کی اہلیہ کا بھی ماشاءاللہ دینی ذوق تھا۔عبدالشکور صاحب نے پردے کے حوالے سے ان کا نقطہ نظر میرے سامنے رکھا تو میں نے عرض کیا کہ ہمارا کام یہ نہیں ہے کہ جو خواتین چہرہ کا پردہ کرتی ہیں یا کرنا چاہتی ہیں، ان کا پردہ اتروائیں۔میں نے انھیں بتایا کہ میری اہلیہ خود چہرے کا پردہ کرتی اور برقعہ پہن کر باہر نکلتی ہیں۔

پردہ دیگر فقہی مسائل کی طرح ایک فقہی مسئلہ ہے جس پر اہل علم کی الگ الگ آراء اول دن سے رہی ہیں اور آج تک ہیں۔کچھ لوگ اسے لازمی قرار دیتے ہیں اور کچھ کے نزدیک اس حکم کا تعلق عام خواتین سے نہیں بلکہ صرف ازواج مطہرات سے تھا۔میں اپنے ذوق کے لحاظ سے ایک قدامت پسند شخص ہوں، اس لیے ذاتی رجحان پہلی رائے کی طرف ہے۔مگر جب میں دین سمجھتا ہوں تو کبھی ذوق اور رجحان کو بیچ میں نہیں آنے دیتا۔ایسا کرنا ایک جرم ہے۔اس لیے قرآن وحدیث کے واضح دلائل کی روشنی میں دوسری رائے ہی کو درست سمجھتا ہوں۔

تاہم اصل بات یہ ہے کہ جو شخص جس رائے کو درست سمجھتا ہے اس پر عمل کرلے۔اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ چیز ثانوی ہے کہ کس نے کیا عمل کیا۔زیادہ اہم بات جس پر اصل سوال ہوگا وہ یہ ہے کہ اپنے تعصّبات اور ذاتی پسند وناپسند سے بلند ہوکر سچ بات کو دیانت داری سے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی یا نہیں۔پھر اس کے بعد اگلا سوال یہ ہوگا کہ جس بات کو دیانت داری سے درست سمجھا تھا اس پر عمل کیا یا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے پہلی چیز میں نے کم ہی کسی مذہبی آدمی یا عورت کا مسئلہ بنتے ہوئے دیکھی ہے۔لوگ اپنے تعصّبات کے مطابق زندگی گزارتے ہیں۔انھیں سچ سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔اس کے بعد کوئی شخص بڑے سے بڑا عمل لے کر بھی اللہ کے حضور پہنچ جائے اللہ تعالیٰ

یہ عمل اس کے منہ پر کھینچ کر ماریں گے۔اس لیے کہ یہ عمل اللہ کے لیے نہیں کیا گیا۔ بلکہ اپنے تعصّبات کے تحت کیا گیا ہے۔اپنے تعصّبات کے تحت تو لوگ یہودی بھی ہوتے ہیں اور عیسائی بھی۔ بتوں کو بھینٹ بھی چڑھاتے ہیں۔صیہونیت کے اور مسیحی مشنری کام بھی کرتے ہیں۔ان تعصّبات کی خدا کے ہاں کوئی وقعت نہیں۔خدا کو وہ لوگ چاہئیں جن کی دلچسپی حق میں ہو۔حق کی تلاش ان کا مسئلہ ہو۔اور پھر حق کے سامنے ان کا سر جھک جائے۔

سردی کا حملہ

عبدالشکور صاحب نے اپنے گھر میں بہت خیال سے رکھا۔ان کے گھر میں رہتے ہوئے اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔گرچہ سردی کا احساس ہوا۔مگر اس کی وجہ بھی میری غلطی تھی۔ مجھے عبدالشکور صاحب نے اپنی اہلیہ کی اس نصیحت سے مطلع کیا کہ مجھے ایک اور کمبل لے لینا چاہیے۔ مگر میں نے اس پیشکش کو قبول کرنا ضروری نہیں سمجھا۔کیونکہ رات کو سوتے وقت زیادہ ٹھنڈ نہ تھی۔مگر ملبورن میں موسم مستقل ابر آلود رہتا تھا اور تیز ہوا چلتی رہتی تھی۔نتیجتاً رات کو ٹھنڈ بڑھ گئی اور ٹھنڈ کی وجہ سے میں صبح تین بجے اٹھ کر بیٹھ گیا۔اس سے قبل بھی میری نیند پوری نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ مجھے ٹھنڈ لگ چکی ہے۔اللہ نے کرم کیا کہ صبح ناشتے پر جو دعوت تھی اس میں ایک خاتون ڈاکٹر موجود تھیں۔انھوں نے اپنی گفتگو سے مجھے مطمئن کر دیا کہ کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔عام پیراسٹامول سے ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے خیال میں ڈاکٹر کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔شفا تو اللہ ہی دیتا ہے۔ڈاکٹر کو لوگوں کو اطمینان دلانا چاہیے۔ان لوگوں نے مجھے آرام کے لیے ایک کمرے میں لٹا دیا۔میرے معدے نے بھی شاید اس وقت تک کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ طاہر صاحب کی ایک اور پرتکلف دعوت اور متعدد ڈشوں میں سے کچھ کھانے کا دل نہیں چاہا۔دوپہر میں جمعہ کے بعد پھر باربی کیو تھا۔وہاں بھی کسی چیز کا دل نہیں چاہا۔

طاقتور انسان کمزور انسان اور خدا

اس پورے سفر میں نیند کا پورا نہ ہونا، مسلسل سفر، بے آرامی، کھانے پینے کی بے ترتیبی اور سردی جیسی چیزوں نے مجھے ڈسٹرب رکھا۔ لیکن اللہ کی یہ بڑی عنایت رہی کہ میں بیمار نہیں پڑا۔ کوئی پروگرام کینسل نہیں ہوا۔ بلکہ میں نے اسی حال میں بہت سارا ٹورازم بھی کرلیا۔ جس کی روداد آپ جگہ جگہ اس سفرنامے میں پڑھیں گے۔

برسبین کے سفر میں جب ڈاکٹر ذوالفقار صاحب میرے ساتھ تھے تو ان سے یہ بات زیر بحث آئی۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ میں روٹین کی زندگی کا عادی ہوں اور روٹین بگڑے تو مجھے مشقت ہو جاتی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک کمزوری ہے۔

تاہم مجھے اس کمزوری سے ہمیشہ ایک فائدہ ہوتا ہے۔ فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایک عاجز اور کمزور انسان کے لیے یہ بڑا آسان ہوتا ہے کہ وہ خدا کے مقابلے میں اپنے عجز کو دریافت کرے۔ جبکہ ایک طاقت ور انسان کے لیے یہ ایک مشکل کام ہوتا ہے۔ جبکہ حقیقت میں خدا کے سامنے ایک طاقتور شخص بھی اتنا ہی کمزور ہے جتنا ایک کمزور آدمی۔ مگر ایک طاقتور شخص ہر چیز کا کریڈٹ اپنے آپ کو دینے کا عادی ہو جاتا ہے۔ جبکہ ایک کمزور انسان جب اپنے عجز کو دریافت کر کے خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو جواب میں خدا بھی متوجہ ہو جاتا ہے۔ جب خدا متوجہ ہو جائے تو پھر معجزے وجود میں آتے ہیں۔

خطاب جمعہ

جمعے سے قبل عبدالشکور صاحب کے ہمراہ ہم ملبورن کے کمیونٹی سنٹر پہنچے۔ یہاں جمعے کی نماز سے قبل میرے خطاب کا پروگرام تھا۔ ایک ہال میں آگے مرد اور پیچھے پارٹیشن کے بعد خواتین موجود تھیں۔ میں نے ایک حدیث کی روشنی میں بات شروع کی جس میں بتایا گیا ہے کہ قیامت

جمعہ کے دن آئے گی۔ جس کے بعد حاضرین کو یہ توجہ دلائی کہ اگر آج اس جمعہ کو وہ گھڑی آجائے اور ہم جس حال میں اس وقت ہیں، اسی حال میں اللہ کے حضور پیش ہوجائیں تو کیا ہوگا۔ چنانچہ ہم سب کو اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔ ہمیں ایک نسلی یا متعصب مسلمان نہیں ہونا چاہیے بلکہ ایک حقیقی مسلمان ہونا چاہیے اسلام جس کی اپنی دریافت ہو۔ جس کے بعد میں نے زندگی کے وہ عملی دائرے بیان کیے جن میں اللہ تعالیٰ ہمارا رویہ درست دیکھنا چاہتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اسلام سے ہمارا تعلق اپنے فرقہ وارانہ تعصّبات کی بنیاد پر نہیں تحقیق پر مبنی اس علم پر ہونا چاہیے جو قرآن وسنت میں موجود ہے۔ یعنی خدا سے ہمارا ایک زندہ تعلق ہونا چاہیے جس میں ہم ہر لمحہ اس کی معیت کے احساس میں جئیں۔ دوسرا یہ کہ عام انسانوں کے ساتھ ہمیں عدل، احسان، انفاق جیسی اقدار کے مطابق معاملہ کرنا چاہیے اور ظلم و حق تلفی سے بچنا چاہیے۔ تیسرے یہ کہ بدکاری اور فواحش سے ہمیں دور رہنا چاہیے۔

پیچھے میں نے بار بار انفارمیشن ایج کا ذکر کیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ میری یہ تقریر فیس بک پر اگلے دن ہی اپ لوڈ ہوگئی جس کے بعد یہ ہزاروں لوگوں نے سنی۔ اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انفارمیشن ایج نے ابلاغ کے کیسے غیر معمولی ذرائع اب پیدا کردیے ہیں۔

جمعے کی نماز کے بعد خواتین کے ساتھ سوال و جواب کی ایک نشست ہوئی۔ خواتین نے متنوع نوعیت کے سوالات کیے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے علم و عمل میں برکت دے۔ جس کے بعد کھانا کھاتے کھاتے سہ پہر ہوگئی۔ شام میں میری سڈنی روانگی تھی۔ اسی لیے گھر سے سارا سامان ساتھ لے کر چلا تھا جو عبدالشکور صاحب کی گاڑی میں تھا۔ احباب سے مل کر ہم ایئر پورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس دفعہ عبدالشکور صاحب کے ساتھ ائیر پورٹ چھوڑنے کے لیے بلال منیر

صاحب، خالد بلوچ صاحب اور فیاض امیری صاحب بھی ساتھ تھے۔ ان لوگوں نے یہ طے کیا کہ ائیر پورٹ جانے سے قبل مجھے شہر کے مرکزی حصے جسے امریکہ وغیرہ میں ڈاؤن ٹاؤن اور یہاں سی بی ڈی یعنی سنٹرل بزنس ڈسٹرکٹ کہا جاتا ہے، اس کا چکر لگوادیا جائے۔

چنانچہ ہم ائیر پورٹ جانے سے قبل مرکز شہر پہنچے۔ آج کسی مقامی میچ کی بنا پر عام تعطیل تھی۔ اس لیے یہ علاقہ بند تھا۔ ورنہ عام حالات میں یہاں کافی رونق ہوتی ہوگی۔ مرکز شہر کی خاص بات ایم سی جی یا ملبورن کرکٹ گراؤنڈ تھا جہاں کرکٹ میچ ہوتے ہیں اور کرکٹ کا شوق رکھنے والے پاکستانی کم از کم اس کے نام سے ضرور واقف ہیں۔ دوسری عمارت یوریکا ٹاور تھی جو آسٹریلیا کی دوسری بلندترین عمارت تھی۔

یہ چیزیں دیکھتے ہوئے ہم ائیر پورٹ پہنچ گئے۔ عبدالشکور صاحب مجھے اندر تک چھوڑنے آئے اور میری بورڈنگ کروادی۔ آسٹریلیا میں تمام ڈومیسٹک ائیر پورٹ پر میں نے یہی دیکھا کہ لینے والے سامان لینے کی جگہ تک اور چھوڑنے والے بورڈنگ بلکہ بعض جگہ تو جہاز میں بیٹھنے سے پہلے تک ساتھ آئے تھے۔ جبکہ ہر جگہ جہاز میں پانی بھی لے جانے کی اجازت تھی جو کہ عام طور پر اب دنیا میں نہیں دی جاتی۔

ملبورن

عبدالشکور صاحب بڑی محبت کے ساتھ مل کر رخصت ہوئے۔ میں ویٹنگ لاؤنج جا کر بیٹھ گیا سڈنی کی فلائٹ کا انتظار کرنے لگا۔ میرا دو دن کا ملبورن کا انتہائی مصروف اور مختصر قیام اس بات کے لیے تو قطعاً ناکافی ہے کہ ملبورن شہر پر کوئی تبصرہ کیا جاسکے۔ لیکن جو کچھ سنا اور جو کچھ اس مختصر وقت میں دیکھا اس لحاظ سے واقعتاً یہ ایک بہترین شہر تھا۔

ملبورن آسٹریلیا کا دوسرا بڑا شہر ہے جس کی آبادی 45 لاکھ ہے۔ یہ دنیا کے پانچ بہترین

شہروں میں سے ایک شہر ہونے کا اعزاز بھی رکھتا ہے۔ میں جب مرکز شہر آیا تو اس کی بلند و بالا عمارات نے پہلی دفعہ کسی شہر کا تاثر پیدا کیا۔ ورنہ اس سے قبل میں جس علاقے میں رہ رہا تھا یا جہاں کہیں بھی گیا تھا وہ مضافاتی بستیاں تھیں۔ یہ مضافاتی بستیاں بہت پرسکون علاقے تھے جہاں پر کشادہ گھر بنے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے مجھے بتایا کہ حال میں ہونے والے امیگریشن کے سبب یہاں تیزی سے آبادی میں اضافہ ہوا اور نئی نئی بستیاں بنتی چلی جارہی ہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اگلے دو عشروں میں ملبورن سڈنی کو پیچھے چھوڑ کر آسٹریلیا کا سب سے بڑا شہر بن جائے گا۔

یہاں مسلمان بھی کافی ہیں، مگر زیادہ انڈین یا عرب ہیں۔ پاکستانی دس ہزار کے لگ بھگ ہوں گے۔ مگر سب ہی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ کئی مساجد اور اسکول بھی ہیں۔ ہم نے جس مسجد میں فجر پڑھی وہاں اسکول بھی تھا جس میں تقریباً سولہ سو بچے پڑھتے تھے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی اسکول تھے۔

آسٹریلیا میں لوگوں کا رویہ اسی طرح پروفیشنل ہے جس طرح مغربی دنیا کے کسی اور ملک میں ہوتا ہے۔ بورڈنگ جن خاتون نے کی انھوں نے دیکھا کہ میرا بیگ کا ہینڈل ٹوٹ گیا ہے تو اس پر سرخ رنگ کا ٹیپ چڑھا دیا تا کہ سامان اٹھانے والے محتاط رہیں۔ انھوں نے ہمیں آگے جانے کا راستہ بھی تفصیل سے سمجھا دیا۔ جہاز پر چڑھتے وقت جن خاتون نے بورڈنگ پاس چیک کیا۔ انھوں نے شلوار قمیض پہنے دیکھ کر مجھے غیر ملکی سمجھا اور بہت گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مغرب میں ہر شخص کا رویہ ہر معاملے میں سو فیصد درست یا پروفیشنل ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مجموعی قومی مزاج ایسا ہی ہے اور اسی سے قوم کے حالات سنورتے یا خراب ہوتے ہیں۔ یہ اجتماعی مزاج نظام تعلیم کی درستی سے آتا ہے۔ اس بارے میں

میں نے کئی مقامات سے آن لائن گفتگو کرتے ہوئے بات کی۔ سفرنامے میں بھی اس پر آگے تفصیل سے بات ہوگی۔

خواتین کی خدمت میں ایک تقریر

ملبورن سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی اڑان کے بعد جہاز سڈنی پہنچا۔ اس سفر کی واحد منفرد بات یہ تھی کہ زندگی میں پہلی دفعہ ان خواتین کو ائیر ہوسٹس کی خدمات سرانجام دیتے دیکھا جنھیں ہمارے محاورے کے مطابق گھروں میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا چاہیے یا پھر اپنے پوتے پوتیوں کو کھلانا چاہیے۔ مغربی خواتین چونکہ یہ دونوں کام نہیں کرتیں، اس لیے یہ محاورے استعمال نہیں ہوسکتے۔ ماشاء اللہ عمریں طویل اور صحت بڑھاپے میں بھی اچھی رہتی ہے، اس لیے لوگ جب تک محتاج نہ ہوجائیں اولڈ ہوم جانا پسند نہیں کرتے۔ شاید اسی لیے ائیر لائن نے ائیر ہوسٹس رکھ لیا کہ مسافروں کو ماماتا کی شفقت سے نواز سکیں۔ یہ ویسے کوئی برا آئیڈیا نہیں ہے۔

اس بات کا ذکر ڈاکٹر ذوالفقار صاحب سے کیا تو انھوں نے کہا کہ پی آئی اے کی ائیر ہوسٹسز بھی ایسی ہی ہوتی ہیں۔ میں اس رائے سے اتفاق نہیں کرسکا۔ ان خواتین کی عمر زیادہ نہیں ہوتی۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ہماری خواتین الحمدللہ اپنی صحت اور فٹنس سے اتنی غافل ہوتی ہیں کہ تیس کے بعد ہی چالیس اور چالیس ہی میں پچاس کی لگنے لگتی ہیں۔

بہت سے شوہر صاحبان نے مجھ سے یہ شکایت کی ہے کہ ان کی بیگمات بچوں کی پیدائش کے بعد بے ڈھنگا ہونا اپنا حق سمجھتی ہیں۔ ان کا یقین ہوتا ہے کہ بچوں کی بیڑیاں پڑنے کے بعد شوہر نے کہیں نہیں جانا۔ سچی بات یہ ہے کہ ہماری خواتین فٹنس کے تصور سے واقف نہیں ہیں۔ ان کا عمومی مشاہدہ صرف یہ ہے کہ ان کے دادا کا انتقال ان کی دادی، نانا کا انتقال ان کی نانی اور ابا کا انتقال ان کی اماں سے پہلے ہوا ہے۔ اس لیے انھیں یقین ہوتا ہے کہ وہ بھی شریعت کے ایک

حکم یعنی عدت کا ثواب حاصل کیے بغیر اس دنیا سے رخصت نہیں ہوں گی۔ چنانچہ وہ ایکسر سائز وغیرہ جیسی مشقتوں کو صرف مردوں ہی کے کرنے کا کام سمجھتی ہیں، گرچہ یہ کام مرد بھی نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ ان کے پکائے ہوئے مرغن کھانے کھا کھا کر مردوں کو دل کا دورہ پڑ جاتا ہے۔اس کے بعد ہی کہیں جا کر مرد حضرات ڈاکٹر کے مجبور کرنے پر کچھ واک وغیرہ شروع کرتے ہیں۔گرچہ بڑھاپے کی واک بڑھاپے کی توبہ کی طرح بہت زیادہ مفید ثابت نہیں ہوتی۔

بات چل نکلی ہے تو دل چاہتا ہے کہ کچھ نازک حدود میں بھی میں قدم رکھ دوں۔ یہ مظلوم شوہروں کے وہ جذبات ہیں جو میرے پاس بطور امانت ہیں۔امانت پہنچانا بہر حال ایک اخلاقی ذمہ داری ہوتی ہے۔خواتین اپنے شوہروں کی دیگر باتوں کی طرح اس بات کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیتیں۔کسی اور کے شوہر کی اس طرح کی باتوں کو سنجیدگی سے لینے کا امکان کہیں زیادہ ہے۔ یہاں یہ عرض اس لیے کر رہا ہوں کہ یہ خاکسار اس طرح کی گفتگو خواتین کی کسی مجلس میں یا کسی اصلاحی یا دینی مضمون میں نہیں کر سکتا۔اس لیے سفرنامے کے بیچ میں قلم پھسل گیا ہے تو اس کے سنبھلنے سے قبل ان چیزوں کا تذکرہ نامناسب نہیں لگتا۔شاید کسی شوہر کا بھلا ہو جائے۔

بات یہ ہے کہ ہماری مستورات صحت کے علاوہ فٹنس کے جمالیاتی پہلو سے بھی ناواقف ہیں۔ جمال اور سنگھار سے ان کے ذہن میں میک اپ اور زیور ہی آتا ہے۔اکثر والدین اب اپنی بچیوں سے گھر کے کام نہیں کراتے۔ باہر کا جنک فوڈ بھی خوب کھلاتے ہیں۔اس لیے بچیاں بچپن ہی سے بے ہنگم ہو جاتی ہیں۔جس کے بعد فٹنس کا خیال صرف اسی وقت آتا ہے جب بچی شادی کی عمر کے قریب پہنچ جائے۔گرچہ اس میں زیادہ زور ایکسر سائز یا واک سے زیادہ بے تکی اور نامناسب ڈائٹ پر ہوتا ہے۔ رشتہ آجائے اور شادی کی ڈیٹ فکس ہو جائے تو یہ عمل اور تیز ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجاتا ہے کہ شوہر نامدار گھونگھٹ اٹھا کر ان کی خدمت میں منہ

دکھائی پیش کرے۔ منہ دکھائی کا یہ محاورہ غالباً کچھ عفت مآب خواتین ہی نے ایجاد کیا تھا۔ مگر اب خواتین اس محاورے کا مطلب یہی سمجھتی ہیں کہ شوہر نے ساری زندگی منہ ہی دیکھنا ہے......

ویسے آگے بڑھنے سے قبل یہ بھی توجہ دلاتا چلوں کہ منہ دکھائی کا یہ محاورہ اب اردو لغت سے نکال دینا چاہیے۔ اس لیے کہ آج کل کی دلہن بھری مجلس میں منہ ہی نہیں کھول کر بیٹھتی بلکہ یہ کم بخت بیوٹی پارلر والے با اہتمام دلہن کا دوپٹہ کونے پر کروا دیتے ہیں تاکہ سینے پر آویزاں زیوارت اور لباس کا ڈیزائن بھی نظر آتا رہے۔ مجلس صرف خواتین کی ہو تو چلیے ٹھیک ہے، مگر مخلوط مجالس میں یہ بے ہودگی بہت بری لگتی ہے۔ شوہر تو بنی سنوری دلہن کا منہ اور دیگر اعضاء بعد میں دیکھتا ہے، پوری مجلس اور خاص کر ووڈیو اور تصویر بنانے والے دلہن کا قریبی معائنہ پہلے ہی کر لیتے ہیں۔

بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ بس اسی منہ دکھائی کی دیر ہوتی ہے، خواتین پر سے فٹنس کا بخار ایسا اترتا ہے کہ ساری زندگی دوبارہ نہیں چڑھتا۔ یہاں تک کہ آخری دفعہ منہ دکھانے کا وقت آ جاتا ہے۔ جس کے بعد موصوفہ چار کندھوں پر سوار دنیائے فانی کو چھوڑ کر دنیائے باقی کی طرف رخصت ہو جاتی ہیں۔ اس امید کے ساتھ کہ جہنم میں گئے تو وہاں چاہے آگ کا عذاب ہو، ایکسر سائز کی مشقت میں تو اللہ میاں بھی نہیں ڈالیں گے۔ اور جنت گئے تو وہاں ایکسر سائز کی کوئی ضرورت ویسے ہی نہیں ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ جو لوگ جنازے کو کندھا دیتے ہیں وہ اس ویٹ لفٹنگ کے بعد کئی دن تک درد کی گولیاں کھا کر موصوفہ کے ساتھ اپنے لیے بھی دعائے مغفرت کرتے رہتے ہیں۔

میری ناقص رائے میں خواتین کو اس صورتحال کا الزام دینا زیادہ مناسب نہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ ہمارا مذہب اور مشرقی روایات ہیں جن میں عریانی کو پسند نہیں کیا جاتا۔ سو تصور یہ بن گیا ہے کہ جس کو چھپانا ٹھہرا اس کو سنوارنا کیسا۔ یہ بات تو اپنی جگہ سو فیصد درست ہے کہ عریانی

فواحش میں داخل ہے اسی لیے حرام ہے۔ مگر یہ خاکسار تو میاں بیوی کے تعلق کے پہلو سے اس پر توجہ دلا رہا ہے۔ میں نے میاں بیوی کے تعلق میں اس پہلو کی کمزوری کی وجہ سے کتنے خاندانوں کو ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے یا باہمی محبت وانسیت کو کم سے کم تر ہوتے دیکھا ہے۔ ورنہ شوہر کی بے رغبتی تو اب عام سی بات ہے۔ اسی لیے اس بات پر توجہ دلا رہا ہوں۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں جسمانی فٹنس صحت کے پہلو سے زیر بحث رہتی ہے نہ جمال کے پہلو سے۔ باقی رہا شوہر تو جیسا کہ عرض کیا کہ اس کے بارے میں بیگمات یہ تصور کر لیتی ہیں کہ اس کے پاؤں میں تو بچوں کی بیڑیاں پڑ چکی ہیں، اس نے کہاں جانا ہے۔ خیر خلاصہ اس طویل تقریر کا یہ ہے کہ معزز خواتین !اس دنیا میں ایک چیز فٹنس بھی ہوتی ہے۔ صحت کے پہلو سے نہ سہی جمالیات کے پہلو ہی سے اس کو مسئلہ بنا لیجیے۔ خاص کر ایک ایسے دور میں جب آپ کے شوہروں کی نگاہوں کو ہر قدم پر امتحان کا سامنا کرنا پڑتا ہو۔ خدارا ان کا امتحان آسان کیجیے۔ اسے اور مشکل نہ بنایئے۔

سالن روٹی والی قوم

تفنن برطرف مگر غیر سنجیدہ اس لیے ہونا پڑا کہ خواتین کو سنجیدگی کے ساتھ اس معاملے کی نزاکت پر متوجہ نہیں کیا جا سکتا۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ جدید دنیا میں صحت اور فٹنس ہر شخص کی زندگی کا اہم مسئلہ ہے۔ لوگ اس کے لیے واک اور ایکسر سائز کو معمول بناتے ہیں۔ سڈنی کے بزنس ڈسٹرکٹ میں دیکھا کہ لنچ کے وقت میں بھی لوگ جاگنگ کرتے پھر رہے ہیں۔ فٹنس کے متعلق اس حساسیت کی وجہ یہ ہے کہ لوگ جانتے ہیں کہ زندگی صرف سانسوں کی آمدورفت کا نام نہیں۔ یہ صحت اور توانائی سے بھرپور اور اعضا وقویٰ کے طویل عرصے تک فعال رہنے سے عبارت ہے۔

اس مقصد کے لیے مغربی دنیا میں لوگوں نے ایکسر سائز ہی نہیں بلکہ پورا لائف اسٹائل اس طرح اپنا لیا ہے کہ اس کے نتائج صحت پر بہت اچھے ہوتے ہیں۔ ساری مغربی دنیا میں صبح خیزی کی عادت ہے۔ دن کا اختتام سورج ڈوبتے ہی ہو جاتا ہے۔ لوگ جلدی کھانا کھا کر جلد سو جاتے ہیں۔ آرگینک (Organic) فوڈ عام ہو رہی ہے۔ جنک فوڈ بری سمجھی جاتی ہے۔ سلاد اور تازہ غذائیں خوراک کا مستقل جزو ہیں۔

جبکہ ہمارے ہاں کھانے کا مطلب مرغن کھانوں کے ساتھ روٹی کھانا ہے۔ اردو میں کھانے کے لیے سالن روٹی اور روٹی کھانے کے اسالیب اسی حقیت کا بیان ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ روٹی صرف کاربو ہائیڈریٹ کا نام ہے جس کی موجودہ غیر فعال لائف اسٹائل میں کوئی زیادہ ضرورت نہیں رہی۔ یہ صرف موٹاپا پیدا کرتی ہے۔ جبکہ ہمارا سالن تیل اور مصالحہ جات سے بھرپور ہوتا ہے جس کی صحت میں زیادہ اہمیت نہیں۔ بلکہ تیل موٹاپے کا اور مرچ مصالحے پیٹ کی تیزابیت کا سبب بن جاتے ہیں۔ مغرب میں عام طور پر کھانے کیسے ہوتے ہیں، اس کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ پرتھ کی یونیورسٹی آف ویسٹرن آسٹریلیا میں ایک روز ڈاکٹر جیمز مجھے اپنے ایک کولیگ کے ہمراہ لنچ پر لے گئے۔ میں نے مچھلی کا آرڈر دیا تو سادہ مچھلی کا ایک بڑا سا ٹکڑا بھرپور سلاد کے ساتھ پیش کر دیا گیا۔ جبکہ باقی دونوں حضرات کا کھانا بھی بالکل سادہ تھا۔ نہ روٹی، نہ تیل، نہ مصالحہ جات۔ البتہ پروٹین، وٹامن اور دیگر صحت مند اجزا سے بھرپور۔

چالیس کے بعد

اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کو اتنی غیر معمولی صلاحیت دی ہے کہ وہ جوانی میں ہمارے سارے ظلم وستم کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیتا ہے جو بری لائف اسٹائل، مرغن غذا اور ورزش نہ کر کے اس کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ مگر چالیس کے بعد صورتحال خراب ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ شوگر،

بلڈ پریشر، گیسٹرک، ہارٹ کی بیماریاں اور دیگر امرض اسی لیے ہمارے ہاں اتنے عام ہو چکے ہیں۔ جو کاروبار اس وقت سب سے زیادہ ترقی پر ہے وہ میڈیسن اور ہسپتالوں کا کاروبار ہے۔ اس کی وجہ یہی ہمارا ناقص لائف اسٹائل ہے جو چالیس کے بعد ہم سب کو کسی نہ کسی پہلو سے مریض بنا کر رکھتا ہے۔ یہ نہ بھی ہو تب بھی ہم اس طاقت اور توانائی سے محروم رہتے ہیں جو زندگی کو فعالیت اور جسمانی صحت اور ذہنی مسرت سے ہمکنار رکھتی ہے جو اس خاص پہلو سے اہل مغرب کی زندگی کا خاصہ ہے۔

سڈنی اور اندھیرے اجالے کا فرق

ڈیڑھ گھنٹے کی فلائٹ کے بعد سڈنی پہنچا تو ائیر پورٹ پر ڈاکٹر ذوالفقار صاحب کو منتظر پایا جو کہ میرے اصل میزبان اور المورد آسٹریلیا کے بانی، منتظم اعلیٰ، مدرس و معلم سب کچھ ہی تھے۔ بنیادی طور پر وہ ایک انجینئر تھے اور آسٹریلیا آ کر انھوں نے ماسٹرز اور پھر پی ایچ ڈی کر رکھا تھا۔ ذوالفقار صاحب کو تقریباً دس برس بعد دیکھا تھا مگر ان کو پہچاننے میں مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ ان کے ساتھ زاہد مرزا صاحب اور عبدالوحید صاحب بھی موجود تھے۔ زاہد مرزا صاحب تو ائیر پورٹ ہی سے چلے گئے البتہ عبدالوحید صاحب گھر تک ساتھ گئے اور ہم ڈنر تک ان کی صحبت سے مستفید ہوئے۔

میں جمعے کو سڈنی پہنچا تھا اور اگلے اتوار تک ذوالفقار صاحب کے ساتھ ہی رہا۔ ان کی فیملی پاکستان گئی ہوئی تھی۔ اس لیے اس عرصے میں صبح مجھے اٹھانے سے لے کر ناشتہ بنانے اور کپڑے دھونے سے لے کر انھیں استری کرنے کی سروس بھی انھوں نے ہی فراہم کی۔ ان میں سے استری والا کام میں نے بعد میں خود اپنے ذمہ لے لیا تھا۔

ذوالفقار صاحب کے ہاں پہنچا تو ارد گرد اندھیرا ہونے کی وجہ سے کچھ اجاڑ و ویران محسوس

ہوا۔مگر صبح بیدار ہونے کے بعد دن کی روشنی میں جب اس علاقے کو دیکھا تو یہاں کی کیفیت ہی بدلی ہوئی تھی۔ یہ ایک انتہائی خوبصورت اور سرسبز علاقہ تھا۔ان کا گھر اس علاقے کی سب سے بلند جگہ پر تھا اس لیے دور دور تک کا منظر یہاں سے نظر آتا تھا۔

رات اور دن کے فرق نے تاثرات میں جو فرق پیدا کیا وہ اس بات کی ایک علامتی مثال ہے کہ انسان کی جہالت اور تعصّبات ایک تاریکی کی مانند ہوتے ہیں۔ یہ تاریکی باہر نہیں انسان کے اپنے اندر ہوتی ہے۔ اندر کی اس تاریکی کے ساتھ انسان کتنی ہی خوبصورت اور شاندار سچائی کو پالے، اسے ہمیشہ اس سے وحشت اور اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔خارج کے اندھیرے دور کرنا خدا کی ذمہ داری ہے۔اس مقصد کے لیے وہ ہر روز سورج طلوع کرتا ہے۔مگر اندر کا اندھیرا دور کرنا انسان کی اپنی ذمہ داری ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جس امتحان میں ڈالا گیا ہے وہ یہی ہے کہ اسے سچائی کو قبول کرنا ہے۔اور سچائی کو اندر کا اندھیرا دور کیے بغیر کبھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔

لائیو وڈیو اور معیار زندگی

یہ علاقہ مجھے بہت پسند آیا۔ میری خواہش تھی کہ یہاں سے بھی ایک لائیو وڈیو بنا کر فیس بک کے احباب کے ساتھ شیئر کروں۔مگر مسلسل مصروفیات کی وجہ سے اس کا موقع نہیں مل سکا۔ یہاں تک کہ سڈنی سے رخصت ہونے کا موقع آگیا۔ائیر پورٹ روانگی سے قبل ذوالفقار صاحب نے کہا کہ یہ کام کر ہی لیں۔ چنانچہ میں نے اس موقع پر لوگوں کے ساتھ وہاں کی وڈیو شیئر کی تھی۔

اس وڈیو میں اور دیگر مواقع پر بھی میں نے جو توجہ دلائی وہ یہ تھی کہ یہ علاقہ بلکہ آسٹریلیا کے تمام علاقے جہاں میں گیا اپنی سہولیات کے لحاظ سے پاکستان کی اپر کلاس کے علاقوں سے بہتر

تھے۔لوگوں کی بنیادی ضروریات یعنی تعلیم اور صحت حکومت کے ذمہ ہیں۔انفرا سٹرکچر اور امن و امان ہر اعتبار سے بہت بہتر اور معیاری ہے۔اس کے بعد جو شخص محنت کرے گا وہ با آسانی ایک اچھا معیارِ زندگی حاصل کر لے گا۔ چنانچہ ہر جگہ میں نے یہ دیکھا کہ لوگوں کے پاس اچھے گھر ہیں۔بہترین گاڑیاں ہیں۔ضرورت اور سہولت کا ہر سامان اور ہر مشین ہے۔

میرے لیے نہ مغرب نیا ہے نہ یہ معیار زندگی۔مگر میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں کئی برس بعد کسی مغربی ملک میں آیا تھا۔ان دس پندرہ برسوں میں پاکستان پست سے پست ہوتا چلا گیا اور مغربی ممالک بہتر سے بہتر ہو گئے۔ بلکہ بہت سے مسلم ممالک جیسے ترکی اور ملائشیا وغیرہ ترقی کی راہ پر ہم سے بہت آگے نکل گئے۔اس لیے تقابل کر کے بہت زیادہ تکلیف ہوئی۔

اس کی وجوہات بہت سادہ ہیں۔ ہماری دانشور کلاس نے عام آدمی کے مسائل کو قوم کا اصل مسئلہ نہیں بنایا۔ایران و توران کے سارے مسائل، علمی و فکری بحثیں، نظریاتی تشخص کے مسائل اور اسٹیبلشمنٹ اور سیاستدانوں کے تعلقات وغیرہ جیسی چیزیں ہی ہماری فکری کلاس میں زیر بحث رہتی ہیں۔اچھا یہ مباحث کریں تو فکری سطح پر کریں۔تا کہ کوئی حل تو نکلے۔مگر یہ مباحث جذباتی انداز فکر کے ساتھ ہوتے ہیں۔جس کے بعد کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکل پاتا۔ ہاں اس عمل میں عام آدمی کے مسائل زیر بحث آنے سے رہ جاتے ہیں۔ باقی عام آدمی کے مسائل سے ہٹ کر دانشور کلاس کو جو مسائل اصلاً زیر بحث لانے چاہئیں، بدقسمتی سے ان کو ابھی اس کا علم ہے اور نہ دلچسپی۔ ان مسائل کو جاننے کے لیے ملکی سیاست اور ذاتی مفادات وتعصّبات سے بلند ہونا پڑتا ہے۔ یہ بات شاید ابھی ہماری دانشور کلاس کو سیکھنی ہے۔

عام آدمی کے مسائل

عام آدمی کے مسائل جو کہ اصلاً قوم کے بنیادی مسائل ہیں وہ کیا ہیں۔ یہ کہ اچھی تعلیم کے

مواقع قوم کے ہر بچے کو مفت میسر ہوں۔ مفت علاج معالجے کی سہولت ہر شخص کو ملے۔ امن و امان اور عدل ہر شہری کو ملے۔ ملک کا انفرا سٹرکچر اعلیٰ سطح پر بنایا جائے۔ شفاف انتخابات کا عمل مسلسل جاری رہے تا کہ حکمرانوں کا احتساب جاری رہے۔

یہ ہیں عام آدمی کے مسائل۔ فکری اور نظری مباحث ان مسائل کے حل ہونے کے بعد اچھے لگتے ہیں۔ جس طرح ترکی اور ملائشیا وغیرہ نے اپنے ابتدائی مسائل حل کر لیے تو اب وہاں یہ چیزیں زیر بحث آئیں تو ان کی کوئی جگہ بنتی ہے۔ مگر ہمارے فکری قیادت نے عوام کو بے حد جذباتی بنا دیا ہے۔ ایک جذباتی بات کی جاتی ہے اور بے چارہ عام آدمی اپنے مسائل بھول کر ملک کی نظریاتی اساس اور امت کے عالمگیر مفاد جیسی چیزوں میں الجھا رہتا ہے۔ ہاں جب بھی موقع ملتا ہے، لوگ امیگریشن لے کر کسی مغربی ملک میں سیٹ ہونے یا مشرق وسطیٰ میں ملازمت کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر اپنے ذاتی مسائل حل کر کے یہی فکری تقریریں دوبارہ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا پر شروع کر دیتے ہیں۔ باقی لوگ ذاتی زندگی میں کرپشن، قانون کی پامالی اور ہر سطح پر بے اصولی کا مظاہرہ کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ ہر محفل میں فکری مباحث کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ یوں قوم کی صورتحال مجموعی طور پر ہر گزرتے دن کے ساتھ بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ حال یہ ہے کہ کراچی جیسا شہر جو ستر کی دہائی تک لندن اور نیویارک کے مقابلے کا تھا، اب کچرا دان بن چکا ہے۔ یہ غالباً موجودہ تاریخ کا پہلا واقعہ ہے کہ دنیا کا کوئی بڑا شہر بغیر کسی جنگ کے اس طرح تباہی کے دہانے پر آ کھڑا ہوا ہوگا۔ ورلڈ بینک کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق کراچی دنیا کے دس کم ترین معیار کے شہروں میں سے ایک بن چکا ہے۔

سڈنی شہر

ملبورن میں جمعے کو چھٹی تھی۔ اس لیے وہاں پروگرام ہوا تھا۔ ہفتہ اتوار کو آسٹریلیا میں چھٹی ہوتی ہے اور پیر کو بھی چھٹی تھی۔ اس لیے اب ان تین دنوں میں یہاں مسلسل پروگرام تھے۔ مگر میرے لیے پہلا مرحلہ آرام کا تھا۔ چنانچہ تین راتوں کے بعد میں نیند بھر کے سویا۔ بلکہ فجر کے بعد دوبارہ سو گیا اور کافی دیر سے اٹھا۔ ذوالفقار صاحب کا گھر بلندی پر ہونے کی بنا پر ٹھنڈی ہواؤں کی زد میں تھا۔ لیکن دو کمبلوں اور ہیٹر کی بنا پر سردی کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ گرچہ گھر سے باہر جب بھی نکلا، سرد ہواؤں نے مشکلات پیدا کیں۔

ہفتے کو پہلا پروگرام ایک ڈنر کے بعد خطاب کا تھا۔ چنانچہ عصر پڑھ کر ہم گھر سے روانہ ہوئے اور پہلی دفعہ دن کی روشنی میں سڈنی شہر کو دیکھا۔ ہر جگہ خوبصورتی، صفائی اور جمالیات کے مظاہر تھے۔ سڈنی کا شہر آسٹریلیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔ اس کی آبادی پچاس لاکھ کے قریب ہے۔ آسٹریلیا کی بیشتر آبادی ان شہروں میں ہے جو سمندر کے کنارے آباد ہیں۔ میں پہلے ملبورن میں تھا جو جنوبی کنارے پر تھا جبکہ سڈنی مشرقی کنارے پر ہے۔ آسٹریلیا کی دو کروڑ چالیس لاکھ آبادی میں سے تقریباً ایک کروڑ انھی دو شہروں میں مقیم ہے۔

ذوالفقار صاحب کا گھر مرکز شہر سے دور ایک مضافاتی علاقے میں تھا۔ اسے ماؤنٹ اینن کہا جاتا ہے۔ یہ ایک انتہائی پرسکون علاقہ تھا جس کے بالکل قریب ہی آسٹریلین بوٹونیکل گارڈن کے نام کا وسیع و عریض پارک تھا۔ وقت کی کمی کی بنا پر ہم یہاں نہ جاسکے اور بس ایک روز کہیں جاتے ہوئے گاڑی ہی سے ذوالفقار صاحب نے اسے دکھا دیا تھا۔ ویسے میرا تاثر تو یہ تھا کہ ان کا گھر جس علاقے میں ہے وہ بھی درختوں اور سبزے کی کثرت کی بنا پر کسی گارڈن سے کم نہیں۔

ان کے گھر کے پاس ایک دوسری سیرگاہ بھی بنی ہوئی ہے۔ اس میں چھوٹی سی ایک جھیل اور واک کرنے والوں کے لیے ٹریک بھی ہے۔ یہاں گھر کافی کشادہ ہیں۔ تقریباً چھ سو گز کے۔ ہر

گھر سنگل اسٹوری ہوتا ہے جس کی چھت ہٹ کے طریقے پر ترچھی بنی ہوتی ہے۔ ہر گھر میں گارڈن ہونا اور کچھ جگہ چھوڑنا بھی لازمی ہے۔

بلند و بالا عمارات صرف مرکز شہر میں تھیں اور اس کے اردگرد چھوٹے چھوٹے علاقے رفتہ رفتہ بسائے گئے تھے۔ سڈنی اور آسٹریلیا کے دیگر شہر اسی اصول پر بسائے گئے تھے کہ ایک مرکز شہر تھا اور پھر نواحی بستیوں میں آبادی پھیلتی چلی گئی۔ ذوالفقار صاحب کا گھر مرکزِ شہر سے دور واقع ایسی ہی ایک نواحی بستی میں تھا۔ مگر یہ بستیاں موٹر وے جنھیں یہاں فری وے کہا جاتا ہے، کے ذریعے مرکز شہر اور دیگر علاقوں سے متصل تھے۔ یہ فری وے سگنل فری راستے تھے جن کے ذریعے سے دور کا سفر بھی آسان ہو جاتا تھا۔ فری وے کے راستے میں جہاں کہیں بستی آتی وہاں دیواریں کھڑی کر دی جاتیں کہ بستی کے مکیں ٹریفک کے شور سے ڈسٹرب نہ ہوں۔

یہی شاید ہمارے اور مغرب کے موازنے کا ایک درست مقام ہے۔ ہم اونچی دیواریں چور، ڈاکوؤں اور دہشت گردوں سے بچنے کے لیے بناتے ہیں۔ اہل مغرب بستیوں کے گرد دیواریں ٹریفک کے شور سے بچنے کے لیے بناتے ہیں۔ ہمارے ہاں جان، مال اور آبرو کے تحفظ کے لالے پڑے ہوئے ہیں اور وہاں زور نوائز پولوشن (Noise Pollution) اور دیگر ماحولیاتی آلودگیوں سے بچنے پر ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ ہمارے ہاں وہ وقت کب آئے گا جب ہم بستیوں کے گرد دیواریں جان، مال، آبرو کے تحفظ کے لیے نہیں بلکہ شور سے بچنے کے لیے بنائیں گے۔ شاید جب ہم غیر ضروری جذباتیت سے باہر آ کر امن اور ترقی کی قدر و قیمت جان لیں گے تو ہمارے ہاں بھی یہ سب کچھ ہونے لگے گا۔

گمراہی کے داخلے پر پابندی

آج میرا خطاب رات کے کھانے کے ساتھ ہونے کی بنا پر ریسٹورنٹ میں تھا۔ راستے میں

ذوالفقار صاحب نے مغرب کی نماز ترکوں کی بنائی ہوئی ایک مسجد میں پڑھوائی۔ اس مسجد میں ایک بڑی دلچسپ بات دیکھی۔ وہ یہ کہ مغرب کے بعد ایک ساتھ تین حلقہ درس ہو رہے تھے۔ ایک تو ترکوں کا تھا۔ دو ہماری طرف کے تھے۔ ان میں سے ایک دیوبندی مکتبِ فکر کی تبلیغی جماعت کا تھا اور دوسرا بریلوی مکتبِ فکر کی دعوت اسلامی کا۔

یہ بات اس اعتبار سے بہت اچھی تھی کہ مسلمانوں کی مساجد میں تمام مسلمان اہل علم کو اپنی بات کہنے کی اجازت ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں تو مساجد دیوبندی، بریلوی اور اہل حدیث مساجد میں تقسیم ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ دوسرے فرقے کا کوئی فرد وہاں درس دے سکے۔ اس لیے اس پہلو سے یہ بات بڑی قابل تحسین تھی کہ سب کو اللہ کے گھر میں اپنی بات کہنے کی آزادی تھی۔ مگر اس کی وجہ یہ تھی کہ مسجد ترکوں کے زیر انتظام تھی۔ اگر ہمارے کسی گروپ کی ہوتی تو مجال تھی کہ کسی دوسرے ''گمراہ'' اور ''بددین'' گروپ کو وہاں داخلے کی اجازت مل جاتی۔

دنیا بھر میں یہی طریقہ ہے اور یہی ہمیشہ سے مسلمانوں میں رہا ہے کہ مساجد سماج کا مشترکہ اثاثہ ہوتی ہیں اور حکومت کے زیر انتظام ہوتی ہیں۔ تمام اہل علم کو مساجد میں اپنی بات کہنے کی آزادی ملنا چاہیے اور لوگوں کی مرضی ہو کہ وہ جس کی چاہیں بات سنیں۔

تاہم یہاں ہونے والے برصغیر کے مسلمانوں کے دو الگ الگ حلقے اس بات کا صاف اشارہ تھے کہ آخر کار ان کی مسجدیں الگ الگ ہی بننا ہیں۔ اور بننے کے بعد دوسرے گروہ کا وہاں داخلہ ممکن نہیں رہے گا۔ آخر کسی ''گمراہی'' کو ہم ''اپنے لوگوں'' تک پہنچنے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔ دنیا بھر میں برصغیر کے مسلمانوں نے ملک سے باہر جا کر یہی کیا ہے۔ آسٹریلیا میں استثنیٰ کا کیا سوال تھا؟

گیلی پولی

اس مسجد کا نام گیلی پولی مسجد تھا۔ گیلی پولی کا نام ترکی اور آسٹریلیا دونوں کے لیے ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر ترکی کے محاذ کی سب سے بڑی جنگ یہیں لڑی گئی تھی۔ جس میں حملہ آور اتحادی فوجوں کو ترکوں نے مصطفیٰ کمال کی قیادت میں آٹھ ماہ کی طویل اور شدید جنگ کے بعد شکست دی تھی۔ اس جنگ میں ہزاروں آسٹریلوی فوجی جو اتحادیوں کی طرف سے جنگ میں شریک تھے مارے گئے تھے۔ اس بنا پر آسٹریلیا کی تاریخ میں بھی یہ جگہ اہم ہوگئی ہے۔ 25 اپریل کے دن کو جب اتحادی فوجوں نے گیلی پولی پر حملہ کیا تھا، آسٹریلیا میں قومی تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ گیلی پولی کا نام اسی لیے آسٹریلیا میں بہت معروف تھا اور اسی پس منظر میں مسجد کا نام گیلی پولی رکھا گیا تھا۔

یہ بھی بڑی اہم اور قابل توجہ بات تھی کہ جس محاذ پر ان کو شکست ہوئی تھی، اس کو انھوں نے اپنی یادگار بنالیا تاکہ غلطیوں سے سیکھیں۔ دوسری طرف ہماری تاریخ میں سولہ دسمبر موجود ہے جب سقوط ڈھاکہ ہوا تھا۔ اصولاً ہمیں اسے اپنا قومی دن بنالینا چاہیے تاکہ ہم اپنی غلطیوں سے سیکھیں۔ یہ سیکھیں کہ لسانی تعصّبات، علاقائیت اور کسی قومیت کے لوگوں کے ساتھ ناانصافی کے نتائج کیا نکلتے ہیں۔ مگر ہمیں غلطیوں سے سیکھنے کا سبق نہیں دیا جاتا ہے بلکہ جھوٹے فخر میں جینا سکھایا جاتا ہے۔

دو عالمی جنگوں کا سبق

مغرب کس طرح سبق سیکھتا ہے اس کو ایک اور مثال سے سمجھیں۔ مغربی اقوام دنیا کے تین براعظموں پر حکمران ہیں۔ یعنی یورپ، امریکہ اور آسٹریلیا۔ مگر اصلاً مغربی اقوام کا مرکز یورپ ہی تھا۔ یہ یورپ پہلی اور دوسری عظیم جنگوں میں بری طرح تباہ ہوگیا اور کروڑوں لوگ مارے گئے تھے۔ ان دو جنگوں سے پوری مغربی دنیا نے ایک سبق سیکھا تھا۔ وہ یہ کہ جنگ بہت بری چیز ہوتی

ہے۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ستر برس کے عرصے میں ان تین براعظموں پر کوئی جنگ نہیں ہوئی ہے۔ (خیال رہے کہ یوگوسلاویہ کے ٹوٹنے کے بعد وہاں ہونے والا فساد ایک مقامی مسئلہ تھا جسے مغربی طاقتوں نے مداخلت کر کے فوراً ختم کرا دیا تھا) نیشنل اسٹیٹ ہونے کے باوجود یہ لوگ باہمی طور پر امن کے ساتھ رہتے ہیں اور سارے وسائل عام آدمی کی ترقی کے لیے وقف ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ ان کے باہمی اختلاف نہیں ہیں۔ مگر یہ اختلاف کے باوجود مل کر رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور یورپ کی حد تک انھوں نے یورپی یونین بھی بنالی ہے۔ بدقسمتی سے برصغیر کے دو ممالک یعنی انڈیا اور پاکستان نے پچھلے ستر برسوں میں چار جنگیں لڑیں۔ جبکہ بھارت نے پانچویں جنگ چین کے خلاف لڑی۔ پاکستان کی پانچویں جنگ افغانستان پر روس کے حملے کے بعد پچھلی چار دہائیوں سے جاری ہے۔ اس جنگ نے پاکستان کے سماجی ڈھانچے کو تباہ کر دیا ہے۔ منشیات اور اسلحے کو ہمارے ہر گلی کوچے میں پہنچا دیا ہے۔ فرقہ واریت اور مذہبی انتہا پسندی کو ہمارے رگ و پے میں اتار دیا ہے۔ دہشت گردی نے ہمارے بازاروں اور گھروں کو خوف اور خون سے بھر دیا ہے۔

ایمان و اخلاق کے بغیر

اس کے باوجود بھی ہم کوئی سبق سیکھنے کو تیار نہیں۔ ہم یہ بات سمجھنے کے لیے تیار نہیں کہ ہم فوجی اعتبار سے ہی نہیں بلکہ ایمان و اخلاق کے اس پہلو سے بھی بدترین درجے پر ہیں جہاں خدا کی مدد آتی ہے۔ ہمارے ہاں لوگ ایمان کے بجائے فرقہ واریت اور تعصّبات کے اسیر ہیں۔ ہمارے مذہبی طبقات سے لے کر عام لوگوں تک سب اخلاقی اعتبار سے بہت کمزور جگہ پر کھڑے ہیں۔ اس کی تفصیل میں کیا بیان کروں۔ سب کو معلوم ہے۔

ایسے میں اصل کام ایمان واخلاق اور علم وشعور کے فروغ کی کوشش کرنا ہے۔ مادی اور ایمانی طور پر اتنی کمزور قوم میں جنگ کا صور پھونکنا اس کی تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ اس تباہی کی تفصیل کہیں اور نہیں پڑھ سکتے تو میری کتاب آخری جنگ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے حوالے سے پڑھ لیں۔

پیش گوئیوں میں درست رویہ

بہت سے لوگ جنگ کا صور پھونکنے کے لیے بعض پیش گوئیوں کا سہارا لیتے ہیں۔ ان کی خدمت میں یہی عرض ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ضعیف اور موضوع روایات کی بنا پر کچھ منسوب کرنا ہر اعتبار سے ایک غلط عمل ہے۔ یہ تو خود مذہبی طور پر ایک جرم ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے اس طرح کی روایات بیان کی جائیں۔

باقی جو صحیح روایات ہیں ان میں درج پیش گوئیوں پر آپ یقین رکھتے ہیں تو ضرور رکھیے۔ مگر اس میں بھی صحیح راستہ یہ ہے کہ ان کے پورا ہونے کا انتظار کیجیے۔ پیش گوئی کسی واقعے کے ظہور کی کی جاتی ہے تو خود بخود پوری ہو جاتی ہے۔ جیسے عرب میں بلند و بالا عمارات کے ظہور کی وہ پیش گوئی جو سرکار دوعالم نے کی اور مکمل طور پر پوری ہوگئی۔ پیش گوئی کسی شخصیت کے آنے کی کی جاتی ہے تو یہ صرف اس شخصیت کا حق ہے کہ وہ آئے اور پھر اپنی دعوت پیش کرے۔ کسی اور کو یہ حق نہیں کہ اس کے نام پر کھڑا ہو کر لوگوں کو بلانا شروع کر دے۔ اس کی مثال حضرت عیسیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ دونوں کی آمد کی پیش گوئیاں موجود تھیں۔ آپ آئے اور اپنی دعوت پیش کی۔ کسی اور کا حق نہیں تھا کہ وہ ان کی آمد سے قبل ہی دوسروں کو ان کے نام پر کسی قسم کی جنگ کے لیے اٹھانا شروع کر دیں۔

پچھلوں کے بوجھ

اس کے ساتھ ہم ایک دوسری بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ قرآن مجید نے صحابہ کرام کو ایک دعا سکھائی تھی۔ وہ یہ کہ پروردگار ہم پر وہ بوجھ مت ڈال جو تو نے پچھلوں پر ڈالے تھے۔ نہ وہ بوجھ جن کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں، (البقرہ 286:2)۔ اسی دعا کا نتیجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے عرب کی شدید دشمنی اور ان کی طرف سے مسلط کی گئی جنگوں کے باوجود ان پر غلبہ حاصل ہو گیا اور اس عمل میں صرف دو تین سو مسلمان شہید ہوئے۔ جبکہ پچھلی دو صدیوں میں بلا مبالغہ لاکھوں مسلمان مارے جا چکے ہیں۔

اس دعا کے مطابق ہونا تو یہی چاہیے کہ شہادت حق کے لیے جو قربانی صحابہ کرام نے دی، آج کے مسلمانوں سے اس سے کہیں کم قربانی لے کر ان سے شہادت حق کا وہی کام کرایا جائے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اب وہ سارے لوازمات جمع کر چکے ہیں جن کی بنیاد پر مسلمان عملاً ایک جان کا نقصان کیے بغیر بھی دنیا پر شہادت حق دینے کا کام کر سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ مسلمان پہلے حق کو اختیار تو کریں۔ شہادت دینے کا مرحلہ تو بعد میں آتا ہے۔

قرآن مجید کی عظمت

ڈنر میں میرا خطاب قرآن مجید کی عظمت کے حوالے سے تھا۔ سورہ رحمٰن کی ابتدائی آیات کی روشنی میں خواتین و حضرات کے سامنے میں نے یہ عرض کیا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت کا ظہور ہے۔ قرآن کی شکل میں انسانوں کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ عزت دی ہے جو کسی اور مخلوق کو نہیں دی۔ اللہ تعالیٰ کی بلند شان کے سامنے یہ کسی مخلوق کی اوقات نہیں کہ وہ اسے مخاطب کریں۔ شہنشاہ کائنات کے سامنے بے کس مخلوق کی کیا حیثیت کہ اسے مخاطب کیا جائے۔ یہ عزت گنتی کے چند فرشتوں اور چند انبیا کو ملی ہے۔

مگر قرآن مجید کی شکل میں یہ عزت اب انسانوں کو مستقل طور پر دے دی گئی ہے کہ ان کو

مخاطب کرکے اپنا کلام ان کے لیے نازل کیا گیا۔ مگر ہم لوگ اس عظیم کتاب کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں وہ نہ صرف عظمت قرآن اور دی جانے والی عزت سے بے خبری کا ثبوت ہے بلکہ ایک بہت بڑا جرم ہے۔ پھر میں نے قرآن مجید کی اصل دعوت جو آخرت میں نجات اور اِس دنیا میں اپنے تزکیہ کے حوالے سے ہے، اس کا کچھ بیان کیا۔ یہ بتایا کہ دین کا ہر حکم کس طرح اصلاً انسانی شخصیت کے تزکیے اور اسے بہتر بنانے کے لیے دیا گیا ہے۔ لیکچر کے بعد ڈنر اور پھر سوال وجواب کا سیشن ہوا۔

نصرت دین

اگلے دن المورد سڈنی کے ممبران کو ڈاکٹر ذوالفقار صاحب نے گھر پر بلا رکھا تھا۔ آج ایک تربیتی نشست تھی جس کا موضوع نصرت دین تھا۔ میں نے کھانے سے پہلے اور بعد کے دو سیشنز میں اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی کہ نصرت دین کے کتنے عظیم اور کس قدر آسان مواقع انسانی تاریخ میں پہلی اور آخری دفعہ پیدا ہو چکے ہیں۔

میں نے یہ واضح کیا کہ انسانی تاریخ اپنے اختتامی مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ ختم نبوت کے بعد یہ مسلمانوں کی ذمہ داری تھی کہ ان کے ذریعے سے دین حق کا پیغام دنیا تک پہنچے۔ مگر مسلمان اپنے علمی اور اخلاقی زوال کی بنا پر مغربی اقوام کے غلام بن چکے تھے۔ انیسویں صدی میں مغربی اقوام نے انسانی تاریخ میں پہلی دفعہ الحاد کو اتنے بڑے پیمانے پر فروغ دے کر خدا کے خلاف اعلان بغاوت کر دیا تھا۔ ان کی گرفت کرنے سے قبل ان پر درست بات واضح کرنا ضروری تھی۔

چنانچہ سب سے پہلی بیسویں صدی کے آغاز پر پے در پے ایسی سائنسی دریافتیں سامنے آئیں جنھوں نے انیسویں صدی کے مادی نظریات کے پرخچے اڑا دیے۔ یہ یقین ختم ہو گیا کہ

کائنات ازلی اور غیر فانی مادی وجود ہے جس کے بارے میں سائنس سب کچھ بتا سکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی پہلی جنگ عظیم برپا ہوگئی۔ یہ عظیم تباہی اہل یورپ کے لیے ایک وارننگ تھی۔ جب وہ باز نہ آئے تو دوسری جنگ عظیم میں ان پر شدید تر تباہی مسلط کر دی گئی۔

اسی تباہی سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی آزادی کا انتظام کیا اور پورا عالم اسلام آزاد ہو گیا۔ مسلمانوں کو سیاسی آزادی دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو تیل کی دولت دے کر معاشی طور پر آزاد کر دیا۔ ان کو وہ جغرافیہ دیا کہ وہ دنیا کے وسط میں رہ کر امت وسط ہونے کی ذمہ داری احسن طریقے سے نبھا سکیں۔ وہ فوجی طور پر کمزور تھے، اس لیے سوویت یونین اور مغرب کے ٹکراؤ کے پچاس سالہ دور میں ان کو ایک مکمل وقفہ امن اور وقفہ تعمیر دیا گیا کہ وہ اپنے معاشرے کی تعمیر اسی طرح کر لیں جس طرح مثال کے طور پر مشرق بعید کے ممالک جاپان، کوریا وغیرہ نے کی۔

بدقسمتی سے مسلمانوں نے ان تمام عظیم مواقع کو ضائع کر دیا۔ جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے انفارمیشن ایج کو شروع کر دیا۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ایک صدی پہلے امام فراہی کے ذریعے سے قرآن مجید کی بنیاد پر دین کو واضح کرنے کا ایک عمل شروع کیا تھا جو اب اپنے منتہائے کمال پر پہنچ چکا ہے۔ اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے دین کی اصل دعوت یعنی ایمان، اخلاق اور شریعت اور اس کی ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتمام حجت کو مکمل طور پر واضح کر دیا ہے۔ اب گنتی کے کچھ لوگ بھی قرآن وسنت کی اس اصل دعوت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اتمام حجت کو پوری دنیا کو سمجھا سکتے ہیں۔ اس عمل کے ساتھ ہی انسانیت پر شہادت حق کا کام پورا ہو جائے گا۔ یہی اب نصرت دین کا بہت بڑا کام ہے۔

ریڈیو انٹرویو

اسی دوران میں ایک مقامی ریڈیو کی اردو نشریات کے لیے میرا انٹرویو لیا گیا۔ اس میں کئی

سوالات کیے گئے۔ میں نے اس انٹرویو میں خاص طور پر یہ توجہ دلائی کہ مسلمانوں کا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ان کی دینی تعلیم میں کسی قسم کا کوئی انحراف ہو چکا ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ دین کی اصل تعلیم کے ساتھ دین ہی کے نام پر غیر مطلوب چیزوں کو مطلوب بنا کر بیان کیا جا رہا ہے۔ یا غیر اہم چیزوں کو اہم ترین بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کی اصلاح کرنا اور دین کی اصل دعوت کو پیش کرنا ایک بہت بڑا کام ہے۔

ایک اور سوال یہ تھا کہ مقامی مسلمان اپنے بچوں کی تربیت کیسے کریں۔ میں نے یہ عرض کیا کہ آپ کا بچہ آپ ہی سے سیکھتا ہے۔ اس لیے جیسا اسے بنانا چاہتے ہیں، گھر کے اندر اسے ویسا ہی بن کر دکھائیں۔ زبانی باتوں اور دلی خواہشات سے کچھ نہیں ہونے کا۔

ایک سوال یہ تھا کہ مقامی مسلمان آسٹریلیا اور اپنے ملک سے وفاداری کے بیچ میں کیا راستہ اختیار کریں۔ میں نے یہ عرض کیا کہ آبائی وطن کی محبت اور اس میں دلچسپی ایک فطری چیز ہے۔ اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن نئے وطن کے حوالے سے انسان پر جو اصل ذمہ داری ہے وہ یہ ہے کہ جس ملک میں رہتا ہو وہاں کے قانون کی پابندی کرے۔ اس حوالے سے جو ذمہ داریاں عائد ہوں ان کو پورا کرے۔ جہاں رہتے ہیں ان لوگوں سے محبت کرے اور ان سے خیر خواہی کا رویہ اختیار کرے۔

نصرت دین کا اجر

کھانے کے بعد دوسرا سیشن ہوا۔ اس سیشن میں نصرت دین کے اجر پر گفتگو کی گئی۔ میں نے یہ عرض کیا کہ انسانی وجود خواہشوں کا ایک لامحدود سمندر ہے جس میں لذت و سکون کی ختم نہ ہونے والی پیاس ہے۔ موجودہ دنیا اس لذت و سکون کا ایک تعارف تو ہے لیکن اس کی مکمل تسکین کا ذریعہ نہیں ہے۔ یہ تسکین صرف قیامت کے بعد قائم ہونے والی جنت کی اس دنیا ہی میں ممکن

ہے جسے اللہ تعالیٰ عنقریب بنانے والے ہیں۔ اُس آنے والی دنیا میں دو درجات ہیں۔ ایک درجہ عام لوگوں کا ہے اور دوسرا خاص درجہ ان لوگوں کا ہے جو غیر معمولی قربانی دے کر دین کے تقاضے پورے کریں۔ اُس خاص درجہ کو پانا ایک بہت مشکل کام ہے۔ لیکن موجودہ دور میں اس کے حصول کا سب سے آسان راستہ نصرت دین کا کام ہے۔

اللہ کے دین کو ہر دور میں عام انسانوں کی نصرت کی ضرورت رہی ہے۔ اس نصرت کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ اپنے دین کے لیے انسانوں کے محتاج ہیں۔ ان کا کام ان کے فرشتے کرتے ہیں۔ لیکن وہ انسانوں میں سے چندلوگوں کو یہ عزت دینا چاہتے ہیں کہ کل قیامت کے دن وہ قرآن مجید کے الفاظ میں ''انصاراللہ'' یعنی اللہ کے مددگار کہلائے جائیں۔ وہ اس راہ میں خرچ کریں اور اللہ کو قرض حسنہ دینے والے قرار پائیں۔

اس کام کا اجرا اتنا ہے کہ کوئی الفاظ نہ اس کا احاطہ کر سکتے ہیں، نہ کوئی پیمانہ اس کو ناپ سکتا ہے۔ اس کے لیے بس ایک ہی تعبیر اختیار کی جاسکتی ہے۔ یہ وہ تعبیر ہے جو صحابہ کرام کے لیے قرآن مجید نے اختیار کی اور آج کے دن تک ان کو اسی نسبت سے پکارا جاتا ہے۔ یعنی اللہ ان سے راضی ہوگیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو جنت کے بلندترین اور خاص درجات میں بسایا جائے گا۔

موجودہ دور میں نصرت دین کا کام بے حد آسان ہو چکا ہے جیسا کہ قرآن مجید اپنی اس دعا سے یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ پروردگار ہم پر وہ بوجھ مت ڈال جو تو نے پچھلوں پر ڈالے تھے۔ نہ وہ بوجھ جن کو اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں، (البقرہ 286:2)۔ یہ دعا صحابہ کرام کو نصرت دین کے کام ہی کے پس منظر میں سکھائی گئی تھی۔ آج یہ کام کرنے والوں کا راستہ صحابہ کرام سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ مگر اس کے لیے بہرحال کچھ نہ کچھ قربانی دینی ہوگی اور وہ قربانی اپنے

تعصّبات کی ہے۔ یعنی تعصّبات سے بلند ہو کر حق کو دریافت کیا جائے۔ پھر خواہشات کی قربانی دے کر اپنے پیسے، وقت اور صلاحیت کے ایک حصے کو اس کام کے لیے وقف کیا جائے۔ اس کے لیے انسان کو معیارِ زندگی بلند کرنے کی ختم نہ ہونے والی دوڑ سے نکل کر ایک جگہ ٹھہرنا ہوگا اور دین کی مدد کو اپنا ذاتی مسئلہ ایسے ہی بنانا ہوگا جیسے بیوی، بچوں اور خاندان کے مسائل کو انسان ذاتی مسئلہ سمجھتا ہے۔ عملی طور پر اس کام کا مطلب یہ ہے کہ ایمان و اخلاق کی دعوت کو اپنی ذاتی زندگی بنانے اور دوسرں تک ایمان و اخلاق کی اس نبوی دعوت کو پہنچانے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ جن اہل علم نے اس کام کے لیے زندگی داؤں پر لگادی ہے ان کی مدد کی جائے۔ یہی کرنے کا اصل کام ہے۔

باربی کیو کلچر

یہ تربیتی نشست دن بھر کی تھی جس میں تقریر کے علاوہ سوال و جواب بھی تھے۔ اس کے علاوہ دوپہر کے کھانے میں باربی کیو کا انتظام تھا۔ مسلسل مرغن کھانے کھا کر میرا نظام ہاضمہ خراب تھا اس لیے مجھے بھوک نہ تھی۔ چنانچہ ملبورن کی طرح یہاں بھی میں اس نعمت سے محظوظ نہ ہوسکا۔ ویسے بھی میں پاکستان سے بقرہ عید کے بعد آیا تھا اور سالانہ باربی کیو کی تمام محفلیں نمٹا کر ہی آیا تھا۔ لیکن یہاں احباب نے بتایا کہ باربی کیو قربانی کے بعد پوری کی جانے والی ایک سالانہ رسم نہ تھی بلکہ عام زندگی کا ایک حصہ تھی۔ گھروں کے لان میں باربی کیو انگیٹھیوں کا مستقل اہتمام تھا۔ جبکہ عام طور پر پارکوں میں بھی انگیٹھیاں لگی ہوتی تھیں۔

ملبورن میں جمعہ کے خطاب کے بعد جو باربی کیو ہوا تھا وہاں بھی انگیٹھیاں نصب شدہ تھیں۔ دیگر پارکوں میں بھی میں نے یہ انگیٹھیاں مستقل لگی دیکھی تھیں۔ مجھے یہ بتایا گیا کہ باربی کیو کے لیے مصالحہ لگا ہوا تیار گوشت ملتا ہے اور اسے بس انگیٹھی پر بھوننا ہوتا ہے۔

اس طرح کی تفریحات کے لیے ہر جگہ اور علاقے کا اپنا کلچر اور طریقہ ہوتا ہے۔ میں نے سعودی عرب میں یہ کلچر عام دیکھا تھا کہ سعودی حضرات پکنک منانے کے لیے صحرا میں چلے جاتے ہیں۔ وہاں خیمے لگائے جاتے ہیں اور کئی خاندان وہاں رات بھر ٹھہر کر تفریح کرتے ہیں۔ جبکہ بڑی شاہراہوں اور ہائی وے کی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ کھانا کھانا بھی سعودی کلچر تھا۔

ذوق جمال، ذوق لطیف اور اسلام

تفریح، اچھا کھانا پینا اور جمالیات کا ذوق انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ اسلام نے ان میں سے کسی چیز پر بھی پابندی نہیں لگائی ہے۔ تاہم راہبانہ تصورات میں اس طرح کی چیزوں کو بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ عام لوگوں کے لیے تو اس طرح کی چیز پھر گوارا کر لی جاتی ہے، مگر دنیا بھر کے اہل مذہب کے لیے یہ چیز بہت معیوب سمجھی جاتی ہے۔ ان کی تو شان ہی یہی سمجھی جاتی ہے کہ اس طرح کی چیزوں سے بہت دور رہتے ہیں۔ بہت ہوا تو شادی بیاہ اور بیوی بچوں کی اجازت کو مذہب کا منتہائے کمال سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس کے بعد ہر وقت چہرے پر سنجیدگی، آواز میں رقت، لباس میں درویشی ہی کو اصل دینداری سمجھا جاتا ہے۔

جبکہ اسلام کا تصور اس کے بالکل برعکس ہے۔ قرآن میں کبھی سیدنا سلیمان کی شان پڑھ لیجیے۔ اللہ نے انھیں کیا کچھ دیا تھا اور اس سے وہ دیگر نیکیوں کے ساتھ ذوق جمال کے لیے کیا کچھ کرتے تھے۔ دیگر چیزیں نہ سہی مگر وہ محل تو قرآن کے ہر طالب علم کو یاد ہوگا جس میں داخلے کے وقت اُس کی صناعی سے ملکہ سبا بھی چکرا گئی تھیں۔

اس سے آگے بڑھ کر قرآن مجید میں ایک مقام ایسا ہے، اور یہ وہ مقام ہے جسے میں نے ''قرآن کا مطلوب انسان'' نامی کتاب میں خاص طور پر شامل کیا، جس میں حلال وحرام کی اصولی

کیٹگری بیان کرنے سے قبل اللہ تعالیٰ نے ایک معرکۃ الآرا سوال اٹھایا ہے۔ یہ آیات اتنی اہم ہیں کہ ان کو دہرانا ضروری ہے۔ ارشاد ہے:

''اے بنی آدم! ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ اور پیو، اور اسراف نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا، اے رسول ان سے پوچھو، کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دی ہیں۔ کہو، یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی اہل ایمان کے لیے ہیں، اور قیامت کے دن تو خالصتاً انہی کے لیے ہوں گی۔ اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔ اے نبی کہہ دو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے حیائی کے کام، خواہ کھلے ہوں یا چھپے، اور حق تلفی، اور ناحق زیادتی، اور اس بات کو حرام ٹھہرایا ہے کہ تم کسی چیز کو اللہ کا شریک بناؤ جس کی اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری، اور یہ کہ تم اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کا تمھیں علم نہ ہو۔''

(الاعراف 7:31-33)

یہ ہے اسلام کا وہ تصور جو بہت سے مسلمانوں کے لیے بھی اجنبی ہے۔ کھانا، پینا، خوبصورتی، زینت، جمالیات کی تسکین۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ نعمتیں تو اللہ نے بنائی ہی اہل ایمان کے لیے ہیں۔ تاہم امتحان کی غرض سے اس دنیا میں نافرمانوں کو بھی ان سے روکا نہیں جاتا، مگر قیامت کے دن ان کو محروم کر کے یہ نعمتیں اہل ایمان کے لیے خاص کر دی جائیں گی۔

دوسری طرف ہمارے ہاں کسی دینی شخص کے لیے ذوق جمال، ذوق لطیف اور ذوق مزاح کا ہونا تو ایسا اجنبی تصور ہے کہ کچھ حد نہیں۔ ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ کھانے پینے کی ممانعت نہیں۔ اسراف کی ممانعت ہے بلکہ سخت ممانعت ہے۔ ذوق جمال کی تسکین کی ممانعت نہیں، البتہ فحاشی و

بدکاری کی سخت ممانعت ہے۔ ذوق مزاح کی ممانعت نہیں، مگر لوگوں کی تذلیل اور تحقیر کی سخت ممانعت ہے۔ یہی اسلام کا وہ توازن ہے جو اس کو دین فطرت بناتا ہے۔

دہشت گرد ابو یحییٰ

اگلے دن ویسٹرن سڈنی یونیورسٹی میں پبلک پروگرام تھا۔ میں وہاں پہنچا تو رجسٹریشن ڈیسک پر موجود ہمارے احباب نے بتایا کہ سیکیورٹی کے لوگوں نے ابو یحییٰ نام کے شخص کا پروگرام دیکھا تو فوراً آ گئے۔ بقول ان کے ابو یحییٰ تو ایک دہشت گرد تھا۔ تاہم اس امید کا اظہار کر کے وہ لوٹ گئے کہ منتظمین کسی دہشت گرد کو علانیہ یونیورسٹی میں نہیں بلا سکتے۔

میں ابو یحییٰ اللیبی نام کے صاحب سے واقف تھا جو افغانستان میں امریکی ڈرون حملے کا نشانہ بنے، لیکن یہاں آ کر یہ معلوم ہوا کہ میرے ہم کنیت دو افراد اور بھی ہیں اور بدقسمتی سے دونوں کا تعلق اسی خطے سے تھا۔ ایک کا تعلق انڈونیشیا سے تھا، وہ بھی انڈونیشی سیکیورٹی فورسز کا نشانہ بن چکے ہیں۔ دوسرے ابو یحییٰ جن کے لیے سیکیورٹی کے لوگ آئے تھے، وہ ایک آسٹریلوی ہیں۔ وہ آسٹریلیا چھوڑ کر داعش کے پاس عراق چلے گئے اور اس وقت داعش کے ساتھ عراق میں موجود ہیں۔

میرے نزدیک جو لوگ اپنی جانیں دینے کے لیے تیار ہو جائیں وہ بڑے مخلص ہوتے ہیں۔ کم از کم ان لوگوں سے بہت بہتر ہوتے ہیں جو خود مزے کی زندگی گزارتے ہیں اور دوسرے کو جنگ و جدل پر ابھارتے رہتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جب ایسے لوگوں کو یہ بتایا جائے گا کہ آج کے دور میں اللہ نے ان کے لیے آسانی پیدا کر دی ہے اور دین پر غلبے کی جس جدوجہد کے لیے وہ جانیں دینے پر تیار ہیں، وہ غلبہ بغیر جان دیے اور اپنی ذات، خاندان اور قوم کو تباہ کیے بغیر اللہ تعالیٰ ویسے ہی دینے کے لیے تیار ہیں تو یقیناً بہت لوگ اس بات کو سنیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم دو سو برس سے ایک غلط راستے پر چل رہے ہیں۔ ختم نبوت کے بعد دنیا کو حق ہمارے ذریعے سے پہنچنا ہے۔ اگر ہم ایمان و اخلاق کی پیغمبرانہ دعوت میں پست ہوں گے تو یہ کام نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ جب یہ صورتحال پیدا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جھنجھوڑنے کے لیے غیر مسلموں کو ان پر غلبہ دے دیتے ہیں۔ یہی انھوں نے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا اور یہی پچھلی دو صدیوں سے مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں ۔ ایسے میں کرنے کا اصل کام ایمان و اخلاق کی صدا کو پوری قوت سے بلند کرنا ہوتا ہے۔ اس سزا پر اپنی اصلاح کے بجائے اگر غیر مسلموں سے ٹکرانے کی کوشش کی جائے گی تو اللہ کی سزا اور سخت ہو جاتی ہے۔ اس بات کی پوری تفصیل، استدلال، تاریخ میں نے اپنے ناول ''آخری جنگ'' میں بیان کیا ہے۔

بدقسمتی یہ ہے کہ میرا یہ ناول پچھلے دو ناولوں کے برعکس اشاعت کے لحاظ سے مکمل ناکام ثابت ہوا ہے۔ بعض لوگوں نے تو مجھے صاف فیڈ بیک دیا ہے کہ اس سے قبل وہ میرے ناول اور کتب پڑھتے اور پھیلاتے تھے، مگر اب وہ یہ ہرگز نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی غلط فکر کے اثرات ہیں جو اپنی اصلاح کے لیے تیار نہیں۔ تاہم میں نے اس ناول میں یہ صاف بتا دیا ہے کہ اس راستے پر چلنے کا آخری انجام وہی ہے جو یہود کے ساتھ بخت نصر اور ٹائٹس رومی نے کیا تھا اور مسلمانوں کے ساتھ اس سے قبل تاتاری کر چکے ہیں۔

انبیاء کے صحائف میں یہ بالکل صاف بیان ہوا ہے اور قرآن مجید نے اس کی تصدیق و تائید کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود پر ایمان و اخلاق کی پامالی کے جرم میں پہلے مغلوبیت مسلط کی۔ پھر انبیاء کے ذریعے سے صحیح راستے کی طرف توجہ دلائی۔ لیکن ان کی بات رد کر دی گئی تو پھر یہ مغلوبیت سخت ترین سزا میں بدل گئی۔ اس سزا میں جیسا کہ میں نے اس ناول میں توجہ دلائی ہے کہ بہت بڑا قتل عام ہوتا ہے۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگ قتل کر دیے جاتے ہیں۔ پوری قوم کو صفحہ

ہستی سے مٹادیا جاتا ہے۔

مجھے اس بات کا سخت ترین اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف ایسی ہی کوئی عظیم سزا تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ مسلمان اس دنیا میں حق کے گواہ ہیں۔ وہ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں کے قائم مقام ہیں۔ انھیں ایمان واخلاق اور دعوت سے دنیا پر حق کی گواہی دینا ہے۔ یہ کام اگر وہ نہیں کریں گے تو غداری کے مرتکب ہوں گے۔ خاص کر اہل عرب اور ہمارے جیسے وہ لوگ جو دنیا میں اسلام کے نام پر کھڑے ہیں، ان کے لیے کوئی رعایت نہیں ہوگی۔ ان کو بس ایک ہی رعایت دی جاسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اٹھا کر صحیح بات بالکل کھول کر بتادیتے ہیں۔ اس کے بعد بھی لوگ نہ مانیں تو خدا کا قہر بھڑکتا ہے۔ میں اللہ کے قہر سے اس کی پناہ مانگتا ہوں، لیکن اگر انتہا پسند گروہ باز نہ آئے اور باقی مسلمان خاموش رہے تو مستقبل قریب میں ایسی کسی عظیم تباہی کا آنا ناگزیر ہے۔ اس سے قبل تاتاریوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ اسی سنت الٰہی کا ظہور تھا۔ جب وسط ایشیا سے لے کر مشرق وسطیٰ تک کے مسلمان تباہ و برباد ہو گئے تھے۔

کاش اے کاش......

میں نے اس بات کو بہت تفصیل سے اپنی کتاب ''آخری جنگ'' میں بیان کیا ہے۔ یہاں بہت اختصار سے اس کے ایک اور پہلو کی طرف توجہ دلا رہا ہوں۔ وہ یہ کہ لوگ کچھ اور نہیں سمجھتے تو یہی دیکھ لیں کہ دوسو برس سے مغرب کے غلبے کے خلاف جو جدوجہد وہ کررہے ہیں، اس کا کیا انجام ہوا ہے۔ ہوا صرف یہ ہے کہ برطانیہ عظمیٰ گیا تو امریکہ آ گیا۔ سوویت یونین گیا تو اگلی صدی میں یہی خدمت سرانجام دینے کے لیے چین آجائے گا۔ مسلمان مغلوب سے غالب نہیں ہوں گے۔ ان پر غلبہ حاصل کرنے والی قوم بدل جائے گی اور کچھ نہیں ہوگا۔ مسلمانوں کی یہ مغلوبیت کسی کی سازش نہیں ہے، ایمان واخلاق کو پامال کرنے کے جرم کی وہ سزا ہے جو اللہ نے مسلط

کردی ہے۔جب تک یہ سزا حالات کی زبان ، قرآن کے فیصلوں اور تاریخ کے بیانات میں چھپی رہی تو مغلوبیت کی شکل میں مسلط رہی۔مگر جب لوگ ایمان واخلاق کی دعوت قبول کرنے کے بجائے اس راہ کی طرف بلانے والوں کے دشمن ہوجائیں۔لوگوں کو اس سزا کی نوعیت اور وجوہات کھل کر سمجھائی جائیں اور وہ سمجھنے کے بجائے سمجھانے والوں کا جینا دوبھر کردیں، ان کو نفرت اور ملامت کا ہدف بنالیں۔انھیں بے گھری، جلاوطنی اور قتل وتعذیب کا سامنا کرنا پڑے تو پھر سزا کا وہ مرحلہ شروع ہوتا ہے جس کی زد میں آکر پوری پوری قومیں عبرت کا نشان بن جاتی ہیں۔یروشلم، بغداد اور اندلس اِسی سزا کے مقامات ہیں۔کاش بخت نصر، رومیوں اور تاتاریوں کے ہاتھوں لکھی جانے والی یہ داستان لاہور، تہران، جدہ اور قاہرہ میں دوبارہ نہ دہرادی جائے۔کاش افغانستان، عراق اور اب شام کی تباہی کے بعد مسلمان ہوش کے ناخن لے لیں۔کاش مسلمان اپنی مظلومیت کا رونا بند کرکے اپنے جرائم کی اصلاح شروع کردیں۔کاش اے کاش......

دونام دوعلامتیں

ایسے میں بس ایک امید ہے کہ مسلمانوں ہی میں سے کچھ لوگ ایسے پیدا ہوجائیں جنھیں خدا کا خوف ہو۔وہ پوری قوت کے ساتھ اس آنے والے والے طوفان سے اپنی قوم کو خبردار کرنے کے لیے اٹھ جائیں۔وہ حق کی شہادت اپنے عمل اور قول سے دینا شروع کردیں۔اگر ایسا ہوگیا تو اللہ تعالیٰ بہت کریم ہیں۔وہ مسلمانوں کو ایک موقع ضرور دیں گے۔یہی اُس روز میری تقریر کا موضوع تھا۔ میں نے مسلمانوں پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو تفصیل سے بیان کیا۔

آخر میں سوال جواب کے موقع پر میں نے دہشت گرد ابو یحییٰ والی بات سنا کر سامعین کو یہ توجہ دلائی کہ انھیں اپنی شناخت دہشت گرد ابو یحییٰ سے داعی ابو یحییٰ بنانی ہے۔یہ دو ابو یحییٰ ظاہر

ہے کہ شخصیات نہیں بلکہ علامتی نام ہیں۔ ایک نام آسٹریلیا سے اپنی پرتعیش زندگی چھوڑ کر دہشت کا مشن چلانے کے لیے عراق چلا گیا اور دوسرا کینیڈا کی شہریت چھوڑ کر دعوت کا مشن چلانے کے لیے پاکستان آ گیا۔ پہلا نام اس بات کی علامت ہے کہ غیر مسلموں سے جنگ کر کے انھیں جہنم واصل کیا جائے۔ دوسرا اس بات کی علامت ہے کہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت پہنچا کر انھیں جنت میں پہنچایا جائے۔ پہلا مسلمانوں کے قومی غلبے کے لیے لڑ رہا ہے۔ دوسرا یہ بتا رہا ہے کہ مسلمانوں پر ان کے رب نے ایمان و اخلاق اور شہادت حق کی جو ذمہ داری عائد کی ہے، مسلمان وہ ادا کریں گے تو ان کا غلبہ یقینی ہے۔ پہلا گروہ حالات کا تجزیہ کر کے یہ بتا تا ہے کہ غیر مسلموں کا غلبہ ان کی سازش کا نتیجہ ہے۔ دوسرا قرآن مجید، سنت انبیا اور تاریخ سے یہ بتا تا ہے کہ مسلمانوں کی مغلوبیت خدا کی طرف سے مسلط کی جانے والی سزا ہے۔

مسلمانوں نے پچھلے دو سو برس سے پہلے گروہ کی رہنمائی کو قبول کیا ہے۔ جس کے بعد لاکھوں لوگوں نے زندگیاں بھی لگائیں اور جانیں بھی دیں۔ مگر دو سو برس سے مغلوبیت کی یہ تاریک رات ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ مسلمان ایک دفعہ اس دوسری آواز کو بھی سن لیں۔ انشاءاللہ دو تین عشروں میں مسلمانوں کا غلبہ یقینی ہے۔ ورنہ اتنی ہی مدت میں مسلمان تیار رہیں۔ ان کے ساتھ وہ ہوگا کہ دنیا پر حق کی شہادت خود ہی قائم ہو جائے گی۔ دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ کائنات کا خدا کتنا زندہ اور فعال ہے اور جو کچھ اس نے اپنی کتاب میں لکھا ہے، وہ ختم نبوت کے بعد بھی کس طرح اسے پورا کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یعنی جس طرح اس نے پرانے مسلمانوں یعنی یہود کو عبرت کا نشان بنایا تھا، وہ نئے مسلمانوں کو بھی اسی طرح پہلے سے بتا کر عبرت کا نشان بنانے کی کیسی قدرت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کو حق کی شہادت تو دینا ہے۔ اب ان کی مرضی ہے کہ جوتے کھا کر اپنے وجود سے حق کی گواہی دیں یا سچائی کو قبول کر کے اپنے قول و فعل سے یہ گواہی

دیں۔ مسلمان جو فیصلہ کریں گے، ویسا ہی جواب ان کو مل جائے گا۔

اس بات کا ایک انسانی اور نفسیاتی پہلو وہ ہے جو اصولاً اسی وقت بیان کرنا چاہیے۔ لیکن چونکہ اول تو یہ بات طویل ہوگئی اور دوسرے اصلاً یہ ڈسکشن پرتھ میں ڈاکٹر جیمز کے ساتھ ہوا تھا اس لیے اس کو وہیں پر انشاء اللہ زیر بحث لاؤں گا۔

امید افزا بات

میری بات سے کسی کو کوئی مایوسی نہیں ہونی چاہیے۔ ایسا نہیں ہے کہ لوگ اس دوسری آواز کو نہیں سن رہے۔ یہ خاکسار خود اس بات کی مثال ہے کہ اس نے پہلے نقطہ نظر پر کھڑے ہونے کے باوجود آج سے پچیس برس پہلے اس آواز کو جو اُس دور میں بالکل اجنبی تھی سنا اور حق جان کر قبول کرلیا۔ یہ خاکسار تو محض ایک طالب علم ہے جس نے خدا کے ان بندوں کی صدا کو سنا جس کا علامتی ذکر پیچھے گزرا اور اس نے اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اس صدا پر لبیک کہا۔ اب تو بہت لوگ ہیں جو اس بات کو سن رہے ہیں۔ مگر چونکہ اول تو یہ آواز زیادہ مانوس نہیں۔ دوسرا الزام و بہتان کی ایک دھول ہے جو اس دعوت کو دینے والوں کے خلاف اٹھا دی گئی ہے۔ جس کے نتیجے میں عام لوگ گھبرا جاتے ہیں۔ مگر زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ اس آواز کی سچائی اور توانائی ہر دل پر انشاء اللہ ضرور دستک دے گی۔

اس وقت بھی میں جن لوگوں کے ساتھ موجود تھا وہ اس بات کی سچائی کا ایک زندہ ثبوت تھے۔ میرے میزبان ذوالفقار صاحب کا پس منظر بھی یہی تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر میں آگے کروں گا۔ جبکہ ملبورن کے عبدالشکور صاحب بھی اسی بیک گراؤنڈ سے آئے تھے اور اپنے خاندانی پس منظر اور ماحول سے الگ ہو کر ایک جدا راستہ اختیار کرلیا تھا۔ انشاء اللہ یہ بات پھیلے گی اور اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ خدا کے قہر کے بجائے ہم خدا کی رحمت کا تجربہ کریں گے۔ ان ربی رحیم

حمید ودود۔

پرانی یادیں پرانے احباب

اس تقریر میں عمران بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ علوم اسلامیہ کی طالب علمی کے زمانے میں میرے جونیئر تھے۔ان کی اہلیہ عائشہ بھی میری جونیئر تھیں۔اب یہ خوبصورت جوڑا سڈنی ہی میں مقیم تھا۔عمران کے جونیئر ہونے کے باوجود ان سے بڑے گہرے مراسم تھے اور اکثر ان کے گھر آنا جانا رہتا تھا۔

پروگرام کے بعد عمران مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔راستے میں ان کے ایک کلاس فیلو اور ہمارے مشترکہ دوست سلمان سے جو کینیڈا میں مقیم تھے، انھوں نے فون پر گفتگو کرائی۔سلمان نے کہہ رکھا تھا کہ چاہے رات کے بارہ بج رہے ہوں، جب بھی میں آؤں ان سے فون پر بات کرائی جائے۔یہ گفتگو خدا کی قدرت کا عجیب منظر تھا۔میرے وطن میں صبح ہو رہی تھی، کینیڈا میں رات تھی اور سڈنی میں شام ہو رہی تھی۔ان سے بات کرتے ہوئے اور پرانی یادیں تازہ کرتے ہوئے ہم عمران کے گھر جا پہنچے۔یہاں عائشہ سے ملاقات ہوئی۔ان دونوں کی تین پیاری بچیاں تھیں۔

تھوڑی دیر ہی میں ذوالفقار صاحب اور عبدالوحید صاحب بھی آن پہنچے۔مغرب کی نماز ہم نے ایک قریبی مسجد میں ادا کی۔جس کے بعد حسبِ روایت ایک انتہائی پرتکلف ڈنر تیار تھا۔ کھانے کے ساتھ پرانی یادوں اور باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ کچھ دیر بعد ہم نے اجازت چاہی۔عمران کے ساتھ میں نے عائشہ کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا جنھوں نے بہت اہتمام سے کئی کھانے بنائے تھے۔

سڈنی کا مرکز شہر اور اوپرا ہاؤس

چار مسلسل دن پروگرام کے بعد اب تین دن کا ایک عارضی وقفہ آیا تھا جس کے بعد پھر برسبین، کینبرا اور ایڈیلیڈ میں مسلسل پروگرام تھے۔ گرچہ ان تین دنوں میں بھی ہر رات ڈنر ہوا جس میں کچھ نہ کچھ گفتگو اور سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن اِن تین دنوں میں ہر روز کسی نہ کسی کی ڈیوٹی تھی کہ وہ مجھے سڈنی اور ارد گرد کے علاقے دکھائے۔

پہلے دن کامران مرزا صاحب تشریف لائے۔ کامران صاحب کرنسی کی تجارت کرتے تھے۔ وہ اپنی فیملی کے ہمراہ کئی برس سے یہاں مقیم تھے۔ مرکز شہر یا سی بی ڈی میں ان کا کاروبار تھا۔ مرکز شہر کے ساتھ ہی چونکہ سڈنی کے اہم ترین مقامات یا لینڈ مارک جیسے اوپرا ہاؤس اور ڈارلنگ ہاربر وغیرہ موجود تھے، اس لیے یہ مقامات دکھانا انھی کی ذمہ داری قرار پائی۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں یورپ سے آنے والوں نے پہلی نوآبادی بنائی تھی۔ اس لیے یہاں نئی عمارات کے ساتھ متعدد پرانی عمارات بھی موجود تھیں۔

میں کامران مرزا صاحب کے ہمراہ پہلے مرکز شہر میں واقع ان کے دفتر پہنچا۔ پھر وہاں سے دوپہر کا کھانا کھانے ہم ایک جگہ گئے جہاں حلال برگر دستیاب تھا۔ اس کے بعد ہم پیدل چلتے ہوئے ڈارلنگ ہاربر پہنچے۔ اس کے نام سے کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ ڈارلنگ انیسویں صدی میں اس علاقے کے ایک گورنر کے نام کا جز تھا۔ تاہم یہ علاقہ انٹرٹینمنٹ کا بھی مرکز تھا۔ یہاں مادام تساؤ کا عجائب خانہ، شاپنگ سنٹر، کیسینو، سینما، بحری میوزیم اور ہر طرح کی دیگر تفریحات کا سامان موجود تھا۔

ہم تھوڑی دیر یہاں رکے۔ عین دوپہر کے وقت بھی سرد ہوائیں چل رہی تھیں جو مقامی لوگوں کے لیے تو آمدِ بہار کا ساز ہوں گی مگر اس خاکسار کے وجود کو تلوار کی طرح کاٹ رہی تھیں۔ مگر سڈنی دیکھنے کی یہ قیمت بہر حال دینا تھی۔ خیر یہاں سے ہم ایک سمندری ٹیکسی یعنی کرایہ کی

کشتی میں بیٹھ کراوپرا ہاؤس کی طرف روانہ ہوئے۔ پانی میں جاتے ہوئے ہم مشہور زمانہ ہار بر برج کے نیچے سے گزرے جواوپرا ہاؤس کے ساتھ مل کر سڈنی کا وہ منظر نامہ تشکیل دیتا ہے جو پوری دنیا میں اس شہر کی پہچان ہے۔ کامران مرزا صاحب نے بتایا کہ اسی برج پر نئے سال کی آمد کے موقع پر آتش بازی ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں جب نیا سال شروع ہوتا ہے تو سڈنی ہی دنیا کا پہلا بڑا شہر ہے جہاں سالِ نو کا جشن منایا جاتا ہے۔ اس لیے دنیا بھر کے میڈیا میں یہ برج اور یہ منظر بہت نمایاں طور پر دکھایا جاتا ہے۔

کشتی سے ہم اوپرا ہاؤس پہنچے۔ سڈنی اوپرا ہاؤس دنیا کی معروف اور مشہور ترین عمارات میں سے ایک ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پرفارمنگ آرٹس جیسے تھیٹر، ڈانس، میوزک وغیرہ کا انعقاد ہوتا ہے۔ مگر دنیا میں اس کی اصل وجہ شہرت اس کا منفرد طرز تعمیر ہے اور اس کی تصویر اب دنیا بھر میں سڈنی کی شناخت ہے۔ میں ان سارے مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا جن کو کبھی تصویروں اور ٹی وی میں دیکھا تھا۔ یہ منظر جتنا وہاں حسین تھا، اتنا ہی یہاں بھی حسین تھا۔

ذوق جمال اور شوق ابدیت

میں اس جگہ پر کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ یہ تعمیرات ایسی ہی غیر معمولی اور بے مثل ہیں جیسی مثال کے طور پر تاج محل ہندوستان کی یا اہرام مصر زمانہ قدیم سے مصر کی شناخت بنی ہوئی ہیں۔ اس طرح کی تعمیرات ایک طرف انسان کے ذوقِ جمال کی عکاس ہوتی ہیں اور دوسری طرف انسان کے شوقِ ابدیت کی علامت ہوتی ہیں۔

انسانی شخصیت کے یہی دو پہلو یعنی ذوقِ جمال یا خوبصورتی کو محسوس کرنے کی صلاحیت اور شوق ابدیت یا ہمیشہ زندہ رہنے کی خواہش انسان سے وہ لافانی شاہکار تخلیق کرواتی ہے جو کبھی نہیں مرتے۔ مگر کتنی عجیب بات ہے، یہ شاہکار تخلیق کرنے والا انسان مرجاتا ہے۔ بالکل ایسے

ہی جیسے رنگ برنگ پھولوں کی مہک کو محسوس کیے بغیر اور ان کے جمال سے محظوظ ہوئے بغیر ان کو چر جانے والے جانور مر جاتے ہیں۔

انسان جانوروں کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ یہ جملہ گرامر کے اعتبار سے دنیا کی ہر زبان میں درست ہے، مگر انسان کی نفسیات ایسے ہر جملے کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں کھربوں ستارے ہیں انسان بالکل تنہا ہے۔ اس جیسا کوئی نہیں۔ نادان اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ کائنات میں کہیں نہ کہیں زندگی ضرور ہوگی۔ میں یہ عرض کرتا ہوں کہ زندگی کی بات نہیں ہو رہی، انسان کی بات ہو رہی ہے۔ یہ قرآن بھی بتا دیتا ہے کہ کائنات میں اور جگہ بھی زمین جیسے معاملات ہو رہے ہیں۔ مگر آپ کائنات کو چھوڑیں اور یہ دیکھیں کہ اس کرہ ارض پر لاکھوں انواع واقسام کی مخلوقات موجود ہیں، مگر انسان جیسا کوئی نہیں۔ حیوانی پہلو سے کچھ حیوانات انسان سے قریب ہیں، مگر نفسیاتی طور پر کوئی دور دور تک بھی انسان تک نہیں پہنچتا۔ انسان کا اپنی منفرد نفسیات کے لحاظ سے بالکل تنہا و یکتا ہونا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ انسان ایک خصوصی تخلیق ہے۔ ایسا نہیں ہوتا تو انسان ہی جیسی ارتقا یافتہ کوئی نہ کوئی اور نوع اس کرہ ارض پر ضرور ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ انسان جیسا کوئی دوسرا کیوں نہیں ہے؟

قرآن بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے قالب کو اسی مٹی کے خمیر سے پیدا کیا، مگر پھر اس میں روح پھونکی گئی جو خدا کی طرف سے تھی۔ ہم اس کی حقیقت نہیں جانتے۔ مگر یہ جانتے ہیں کہ اسی روح کا نتیجہ ہے کہ انسان اپنے ذوق کے لحاظ سے خدا کی صفات کا بہت ہی معمولی سہی مگر ایک عکس اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ یہ ذوقِ جمال اور یہ ابدیت کا شعور انسان میں حیوانوں سے نہیں آیا ہے، خدا کی طرف سے آیا ہے۔ حیوان اپنی جبلت سے بلند نہیں ہو سکتے۔ انسان اس جبلت سے بلند ہو کر اپنی منفرد فطرت کی بنیاد پر علم و فن کے معجزے جنم دیتا ہے۔ کوئی دوسرا انسان

اس ذوق اور شعور میں انسان کا شریک نہیں۔ یہی انسان کے خصوصی ہونے کا ثبوت ہے۔

جدید دنیا ارتقا کے نقطہ نظر کو اس لیے نہیں مانتی کہ یہ کوئی معقول نقطہ نظر ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ مذہب کے پیروکاروں نے، بشمول اہل اسلام، اصل الہامی مذہب کی تعلیم کو فراموش کر کے اسے اتنا نامعقول بنا دیا ہے کہ جدید انسان ارتقا کے اس نقطہ نظر کو قبول کر لیتا ہے جو اس کے خیال میں کم نامعقول ہے۔ باقی جتنی کچھ بھی ارتقا کے نظریے میں معقولیت یا واقعیت پائی جاتی ہے، اس پر میں نے اپنی کتاب ''ملاقات'' میں ایک مضمون ''ارتقا اور خارجی رہنمائی'' کے نام سے لکھا ہے۔ یہ تصور جس حد تک درست ہے، خدا کے نہ ہونے کو نہیں بلکہ اس کے ہونے کو ثابت کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح بت پرستی ایک حماقت ہونے کے باوجود صدیوں تک پھیلی رہی، اسی طرح انکار خدا اور انکار آخرت ایک حماقت ہونے کے باجود جدید دنیا میں پھیل گیا ہے۔ مگر انکار خدا ایک بہت بڑا جرم ہے۔ لوگ باز نہ آئے تو اس جرم کی پاداش میں اس دنیا ہی کو ختم کر دیا جائے گا۔

بہت جلد وہ وقت آ رہا ہے جب خدا فراموش انسان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا جائے گا۔ انسان کی بنائی ہوئی تعمیرات بھی اب بہت جلد ختم ہونے والی ہیں۔ قیامت کا زلزلہ سڈنی کے اوپرا ہاؤس سے لے کر آگرہ کے تاج محل اور مصر کے اہرام تک پھیلے جمال و کمال کے ہر مظہر کو ختم کر دے گا۔ مگر اس خاتمے کے ساتھ ہی انسان کی ابدیت کی خواہش کی تکمیل ہو جائے گی۔ انسان کو ہمیشہ جینے کے لیے دوبارہ زندہ کر دیا جائے گا۔ مگر وہاں انسان کا ابدی مستقبل خدا کے ذوق جمال کی جلوہ گاہ یعنی جنت الفردوس یا پھر اس کے غضب کے ظہور کی جگہ یعنی جہنم میں سے کوئی ایک ہو گا۔ بد قسمتی سے اِس دنیا میں انسانوں نے، چاہے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، خدا کو بھول کر جینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ان کو جنت سے محروم کر دیا جائے گا۔ جنت وہ جگہ ہے

جہاں خدا کا ذوق جمال ظاہر ہوگا۔ جہاں حسین مرد و زن کے ذوق جمال کی تسکین کے لیے عالیشان عمارات، ذائقہ دار غذائیں، لذیذ مشروبات، پر لطف محافل، پر کیف مناظر، پر فضا سیر گاہوں کی ایک نئی دنیا آباد کی جائے گی۔ اس دنیا میں لوگ جوانی، صحت، طاقت، توانائی کے ابدی چشموں سے سیراب ہوکر اور ہر خوف و خطرے سے بے نیاز ہوکر ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

جس طرح یہ دنیا اور یہ زندگی ایک حقیقت ہے۔ اسی طرح وہ زندگی یقینی ہے۔ وہ جنت یقینی ہے۔ مگر اس میں داخلے کی شرط یہ ہے کہ انسان خدا کو اپنا سب سے بڑا مسئلہ بنا لے۔ جو یہ نہیں کریں گے ان کا انجام جہنم ہوگا۔ جس میں انسان نہ زندہ رہے گا نہ مرنے پائے گا۔

واش روم کی کنڈی اور من وسلویٰ چھوڑنے والے لوگ

ہم کچھ دیر یہاں رکے اور پھر پیدل ہی چلتے ہوئے واپس کامران مرزا صاحب کے دفتر پہنچے۔ ان کے دفتر ہی سے ہم اپنی اگلی منزل یعنی خالد ادریس صاحب کے گھر دعوت کے لیے پہنچے۔ راستے میں فرخ صاحب کو بھی لیا جو المورد آسٹریلیا کے فائننس سیکریٹری اور پیشے کے لحاظ سے اکاؤنٹنٹ تھے۔ اگلے دنوں میں ان کا بہت ساتھ رہا۔

خالد صاحب کے ہاں پہنچے تو میں نے ڈرتے ڈرتے ان سے واش روم جانے کی درخواست کی۔ میرے ڈرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ واش روم جانا کوئی غیر اخلاقی عمل ہے۔ دراصل ابھی تک تجربہ یہ ہوا تھا کہ گھروں کے اندر واش روم میں کنڈی نہیں ہوتی۔ ملبورن میں عبدالشکور صاحب کے ہاں میں اسے اتفاق سمجھا۔ ذوالفقار صاحب کے ہاں بھی یہی دیکھا تو خیال ہوا کہ یہ کوئی آسٹریلوی رواج ہے۔ یہاں بند دروازہ علامتی طور پر کنڈی کی نشانی ہے اور لوگ اخلاقی طور پر بند دروازے کو کھولنا غلط سمجھتے ہیں۔ مگر میں جس ملک میں رہتا ہوں وہاں اخلاقی پابندی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ کنڈی اور تالا نہ ہو تو لوگ اپنے ہی نہیں پرائے گھر میں بھی گھس جاتے ہیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ کنڈی موجود تھی۔ اس روز پہلی دفعہ اندازہ ہوا کہ باقی نعمتوں کی طرح کنڈی بھی بڑی نعمت ہے۔ مگر انسان کو نعمت کی قدر و قیمت اس سے محرومی کے بعد ہی محسوس ہوتی ہے۔

خالد ادریس صاحب کے ہاں ایک اور نعمت بھی موجود تھی۔ وہ یہ کہ ان کی اہلیہ نے کھانے میں دیگر بہت سی ڈشز کے ہمراہ میری درخواست پر ماش کی دال بھی بنا رکھی تھی۔ ایک ہفتے تک مسلسل مرغن غذا کھانے کے بعد کہیں جا کر دال نصیب ہوئی تھی۔ انھوں نے بنائی بھی بہت مزے کی تھی۔ اس لیے میں نے اس سے پورا انصاف کیا۔ اس کے بعد اگلی دعوتوں میں بھی خواتین نے میری درخواست پر سبزیوں کی ڈش بنائی۔

میرا معاملہ وہی تھا جو بنی اسرائیل کا مصر سے نکلنے کے بعد صحرا نوردی کے وقت تھا کہ اللہ نے انھیں من و سلویٰ دیا مگر وہ حضرت موسیٰ سے یہی فرمائش کرتے رہے کہ ہمیں لہسن، دال، پیاز، ترکاری چاہیے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے من و سلویٰ سے محروم کیے بغیر وہ دال اور سبزی نصیب فرمائی۔

قیامت سے قبل قیامت

خالد صاحب نے میری یادداشت کا بھی امتحان لیا اور ایک ایسے ای میل کے بارے میں پوچھا جو انھوں نے قریباً دس برس قبل مجھے کیا تھا۔ یہ ان کے بچے کی پیدائش کے بعد اس کے ایک آپریشن کے بارے میں تھا۔ انھوں نے مجھ سے دعا کے لیے کہا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے یاد نہیں آیا۔ اگلے روز فرخ صاحب کے ہاں کے ڈنر میں وہ اپنے ساتھ ای میل بھی لے آئے جو انھوں نے مجھے کیا تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ای میل سروس فراہم کرنے والے تمام پرانا ریکارڈ برقرار رکھتے ہیں۔ نہ صرف برقرار رکھتے ہیں بلکہ بہت معمولی سی کوشش سے پرانا ای میل باآسانی نکالا جا سکتا ہے۔ میں نے اس ای میل کو پڑھا۔ اس میں ہماری پوری گفتگو درج تھی۔

اس واقعے میں بہت بڑا اسبق اس حوالے سے تھا کہ اس دنیا میں ہم انسان صرف حال میں جیتے ہیں۔ہم ماضی میں کی ہوئی نیکی بدی، تنگی راحت ،مشکل آسانی سب بھول جاتے ہیں۔اسی طریقے پر زندگی گزار کر ہم ایک روز اپنے رب کے حضور پیش ہو جائیں گے۔مگر وہاں ہم اپنے نامہ اعمال کو موجود پائیں گے۔چھوٹی بڑی ہر چیز اس میں موجود ہو گی۔ ہماری ہر بات، ہر عمل، ہر گفتگو غرض زندگی کا ہر لمحہ وہاں ہم موجود پائیں گے،لکھی ہوئی شکل میں بھی اور جیسا کہ اب ہم خود ریکارڈ کر لیتے ہیں،آڈیو اور وڈیو ریکارڈنگ بھی موجود ہو گی۔

میں نے غالباً ملبورن میں خطاب جمعہ میں تقریر کرتے ہوئے یہ عرض کیا تھا کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ کسی کو پکڑنے کا فیصلہ کریں گے تو اس کا پورا نامہ اعمال اور سارے اعمال کی وڈیو لوگوں کے سامنے نشر ہو جائے گی۔اس وقت انسان اتنا ذلیل ورسوا ہو گا کہ وہ خود اللہ تعالیٰ سے درخواست کرے گا کہ پروردگار یہ ذلت برداشت نہیں ہوتی،بس میرا فیصلہ کر کے مجھے جہنم میں پھینک دیں۔ ہمارے جیسے گناہ گاروں کے لیے تو یہ تڑپ اٹھنے کا مقام ہے۔

سچ یہ ہے کہ یہ رسوائی ہم میں سے ہر اس شخص کی منتظر ہے جس نے توبہ کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ہم نے جب جب کسی کا حق مارا ہو گا، کسی پر ظلم کیا ہو گا، کسی کا دل دکھایا ہو گا، کسی کا مال کھایا ہو گا، کسی پر الزام و بہتان لگایا ہو گا؛ ان تمام مواقعوں پر لوگ اپنے اپنے مطالبات لے کر کھڑے ہوں گے۔اس دنیا میں تو ہم اپنے طاقت، دولت، چرب زبانی اور چالاکی کی بنیاد پر ہر جگہ جیت جاتے ہیں،مگر وہاں خدا کے سامنے ہماری زبان بند کر دی جائے گی۔صرف ہمارے اعمال بولیں گے یا اعضا ہمارے خلاف گواہی دیں گے۔وہ دن انسان کو یاد رہے تو انسان اس دنیا میں نقصان اٹھانے کا فیصلہ تو کر سکتا ہے،مگر کسی پر ظلم و زیادتی ، الزام و بہتان اور دوسرے گناہوں کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔کر لے تو فوراً توبہ کر کے ازالہ کرے گا۔مگر ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو اس دن،

اس کی ذلت اور اس روز خدا کی پکڑ کے اندیشے سے ڈرتے اور لرزتے ہوئے زندگی گزارتے ہیں۔ ہمیں احساس ہوجائے تو ہمارے لیے قیامت سے قبل قیامت آجائے۔ ہم خدا کے احتساب سے قبل ہی اپنا احتساب خود کرلیں۔

گناہوں کا اصولی جواز

میری یہ گفتگو پڑھنے کے بعد ہوسکتا ہے کہ بہت سے لوگوں کے آنسو بہہ نکلیں۔ بہت سے لوگ سچے دل سے توبہ کرلیں۔ مگر انسانوں کی ایک قسم وہ ہوتی ہے جسے اپنے بدترین جرائم کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ توبہ بھی نہیں کرتے۔

میں اپنی خواہشات اور مفادات کے اسیر ان بے ضمیر اور پتھر دل لوگوں کی بات نہیں کررہا جن کو اپنے کسی گناہ کا احساس ہی نہیں رہتا۔ ایسے لوگوں کی ناؤ تو بھر کر ڈوبتی ہے۔ اس سے قبل اللہ ان کو نہیں پکڑتا۔ میں دراصل ان لوگوں کی بات کررہا ہوں جو ہر گناہ کو گناہ سمجھتے ہیں اور ہر ظلم کو ظلم سمجھتے ہیں۔ وہ دنیا میں دین کے نام پر کھڑے ہوتے ہیں اس لیے خدا کے ہر ہر حکم سے واقف ہوتے ہیں۔ ان کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے بدترین جرائم کو اصولی جواز مہیا کررکھا ہوتا ہے۔ جس کے بعد ہر جرم کرکے بھی وہ مطمئن رہتے ہیں۔

اس کی ایک مثال یہود ہیں۔ انھوں نے دنیا کو غیر یہود جنٹائل اور خدا کی پسندیدہ قوم یہود میں تقسیم کررکھا ہے۔ جس کے بعد وہ غیر یہود کے ساتھ ظلم و زیادتی کو اخلاقی جواز دے دیتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے ہاں فرقہ پرستی اور تعصّبات میں اندھے ہونے والے لوگ اپنے گروہ سے باہر کے ہر نمایاں شخص کی کسی سیدھی بات کا بھی الٹا مطلب نکال کر الزام و بہتان کی ایک مہم چلا دیتے ہیں۔ جب ان کو اخلاقی بنیادوں پر توجہ دلائی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ شخص تو ہے ہی گمراہ اور فتنہ، اس کے خلاف سب جائز ہے۔

یہی وہ رویہ ہے جو ہمارے ہاں آگے بڑھا اور ہم نے اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھا کہ بے گناہ عورتوں اور مردوں سے لے کر اسکول کے معصوم بچوں تک کو بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔ اس کے پیچھے بھی اپنے جرائم کو اصولی جواز مہیا کرنے کا عمل تھا۔ قیامت کے دن ایسے لوگوں کا منہ بند کر دیا جائے گا۔ اور پھر ان کے ساتھ وہ ہوگا جس کا یہ تصور بھی آج نہیں کر سکتے۔ مگر ایسے لوگ بھی قیامت سے پہلے ہوش میں آنے والے نہیں ہیں۔ ان کی ناؤ بھی بھر کر ہی ڈوبتی ہے۔

حضرت عیسیٰ کے ابتدائی منکرین پر عذاب

یہود کا ذکر آ گیا ہے تو ذوالفقار صاحب کے ساتھ کی جانے والی ایک گفتگو کا ذکر بھی ہو جائے جن کا تعلق یہود سے تھا۔ غالباً اسی روز انھوں نے مجھ سے یہ پوچھا کہ حضرت عیسیٰ کا انکار کرنے والے یہود پر نہ براہ راست عذاب آیا نہ ان کے ماننے والوں کو اس طرح اقتدار ملا جس طرح باقی رسولوں پر ایمان لانے والوں کو ملا تھا۔

ان کے اشکال کا پس منظر یہ تھا کہ بائبل کے بعض بیانات کی روشنی میں لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ رفع مسیح 33 برس کی عمر میں ہوا۔ جبکہ ٹائٹس کے ہاتھوں آنے والی تباہی چونکہ 70 عیسوی کے لگ بھگ آئی تھی اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ نسل تو اطمینان سے اپنی زندگی گزار کر رخصت ہوگئی جس نے مسیح کا انکار کیا تھا۔ جبکہ مسیح کے حواریوں کو رومی سلطنت میں شدید ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ یوں اللہ کا وعدہ تو ان سے پورا نہیں ہوا جو عام طور پر رسولوں کے ماننے والوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے اور جس کا مسیح کے حواریوں کے حوالے سے قرآن میں بھی ذکر ہے۔

میں نے اس معاملے میں اپنا نقطہ نظر بیان کر دیا۔ قرآن مجید کے مطابق یہود کی سزا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کے منکرین کے مقابلے میں ان کے ماننے والوں کی مدد کی اور ان منکرین پر ان کے مومنین کو غلبہ دے دیا تھا، (الصّف 14:61)، دوسری جگہ یہ واضح کر دیا گیا

کہ یہ غلبہ قیامت تک کے لیے ہے، (ال عمران 55:3)۔ (االاعراف 167:7) کے مطابق ان کی دوسری سزا یہ تھی کہ ان پر وقفے وقفے سے تا قیامت ایسے لوگ مسلط کیے جائیں گے جو ان کو سخت عذاب دیں گے۔

یہی رفع مسیح کے بعد ان کے کفر کی پاداش میں ہوا۔ پھر میں نے تاریخ کی روشنی میں ان کا اشکال دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کو یہ بتایا کہ حضرت عیسیٰ کی تیس برس کی عمر والی بات انجیل کے ایک دو بیانات سے پھیلی ہے۔ قرآن مجید نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے یہ واضح کر دیا کہ حضرت عیسیٰ نے اپنی دعوت کا آغاز سن کہولت (آل عمران 46:3، مائدہ 110:5) یعنی ادھیڑ عمر میں کیا تھا۔ دعوت سے لے کر اتمام حجت تک کچھ برس تو لگے ہی ہوں گے۔ چنانچہ رفع مسیح کا وقت کسی پہلو سے بھی پانچویں دہائی سے کم کا نہیں ہے۔ اس کے بعد ٹائٹس کے بعد آنے والی تباہی میں زیادہ سے زیادہ دس پندرہ برس بچتے ہیں۔ یہ اتنا وقت نہیں ہے کہ مسیح کا انکار کرنے والی نسل اس دنیا سے گزر جائے۔

یہی وہ دس پندرہ برس کا عرصہ ہے جس میں مسیح کے حواریوں کی دعوت تیزی سے پھیلی۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ انھوں نے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کی بنا پر یہود کی طرح بغاوت میں حصہ نہیں لیا ہوگا۔ چنانچہ اس بات کا امکان کم ہے کہ وہ یہود کی طرح مصیبت میں مبتلا ہوئے ہوں گے۔ چنانچہ ایک طرف حضرت عیسیٰ کے پیروکار بڑھتے گئے اور دوسری طرف ٹائٹس کے حملے کے بعد یہود کی کمر ایسی ٹوٹی کہ پھر ان کے قدم جم نہ سکے۔ انھوں نے اپنی تباہی کو بھی خود دیکھا اور مسیح کے پیروکاروں کو ہر طرف پھیلتے اور غالب ہوتے ہوئے بھی دیکھا۔

باقی رومی سلطنت میں ابتدائی مسیحیوں پر ظلم ایک الگ داستان ہے۔ انفرادی واقعات کو چھوڑ کر مسیحیوں پر باقاعدہ ظلم وستم رومی سلطنت میں تیسری صدی عیسوی میں شروع ہوا۔ اس سے

پہلے یہ لوگ مجموعی طور پر پرامن زندگی گزار رہے تھے اور خاموشی سے پھیل رہے تھے۔تاہم ایک صدی کے اندر ہی کونسٹنٹائن کے مسیحیت قبول کرنے کے بعد پوری رومی سلطنت عیسائی ہوگئی۔ اس کے بعد سے لے کر آج کے دن تک مسیحیوں کو یہود پر جو غلبہ رہا ہے وہ تاریخ کی روشنی میں مکمل واضح ہے اور قرآن کی صداقت کا واضح ثبوت ہے۔

بلو ماؤنٹین کا سفر

سڈنی شہر میں میرے لیے خوشی اور مسرت کا ایک موقع عاطف سے ملنا تھا۔وہ میرے دوست، اسٹوڈنٹ اور دعوت کے ساتھی سب ہی رہے ہیں۔ وہ ایک بہت قابل نوجوان ہیں۔ صرف دو برس قبل سڈنی منتقل ہوگئے تھے لیکن تیزی سے ترقی کر گئے ہیں۔ میں جب سڈنی پہنچا تو پہلے ہی پروگرام میں ان سے ملاقات ہوگئی تھی۔ دوسرے پروگرام میں وہ اپنی اہلیہ سمیت تشریف لائے جو میرے ایک اور دوست جمیل کی ہمشیرہ تھیں۔

آسٹریلیا آنے سے قبل ہی میں ان سے رابطہ میں تھا۔ ہمارے درمیان یہ بات طے ہوگئی تھی کہ سڈنی کے قریب واقع بلو ماؤنٹین کا مشہور تفریحی مقام وہ مجھے دکھائیں گے۔اس جگہ کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ اس پہاڑی سلسلے کو دور سے جب دیکھا جاتا ہے تو ان کا رنگ نیلا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ پہاڑوں کے دامن میں موجود جنگلات کے درختوں سے نکلنے والا ایک کیمیائی مادہ اس کا ذمہ دار ہے۔ روشنی ان سے ٹکرا کر اس طرح پھیلتی ہے کہ اس کے سات رنگوں میں سے نیلا رنگ نمایاں ہوجاتا ہے۔

عاطف فجر کے بعد ہی مجھے لینے کے لیے گھر آگئے تھے۔ ان کے ساتھ میں روانہ ہوا اور سڈنی کے مضافات سے ہوتے ہوئے شہر سے باہر پہنچے۔ راستے میں خوبصورت قدرتی مناظر اور مغربی دیہاتی زندگی کے نمونے دیکھتے گئے۔ ملبورن کے مضافات کی طرح یہاں بعض جگہ صرف

ایک ہی گھر تھا جو اردگرد کے علاقے میں کاشت کاری اور گلہ بانی پر گزارا کرتا تھا۔ ایک جگہ وہ پٹرول ڈلوانے کے لیے رکے تو میں بھی گاڑی سے باہر نکل آیا۔ انھوں نے خود ہی پٹرول ڈالا اور اندر جا کر اس کے پیسے بتائے اور خود ہی ادائیگی کی۔

میں نے پوچھا کہ لوگ پیسوں کی ادائیگی میں ڈنڈی تو نہیں مارتے۔ کہنے لگے میں بھی جب پہلی دفعہ آیا تو پہلے سے مقیم اپنے بہنوئی سے یہی سوال کیا تھا۔ انھوں نے عاطف سے کہا کہ ہر پاکستانی یہی بات پوچھتا ہے۔ یہ سن کر میں ہنس پڑا۔ جب سے ہمارے ہاں ایمان و اخلاق کی تربیت کے بجائے حکومتی اور سیاسی طاقت کی بنیاد پر اسلام نافذ کرنے کی سوچ عام ہوئی ہے، ہماری عمومی اخلاقی حیثیت اتنی پست ہو چکی ہے کہ کوئی شریف آدمی اس کی توقع نہیں رکھتا کہ ایک شخص چند روپوں کا بھی امین ہو سکتا ہے۔

عاطف نے مجھے اس حوالے سے بہت سے قصے سنائے۔ میں کینیڈا میں رہا تھا اس لیے مغربی سماج کی ان خصوصیات سے واقف تھا۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں مغرب کا تعارف یہی ہے کہ یہاں بس لڑکیاں بکینی اور منی اسکرٹ میں گھومتی ہیں اور مغرب میں ہر وقت مسلمانوں کے خلاف سازش ہوتی رہتی ہے۔ کوئی اچھی بات سامنے آئے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ انھوں نے ہم سے لی ہے۔ کسی عملی بہتری کی ہم نہ کوشش کرتے ہیں نہ اس کا طریقہ ہم کو معلوم ہے۔

یہ صورتحال تب تک نہیں بدلے گی جب تک ہمارے کچھ لوگ یہ طے نہ کر لیں کہ وہ افراد اور سماج کی تربیت کے لیے زندگی وقف کر دیں گے۔ یہ کرنے والوں کو نہ شہرت ملے گی، نہ اقتدار اور نہ عوام میں پذیرائی ان کا مقدر ہو گی۔ ان کو تو اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنا بھی مسئلہ بنا رہے گا۔ مگر کوئی تبدیلی اگر کبھی آئی تو انھی لوگوں سے آئے گی۔ اور آخرت کے اعلیٰ ترین مقامات ان کا مقدر ہوں گے۔

نیلے پہاڑ، تین بہنیں اور جنت

خیر باہر موسم بہت سرد تھا۔ اس کی وجہ ٹھنڈی اور تیز ہوا تھی۔ چنانچہ ہم کافی لے کر آگے روانہ ہوئے اور کچھ دیر میں بلو ماؤنٹین کے پہاڑی سلسلے پر جا پہنچے۔ یہ جگہ ایک بالکل منفرد پہلو سے خوبصورت تھی۔ میں نے پہاڑوں کے بہت روپ دیکھے ہیں ہم پاکستانیوں سے زیادہ پہاڑوں کو کون جان سکتا ہے۔ پروردگار نے ہمیں دنیا کے بلند ترین اور خوبصورت ترین پہاڑ دیے ہیں۔ میں نے وادی کاغان، کالام اور ہنزہ وگلگت میں ہر طرح کے پہاڑ دیکھ رکھے ہیں۔ فلک بوس، عظیم الشان پہاڑ۔ دیار کی خوشبو بکھیرتے، بلند قامت درختوں سے اٹے ہوئے پہاڑ۔ سبز گھاس کی پوشاک پہنے اور اپنے دامن پر رنگارنگ پھولوں کے موتی بکھیرتے ہوئے پہاڑ۔ سردیوں میں برف کا لبادہ اوڑھے اور گرمیوں میں اپنی چوٹیوں پر برف کا تاج سجائے سفید پہاڑ۔ سرد وگرم موسم سے بے نیاز سال بھر برف کی چادر نہ اتارنے والے نانگا پربت، فلک سیر اور راکاپوشی جیسے بلند ترین پہاڑ۔ کچھ نہ ہو تو مٹی کے رنگ میں رنگے ہوئے پہاڑ۔ پھر ابھی حال ہی میں ترکی اور پھر اور اس کے بعد بلوچستان میں دیکھے ہوئے عجیب وغریب خلقت پہاڑ جو پہاڑ کم اور فائن آرٹس کے نمونے زیادہ لگتے ہیں۔

مگر بلو ماونٹین پہاڑ ان سب سے جدا تھے۔ یہ پہلے پہاڑ دیکھے جو نیلاہٹ مائل تھے۔ حتیٰ کہ ان پر موجود سبز جنگلات کا رنگ بھی نیلا نظر آ رہا تھا۔ بلو ماؤنٹین کی ایک خاص بات یہاں موجود تھری سسٹر زیا تین بہنیں تھیں۔ یہ بالکل قریب ہی واقع تین چٹانیں تھیں جو سر اٹھائے ایک ساتھ کھڑی تھیں۔ میں نے انھیں دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ ان کی خوبصورتی کی وجہ سے نہیں۔ میں ان سے کہیں زیادہ خوبصورت پہاڑ دیکھ چکا تھا۔ ان کے مختلف اسٹرکچر کی وجہ سے بھی نہیں۔ میں ان سے کہیں زیادہ عجیب وغریب اور مختلف پہاڑ دیکھ چکا تھا۔

انھیں دیکھتے رہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ کہیں ان کا ذکر پڑھ رکھا تھا۔ ان کی تصویر بھی دیکھ رکھی تھی۔ آسٹریلیا آنے سے قبل جب ان کی تصویر دیکھی تو سوچا تھا کہ شاید یہاں جانا ہو۔ مگر یہاں آنے کے بعد سب چیزیں اپنے میزبانوں پر چھوڑ دی تھیں تو خیال نہیں تھا کہ ان کو دیکھ سکوں گا۔ مگر بلو ماؤنٹین آتے وقت یہ معلوم نہ تھا یہاں ان تھری سسٹرز سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔

یہ واقعہ میرے لیے جنت کا ایک تجربہ بن گیا۔ خدا کی جنت اپنے تصورات اور خواہشات کو پالینے کا نام ہے۔ مگر قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان وہاں اپنے تصورات اور خواہشات کو بالکل غیر متوقع انداز میں پائے گا۔ انسان کو اس کی متوقع چیزیں بڑے ہی غیر متوقع انداز میں ملیں گی۔ پانے کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا اور غیر متوقع انداز میں پانے کا یہ طریقہ انسان کو کبھی بور نہیں ہونے دے گا۔

ایبوریجنل، توہمات اور نئی دنیا کے مالک

عاطف نے مجھے ان تین چٹانوں سے متعلق ایبوریجنل (Aboriginal) لوگوں کی ایک داستان سنائی۔ ایبوریجنل؛ ریڈ انڈین کی طرح یہاں کے مقامی باشندے تھے اور یورپین نوآبادکاروں کے ہاتھوں اسی انجام کو پہنچے جس کا سامنا ریڈ انڈین کو امریکہ میں کرنا پڑا۔ یعنی ساری آبادی ختم اور بطور نمائش گنتی کے چند لوگ قدیم کلچر کے ایک زندہ نمونے کے طور پر موجود ہیں۔ بہر حال اس کہانی کے مطابق یہ تین بہنیں تھیں جنھیں ایک دوسرے قبیلے کے تین بھائیوں سے عشق ہوا۔ کہانی کے مطابق آخر کار ایک جادوگر نے ان کو چٹانوں میں بدل دیا۔

اس کہانی کا ایبوریجنل کے انجام سے بہت گہرا تعلق ہے۔ جو لوگ توہمات میں جیتے ہیں وہ آخر کار ریڈ انڈین اور ایبوریجنل کے انجام کو پہنچتے ہیں اور جو لوگ توہمات کو چھوڑ کر علم و تحقیق کو زندگی بناتے ہیں وہ نئے براعظموں کے مالک بن جاتے ہیں۔ ہم جو بھی کہیں، اس دنیا کی

حقیقت یہی ہے۔کیا اس میں ہماری لیے کوئی سبق ہے یا نہیں؟

ایک بہن کی زیارت

اس وادی ، پہاڑی سلسلے اور تین چٹانوں کے نظارے کے لیے جو بلند جگہ تھی ہم کافی دیر کھڑے وہاں کا منظر دیکھتے رہے۔ میں نے ان تین چٹانوں میں سے پہلی کی جڑ میں کچھ لوگوں کو دیکھا۔ عاطف نے بتایا کہ وہاں تک جانے کے لیے پہلے ایک ٹریک ہے اور پھر کافی سیڑھیوں سے اتر کر جانا پڑتا ہے۔گرچہ میرے گھٹنے میں تکلیف تھی،مگر میں نے جانے کا ارادہ کرلیا۔

ٹریک ختم ہوا تو سیڑھیاں شروع ہوگئیں۔ چٹانی سیڑھیوں کے اسٹیپ بڑے بڑے ہوتے ہیں اور ان پر چڑھنا اترنا آسان نہیں ہوتا۔ عام حالات میں میں با آسانی ان پر چلا جاتا مگر گھٹنے کی تکلیف کے ساتھ یہ مشکل تھا۔ چنانچہ میں ہمت ہار کر ان کے آغاز میں ایک جگہ سیٹ پر بیٹھ گیا اور سرد ہوا میں گرم دھوپ سینکنے لگا۔ عاطف نے میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے اپنا بیگ کھولا اور وہ سینڈوچز نکالے جو ان کی بیگم نے زادِراہ کے طور پر ان کو بنا کر دیے تھے۔

ان کو کھانے کے بعد جسم میں جو حرارت آئی اس نے ذہن میں یہ خیال پیدا کیا کہ زندگی میں دوبارہ کبھی یہاں آنا ہو یا نہیں بہتر ہے کہ یہ مشقت بھی کر لی جائے۔ چنانچہ ہم نیچے اترنا شروع ہوگئے۔ جہاں سیڑھیاں ختم ہوئیں وہاں ہوا میں معلق لوہے کا ایک پل بنا ہوا تھا اور نیچے دور دور تک جنگلات کا نظارہ تھا۔اس کو عبور کر کے ہم پہلی چٹان کی گود میں جا بیٹھے۔

عاطف نے بتایا کہ سیڑھیاں نیچے وادی اور جنگل تک جاتی ہیں۔ایڈونچر پسند لوگ نیچے تک جاتے ہیں اور وہاں موجود کسی آبشار تک جا پہنچتے ہیں۔ یہ جنگلات اتنے نیچے تھے کہ مزید کسی ایڈونچر کا خطرہ مول لیے بغیر میں نے واپس آنے میں عافیت سمجھی۔

جنگلات میں

لیکن عاطف نے مجھے جنگلات تک پہنچانے کا ایک دوسرا راستہ ڈھونڈ لیا۔ وہ اپنی گاڑی میں بٹھا کر مجھے ایک دوسری جگہ لے گئے جہاں بذریعہ ٹکٹ ایک ٹرین کے ذریعے نیچے جانے کا انتظام تھا۔ مگر یہ ٹرین سیدھی نہیں چلتی تھی بلکہ بالکل ٹیڑھی ہو کر نشیب کی طرف جاتی تھی۔ نیچے گئے تو معلوم ہوا کہ ایک زمانے میں یہ جگہ کوئلہ نکالنے والے کارکنوں کے نیچے آنے جانے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ اس زمانے کی بعض معلومات اور استعمال ہونے والی چیزیں لوگوں کے لیے بطور نمائش موجود تھیں۔

ایندھن اور جدید انسان

ان سب چیزوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جدید انسان کی زندگی کتنی آسان بنادی ہے۔ آگ اور حرارت زمانہ قدیم ہی سے زندگی کی بنیادی ضرورت رہی ہے۔ یہ ضرورت انسان نے ہر دور میں کوئلے اور ایندھن کی دیگر اقسام سے پورا کرنے کی کوشش کی۔ مگر ایندھن حاصل کرنا اور اسے جلا کر روشنی اور حرارت حاصل کرنا ہر دور میں ایک بڑا مسئلہ بنا رہا ہے۔ آج جب ہم اپنے گیس کے چولہے کو ماچس یا لائٹر سے جلاتے ہیں، یا بغیر ماچس کے خودکار چولہے جلاتے ہیں۔ یا وہ برتن استعمال کرتے ہیں جو بجلی اور گیس کے بغیر خودکار طور پر گرم ہوجاتے ہیں۔ یا اپنے گھروں میں گرم پانی کے لیے گیزر جلاتے ہیں۔ یا پھر چوبیس گھنٹے ہوا، روشنی اور ٹھنڈک کے لیے پنکھے، لائٹ اور اے سی ایک بٹن دبا کر کھولتے ہیں تو ہمیں اندازہ نہیں ہوتا کہ ہزار ہا برس تک انسان کے لیے ان چیزوں کا حصول کتنا بڑا مسئلہ تھا۔

آج کے انسان کو سب سے بڑھ کر خدا کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ مگر آج کا انسان سب سے بڑھ کر خدا کو بھولا ہوا ہے۔

بچے اور مغرب

یہاں دو تین طرح کی مزید کیبل کار پر بیٹھ کر ہم مزید مختلف جگہوں پر گئے۔ جس کے بعد گھر کے لیے واپس لوٹے۔ گرچہ بھوک نہیں تھی اور رات کو ایک اور ڈنر میرا منتظر تھا، مگر عاطف کی بیگم نے ایک پوری دعوت کا انتظام کر رکھا تھا۔ کھانے سے زیادہ ان کے گھر آنے کا اصل فائدہ یہ ہوا کہ ان کے دو بہت پیارے بچوں سے ملاقات ہوگئی۔

بچے خدا کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ مگر یہ بہت بڑی ذمہ داری بھی ہوتے ہیں۔ دورِ جدید میں والدین بچوں کی اس ذمہ داری کو جدید تعلیم یا قرآن ناظرہ پڑھانے تک محدود سمجھتے ہیں۔ جبکہ اصلاً یہ ذمہ داری ایک باشعور اور بااخلاق انسان بنانے کی ذمہ داری ہے۔ خاص کر جو لوگ ملک سے باہر جا چکے ہیں، ان کے لیے یہ ذمہ داری دوگنا ہے۔ کیونکہ میں نے یہ دیکھا ہے کہ یہاں سے جانے والے پاکستانی زیادہ تر اپنی کمیونٹی میں مگن رہتے ہیں۔ یہ اصلاً ان کے بچے ہوتے ہیں جو مغربی ممالک کے باشندوں سے ربط وضبط رکھتے ہیں۔ ایسے میں ایک امکان یہ ہوتا ہے کہ بچے مغربی رنگ میں رنگ جائیں۔ مگر دوسرا روشن تر امکان یہ ہوتا ہے کہ یہ بچے اہل مغرب کو اسلام کا تعارف کروادیں۔ اگر والدین ابتدا ہی سے اپنی ذمہ داری محسوس کر لیں تو دوسرا واقعہ پیش آ سکتا ہے۔ ورنہ عام طور پر پہلا امکان ہی روبہ عمل ہوتا ہے۔

ملاوٹ، اخلاقی بحران اور تباہی

مجھے زندگی میں جو چیزیں سب سے زیادہ ناپسند ہیں، ان میں سے ایک شاپنگ کرنا ہے۔ تاہم بعض اوقات یہ مجبوری بن جاتی ہے۔ یہاں سے بھی کچھ چیزیں لینا تھیں۔ اس لیے عاطف مجھے ایک دو شاپنگ سنٹر لے گئے۔ میری یہاں سے شاپنگ کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ ملک سے کئی برس باہر رہنے کے بعد جب میں واپس لوٹا تو مجھے پہلی دفعہ حقیقی معنوں میں اندازہ ہوا کہ پاکستان میں غذا یا دوا کچھ بھی خالص نہیں ملتا۔ چیزیں جعلی نہ بھی ہوں تب بھی کوالٹی کا بہت فرق

ہوتا ہے۔ عام استعمال کی چیزوں میں یہ ظلم تو پھر گوارا کرلیا جائے۔ مگر غذا اور دوا میں اس ملاوٹ پر اس کے سوا کیا کہا جائے کہ قوم شعیب کے معاملے میں اللہ نے اس کو بہت بڑے جرم کے طور پر بیان کیا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ پاکستان میں جو چیزیں باہر کی چیزوں کے نام پر فروخت ہوتی ہیں، ان کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ دنیا بھر سے وہ مال جس کی ایکسپائری ڈیٹ قریب آ گئی ہو اور فروخت نہ ہو سکے، دبئ آتا ہے۔ جہاں سے یہ پاکستان بھیج دیا جاتا ہے جس کی ایکسپائری ڈیٹ تبدیل کر کے اسے باہر کی اشیاء کے نام پر فروخت کیا جاتا ہے۔ شہر کے چند پوش علاقوں کو چھوڑ کر بیشتر جگہوں پر فارن آئٹم کے نام پر یہی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ بے چارے عام لوگ زیادہ پیسے دے کر بھی دھوکا ہی کھاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارا اخلاقی زوال آخری درجے میں پہنچ چکا ہے۔ ایسی قوم میں جہاں اس طرح کا زوال ہو، جب ٹکراؤ اور تصادم کی جوشیلی تقریریں سنتا ہوں تو بہت ڈر لگتا ہے۔ کیونکہ انبیا کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ایسی قوموں کو اللہ تعالیٰ جب سزا دینے کا فیصلہ کرتے ہیں تو قوم عملی طور پر اس اخلاقی پستی کا شکار ہوتی ہے، مگر خود کو صالحین کی جماعت سمجھ کر طاقتور اقوام سے ٹکرانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ جس کے بعد تباہی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ کاش میری قوم کسی مزید حماقت میں چھلانگ لگانے سے پہلے اپنی اخلاقی حیثیت پر غور کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

شاپنگ سنٹر اور موبائل ایپ

خیر بات کہاں پہنچ گئی مجھے کچھ چیزیں چاہیے تھیں۔ عاطف ساتھ لے کر شاپنگ سنٹر میں گئے جہاں ایک دلچسپ چیز انھوں نے بتائی۔ ان کے موبائل فون پر ایک ایپ تھی جس سے ہمیں یہ معلوم ہو رہا تھا کہ ہماری مطلوبہ چیز اس شاپنگ سنٹر میں کس جگہ موجود ہے۔ ورنہ عام حالات میں تو چیزیں ڈھونڈنے میں بڑا وقت لگ جاتا۔ پاکستان میں یہ مسئلہ وہ ملازمین حل کر دیتے ہیں

جو شاپنگ سنٹر میں ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ مگر وہ لوگوں کی رہنمائی سے زیادہ ان پر نظر رکھنے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں کہ لوگ چیزیں جیب اور پرس میں نہ ڈال لیں۔ یہاں اسٹاف بھی بہت کم تھا۔ اس کی وجہ عاطف نے یہ بتائی کہ لیبر یہاں کافی مہنگی ہے۔ ادائیگی کے وقت بھی یہی ہوا۔ عاطف نے ساری چیزیں خود ہی اسکین کیں۔ خود ہی بل بنایا اور خود ہی ادائیگی کر لی۔ میں نے پوچھا کہ ساری چیزیں لوگوں پر چھوڑنے سے کیا لوگ ڈنڈی نہیں مارتے۔ انھوں نے کہا کہ عام طور پر لوگ نہیں کرتے۔ جو تھوڑا بہت کچھ ہوتا ہوگا اس کے مقابلے میں مستقل لیبر کو رکھنے کی قیمت زیادہ ہے۔ لیکن میرے نزدیک اصل وجہ یہی ہے کہ لوگ زیادہ تر ڈنڈی نہیں مارتے ورنہ کوئی کاروباری شخص اس طرح مستقل نقصان اٹھانا گوارا نہیں کر سکتا۔

فرخ صاحب کے ہاں

یہ شام اور اگلا دن فرخ صاحب کے نام رہا۔ بلکہ ایڈیلیڈ کا سفر بھی ان کے ساتھ ہی ہوا۔ فرخ صاحب المورد آسٹریلیا کے ٹریژری اور پیشے کے لحاظ سے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھے۔ انھوں نے دفتر سے چھٹیاں لے لی تھیں جس کے بعد ان کے ساتھ کافی وقت گزرا۔ آج رات کا ڈنر ان کے گھر پر ہی تھا۔ انھوں نے ڈنر کا انتظام گھر کے لان میں کیا تھا کیونکہ مہمانوں کی تعداد زیادہ تھی، مگر سردی کے پیش نظر کھانا اندر ہی پیش کیا گیا۔ مہمانوں میں المورد آسٹریلیا کے احباب کے علاوہ فرخ صاحب کے بعض ذاتی دوست نیز سڈنی میں پاکستانی قونصل جنرل ماجد صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ حسب دستور انواع و اقسام کے کھانے موجود تھے۔ میرے لیے خاص طور پر پالک پنیر کی ڈش تھی۔ فرخ صاحب کی اہلیہ نے جتنے اچھے کھانے بنائے تھے اتنے ہی اچھے سوالات کیے۔ ان کے لیے سوالات کی یہ نشست الگ سے رکھی گئی تھی۔ جبکہ کھانے کے بعد ذوالفقار صاحب کے کہنے پر میں نے مہمانوں کے سامنے کچھ گفتگو بھی کی۔

میں نے اپنی گفتگو میں ہر جگہ چند ہی چیزوں کو نمایاں کیا اور میرے قارئین جانتے ہیں کہ اپنی پوری دعوتی زندگی میں ہر موقع پر ہزار اسلوب میں بھی میں یہی چند باتیں کہتا ہوں۔ یعنی لوگ ایمان و اخلاق کو اپنی زندگی بنالیں۔اس لیے کہ آخرت میں نجات اور دنیا میں قومی غلبے کا راستہ یہی ہے۔ دوسروں کا احتساب کرنے کے بجائے اپنا احتساب کریں اور دیکھیں کہ خواہشات اور تعصّبات کے اسیر تو نہیں ہو چکے ہیں۔ دوسرے کے حوالے سے اصل ذمہ داری ان کو صحیح بات پہنچانا ہے اور یہ اس دور میں نصرت دین کا وہ کام ہے جو خدا کی رضا کے حصول کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

اس موقع پر بھی اسی حوالے سے میں نے چند معروضات پیش کیں جنھیں مہمانوں نے بہت توجہ سے سنا۔ اللہ تعالیٰ ان سب کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے۔

آٹومیٹک گاڑیاں

اگلی صبح فرخ صاحب صبح سویرے تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ میری منزل وولون گونگ کا شہر تھا۔ راستہ حسب معمول بہت خوبصورت اور سرسبز تھا۔ سڑکیں کشادہ اور ہموار تھیں۔ یہی معاملہ ان سڑکوں پر چلنے والی گاڑیوں کا تھا۔ ملبورن سے یہاں تک اور بعد میں بھی متعدد دوستوں کی بہت سی گاڑیوں میں بیٹھا۔ یہ گاڑیاں اتنی ساری خصوصیات کی حامل تھیں کہ انھوں نے سفر جیسی مشکل چیز کو آخری درجے میں سہل اور آسان بنا دیا تھا۔

تحفظ، آرام اور تفریح ہر پہلو سے ان گاڑیوں میں اتنی خصوصیات جمع کر دی گئی تھیں کہ ان کا بیان ایک الگ کتاب کا تقاضہ کرتا ہے۔ تاہم کچھ چیزوں کا بیان قارئین کے لیے باعث دلچسپی ہوگا۔ پہلے سکیورٹی کو لیجیے۔ ملبورن میں گریٹ اوشن روڈ کے راستے میں ایک چوراہے پر میں نے محسوس کیا کہ سامنے سے ایک گاڑی کے آنے پر عبدالشکور صاحب کی گاڑی تیزی سے رک

گئی۔ بعد میں عبدالشکور صاحب نے بتایا کہ گاڑی میں ایسا اسکینر لگا ہوا ہے کہ وہ ایسے کسی موقع پر ڈرائیور کو زحمت دیے بغیر سامنے والی گاڑی کو خطرناک قربت پر محسوس کر کے خود بریک لگا دیتی ہے۔ یہی اسکینر اور بہت سے کام بھی کرتا ہے۔ مثلاً بڑی گاڑیوں میں کروز کا فیچر تو پہلے ہی سے آتا ہے۔ جن قارئین کو علم نہیں ان کو یہ بتاتا چلوں کہ کروز کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب آپ گاڑی کی رفتار مثال کے طور پر ساٹھ میل فی گھنٹہ طے کر دیں گے تو گاڑی کا ایکسلیریٹر دبانے یا کم کرنے کی ضرورت نہیں گاڑی اسی رفتار پر چلتی رہتی ہے۔ یہ فیچر ہائے وے پر بہت کام آتا ہے۔ اب اس میں یہ اضافہ ہو گیا ہے کہ آپ کو بریک دبانے کی بھی ضرورت نہیں۔ آگے والی گاڑی اگر ہلکی ہو جاتی ہے تو آپ کی گاڑی بغیر بریک کے ہلکی ہو جائے گی اور اس کے آگے جانے کے بعد خود ہی تیز ہو جائے گی۔ اب آپ کو صرف اسٹیرنگ کو سنبھالنا ہے۔ وہ بھی اتنا سہل ہے کہ ایک انگلی سے کنٹرول میں رہتا ہے۔ اس پر بھی آپ اپنی لائن سے نکلتے ہیں تو اسکینر الارم بجا کر آپ کو متوجہ کر دے گا تا کہ آپ گاڑی کو سیدھا رکھیں۔

گاڑی میں ہیٹنگ اور ٹھنڈک تو بہت پرانے فیچر ہیں، مگر عاطف کی گاڑی میں یہ بڑی سہولت ملی کہ اگر مجھے ٹھنڈ لگ رہی تھی تو میں اپنے حصے کا درجہ حرارت اپنی مرضی سے طے کر سکتا تھا اور ان کو گرمی لگ رہی تھی تو وہ اپنے حساب سے طے کر سکتے تھے۔ برسبین میں میرے میزبان مدثر صاحب کی گاڑی پرانے کلاسیکل انداز کی لمبی چوڑی گاڑی تھی۔ اس میں جہاز کی بزنس کلاس کی طرح سیٹ کی پشت کو آگے پیچھے کرنے کی سہولت سے آگے بڑھ کر اس پشت کو ریڑھ کی ہڈی کی سہولت کے لحاظ سے بیچ سے ایڈجسٹ کرنے کی سہولت موجود تھی۔ جس کے بعد آپ سیٹ کی پشت پر اپنی سہولت سے ٹیک لگا کر کمر کی کسی تکلیف سے بچ کر سفر کر سکتے ہیں۔

جی پی ایس کی سہولت کی وجہ سے اب دنیا بھر کی گاڑیوں میں راستے کا نقشہ موجود ہوتا ہے۔

بس آپ اپنا مطلوبہ ایڈریس ڈال دیجیے۔ کمپیوٹر ہر قدم پر آپ کو بتا تا رہے گا کہ کس جگہ سے کہاں مڑنا ہے۔ یوں آپ سیدھے بغیر کسی سے کچھ پوچھے اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ جبکہ بعض جدید گاڑیوں میں یہ سہولت آ چکی ہے کہ وہ پارکنگ کے وقت آپ کو زحمت میں ڈالے بغیر خالی جگہ دیکھ کر خود اپنے آپ کو پارک کر دیتی ہیں۔

ان سب چیزوں کو دیکھ کر اب یہ یقینی لگتا ہے کہ آنے والے برسوں میں ڈرائیور کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔ آپ گھر سے نکل کر اپنی مکمل آٹو میٹک گاڑی میں بیٹھیں گے۔ زبانی طور پر اپنی منزل بیان کریں گے اور کمپیوٹر مقررہ وقت میں آپ کی گاڑی کو باحفاظت آپ کی منزل پر پہنچا دے گا۔ اس دوران میں آپ چاہیں تو آن لائن میٹنگ کریں۔ وڈیو دیکھیں یا آڈیو سنیں۔ آپ کو راستے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوگا۔

فرخ صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ ٹیکنالوجی بالکل تیار ہے۔ جبکہ عاطف نے بتایا کہ آسٹریلیا میں ڈرائیور لیس گاڑی کو ہزاروں میل چلا کر کامیاب تجربہ بھی کر لیا گیا۔ اب اصل رکاوٹ ٹیکنالوجی کی نہیں بلکہ سڑکوں کے انفرا اسٹرکچر کی ہے۔ یعنی جب تک باقی گاڑیاں اس طریقے پر نہیں آ جاتیں ایسی گاڑیوں کو الگ راستے کی ضرورت ہوگی۔ ورنہ آپ کی گاڑی جتنی بھی آٹو میٹک ہو، سامنے والے کے لیے یہ بالکل ممکن ہوگا کہ کبھی بھی آپ کی گاڑی کو آ کر ٹکر مار دے۔

فطرت کا جی پی ایس

اس سفر سے واپسی پر ہمیں سلیمان صاحب کے ہاں ڈنر پر جانا تھا۔ ان کا گھر مقامی قبرستان کے قریب واقع تھا۔ فرخ صاحب کے والد یہیں مدفون تھے۔ فرخ صاحب سلیمان صاحب کے ہاں جاتے ہوئے مجھے قبرستان دکھانے لے گئے۔ ان کا خیال تھا کہ ہم دوسرے گیٹ سے سلیمان صاحب کے گھر کے بالکل قریب نکل جائیں گے، مگر وہ راستہ بند تھا۔ اس لیے ہم یہاں

کچھ دیر بھٹکتے بھی رہے۔اسی دوران میں ہم نے گاڑی میں چلتے ہوئے کم وبیش پورا قبرستان دیکھ لیا۔

یہ ایک مشترکہ قبرستان تھا جس میں مسیحیوں کے مختلف فرقوں کے علاوہ مسلمانوں اور بدھوں وغیرہ کی بھی قبریں تھیں۔ ہمارے قبرستانوں کے برعکس صاف ستھرا قبرستان تھا۔یہاں بھٹکتے ہوئے مجھے گاڑیوں میں موجود جی پی ایس اور نقشے کی رہنمائی یاد آئی۔اس رہنمائی میں گاڑی چلانے والا اگر غلط موڑ مڑتا ہے تو کمپیوٹر اسے توجہ دلاتا ہے لیکن حتمی فیصلہ ڈرائیور ہی کا ہوتا ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جب انسان کو بھیجا ہے تو اس کی فطرت میں خیر وشر کے شعور کا ایک جی پی ایس سسٹم رکھ دیا ہے جو ہر غلط قدم پر خاموش آواز میں اسے متنبہ کرتا ہے۔

یہ قبریں بھی ایک خاموش نوعیت کی ایسی ہی آواز تھی۔ یہ آواز اپنی خاموش زبان میں انسان کو یہ بتا رہی تھی کہ وہ اِس دنیا، اس کی رنگینیوں، اس کی حسین وجمیل گاڑیوں، دلربا چہروں، شاندار گھروں اور دیگر تفریحات کے پیچھے کبھی یہ حقیقت نہ بھولے کہ اس کی آخری منزل یہ قبرستان ہی ہے۔انسان اس دنیا میں ایک عارضی مدت کے لیے امتحان دینے کے لیے بھیجا گیا ہے۔اس لیے نہیں کہ دنیا کو اپنا مقصد بنالے۔انسان کو لوٹ کر اپنے رب کے حضور جانا ہے۔اس روز وہی کامیاب ہوگا جس نے فطرت کے جی پی ایس سسٹم کی رہنمائی قبول کی۔ جنت کی منزل تک وہی لوگ پہنچیں گے۔باقی لوگ ابدی طور پر جہنم کے قبرستان میں بھٹکتے رہیں گے۔

وولون گونگ کا حسین نظارہ

معاف کیجیے گا کہ میں عادت سے مجبور ہو کر آپ کو کہیں سے کہیں لے گیا۔ہم وولون گونگ جارہے تھے۔ یہ شہر ایک پورٹ سٹی تھا جو سڈنی سے 50 میل دور ساحل کے ساتھ ساتھ آباد تھا۔ مرکز شہر پہنچنے سے قبل سڈنی سے آنے والا راستہ پہاڑ کے ساتھ ساتھ گزرتا تھا۔ پہاڑ کے دامن

میں شہر آباد تھا اور پھر تا حد نظر تک پھیلا ہوا سمندر۔ اصل شہر میں داخلے سے قبل فرخ صاحب نے ایک دو مقامات پر گاڑی روکی۔ یہاں سڑک کے کنارے با قاعدہ جگہیں بنی ہوئی تھیں جن سے کھڑے ہو کر یہ پورا منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ ہم نے دو تین جگہ پر رک کر یہ منظر دیکھا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک انتہائی حسین اور خوبصورت منظر تھا۔ اوپر نیلا آسمان، اس کے نیچے نیلا سمندر۔ پہاڑ پر کافی بلندی پر کھڑا ہونے کی وجہ سے دائیں بائیں دور تک ساحلی کٹاؤ نظر آ رہا تھا۔ ساحل کہیں نصف دائرے کی شکل میں کٹا ہوا تھا کہیں ایک پگڈنڈی کی شکل میں آگے جا رہا تھا۔ کہیں بالکل ہموار تھا کہیں غیر ہموار طریقے سے سمندر سے مل رہا تھا اور کہیں سفید ریت کی خوبصورت بیچ بنی ہوئی تھی۔ ساحل کے پیچھے دور تک پھیلا شہر آباد تھا۔ اس کے پیچھے پہاڑ کی ڈھلوان پر ایک جنگل آباد تھا۔

بلاشبہ اس شہر کی اصل خوبصورتی یہی نظارہ تھا۔ یہی منظر حاصل سفر تھا۔ فرخ صاحب نے بتایا کہ یہاں سے لوگ پیرا گلائڈنگ بھی کرتے ہیں۔ یقیناً یہ اس کے لیے بھی بہترین جگہ تھی۔ میں نے سوچا کہ پرندے کی طرح اڑتے ہوئے یہاں کا نظارہ کتنا عجیب لگتا ہو گا۔ خوش قسمتی سے میں ترکی میں ہاٹ ائیر بلون میں بیٹھ چکا تھا اس لیے بڑی حد تک اب سمجھ سکتا ہوں کہ پرندے اوپر سے نیچے اترتے ہوئے چیزوں کو کیسے دیکھتے ہیں۔ بڑی حد تک یہ منظر یہاں بھی موجود تھا۔ اسی دوران میں فرخ صاحب نے مجھے آگے کی سمت نیچے پہاڑ کے دامن میں بنے ایک پل کی طرف متوجہ کر کے بتایا کہ اسی سے گزر کر ہم اصل شہر جائیں گے۔

کچھ دیر میں ہم اس پل سے گزرے۔ فرخ صاحب نے بتایا کہ پہلے یہ سڑک پہاڑ کے ساتھ بنی ہوئی تھی، مگر اکثر لینڈ سلائڈنگ کی وجہ سے راستہ بند ہوتا رہتا تھا۔ جس کے بعد پہاڑ سے ہٹ کر یہ پل پانی کے اوپر بنایا گیا ہے۔ یہ کافی طویل اور خوبصورت پل تھا۔ اس سے گزر

کے ہم شہر میں داخل ہوئے۔ یہ ایک چھوٹا اور صاف ستھرا شہر تھا۔ ایک جگہ ہم نے ویجیٹیبل برگر کا لنچ کیا۔ پھر بندرگاہ کے پاس موجود ساحل پر گئے۔ کچھ دیر وہاں گزار کر ہم واپس سڈنی کی طرف روانہ ہوگئے۔

رزق ربانی اور عجز انسانی

مجھے ذاتی طور پر روٹین کی زندگی پسند ہے۔ وقت پر کھانا، وقت پر سونا جاگنا، معمولات کے مطابق صبح و شام کرنا۔ سفر میں یہ سب چیزیں الٹ جاتی ہیں۔ اس سفر میں صورتحال کچھ زیادہ ہی خراب رہی۔ سفر میں کھانے پینے کے اوقات اور کھانے کی نوعیت گھر سے مختلف بھی تھی اور ہر روز بدل بھی رہی تھی۔ ایک اور مسئلہ سردی تھی۔ سرد موسم کا اثر گھر میں رہ کر ہیٹر وغیرہ کے ذریعے ختم کیا جا سکتا تھا، مگر مجھے ٹورازم کی وجہ سے مسلسل باہر سرد ہوا میں رہنا پڑ رہا تھا۔ سڈنی کے اوپرا ہاؤس، بلو ماؤنٹین اور وولون گونگ ہر جگہ سرد تیز ہوا کا سامنا تھا۔ اسے میں برداشت کر لیتا مگر ایک ہفتہ بعد بھی جیٹ لیگ سے نہیں نکل سکا تھا۔ کبھی دیر تک آنکھ نہ کھلتی اور کبھی نیند نہ آتی۔ اور اس پر مستزاد یہ ستم کہ اس عاجز کو نہ جہاز میں نیند آتی ہے نہ آرام دہ گاڑیوں میں۔

تاہم میں ہر سفر میں یہ قیمت دینے کو تیار رہتا ہوں خاص کر اس سفر کے لیے جس کی نوعیت دعوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کی ''سیاحت'' قرآن مجید کی مطلوبہ خصوصیات میں سے ایک ہے، (التوبہ 9:111)۔ اس سیاحت میں ایک طرف انسان نصرت دین کی وہ خدمت سرانجام دیتا ہے جس کا اجر غیر معمولی ہے، مگر اس کا ایک ذاتی فائدہ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ تخیل کی وہ آنکھ جسے معمولات بند کیے رکھتے ہیں، سفر کے غیر معمولی واقعات اور مشاہدات کھول دیتے ہیں۔

اس کے بعد انسان وہ دیکھتا ہے جو سب دیکھتے ہیں، مگر وہ محسوس کر لیتا ہے جو بہت کم لوگ

کر سکتے ہیں۔ یہ وہ رزق ربانی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ راہ چلتے فقیروں کو دیتے رہتے ہیں۔ اگر اس کی عطا سے وصف بیان سے بھی کوئی حصہ مل جائے تو یہ رزق بہت سے دوسرے لوگوں تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

یہ رزق ربانی اپنی جگہ مگر میرا عجز انسانی اب میری راہ میں حائل ہو رہا تھا۔ مگر اس کے لیے بھی پروردگار نے محبت کرنے والے احباب دے رکھے تھے۔ فرخ صاحب کو مسئلہ بتایا۔ انھوں نے سلیمان صاحب کو فون کیا کہ یہ عاجز وقت سے پہلے ان کے گھر آ کر کچھ آرام کرنا چاہ رہا ہے۔ انھوں نے از راہ عنایت اس کی اجازت دے دی۔ چنانچہ پانچ بجے ان کے گھر پہنچ کر میں گھنٹہ بھر سو گیا جس کے بعد کچھ تازہ دم ہو کر ان کے گھر ہونے والی نشست میں شریک ہونے کے قابل ہو گیا۔

خواتین کی طاقت

سلیمان صاحب کا پوسٹ آفس کا بزنس تھا۔ ان کے گھر دعوت میں کئی احباب شریک تھے۔ جن میں ذوالفقار صاحب اور فرخ صاحب کے علاوہ کئی اور احباب شامل تھے۔ ان کی اہلیہ محترمہ نے بھی جو ایک ڈاکٹر تھیں، کھانے کا ویسا ہی بھرپور اہتمام کیا تھا جیسا کہ دوسری خواتین نے کیا تھا۔ باقی خواتین کی طرح ان کے سوالات بھی ان کے دینی ذوق کا اظہار تھے۔

خواتین سے متعلق میری ایک آبزرویشن ہے جسے میں قارئین اور خاص کر خواتین قارئین کے ساتھ شیئر کرنا چاہتا ہوں۔ میں مرد و خواتین کی اس مغربی مساوات کا قائل تو نہیں ہوں جس نے عورتوں کو مشقت میں ڈال دیا ہے، مگر یہ سمجھتا ہوں کہ انسانی سماج جیسے جیسے آگے بڑھ رہا ہے خواتین طاقتور ہوتی جا رہی ہیں اور ان کا کردار بڑھتا جا رہا ہے۔ عہد شکار اور عہد زراعت میں جب زندگی کے میدان میں جسمانی طاقت ہی فیصلہ کن قوت کی حامل ہوا کرتی تھی، خواتین کا

سماجی رول بہت کم تھا۔خاص کر مختلف خطرات اور بیماریوں کی بنا پر جب انسانوں کو موت کا مسلسل سامنا رہتا تھا تو خواتین کا یہ رول زیادہ اہم تھا کہ وہ اپنی طاقت اور توانائی کے بہترین ایام میں بچے جنتی رہیں تا کہ کسی قبیلے اور گروہ کو افرادی قوت میں کمی کا سامنا نہ ہو۔ظاہر ہے کہ بچے جننے کے بعد ان کی نگرانی اور پرورش خود ایک بڑا کام بن جاتا ہے۔

تاہم صنعتی دور میں صورتحال بدلنا شروع ہوئی۔مشین کی طاقت نے جسمانی طاقت کو غیر اہم کر دیا۔مختلف بیماریوں کے علاج دریافت ہونے کے بعد آبادی میں کمی کا مسئلہ حل ہو گیا۔اب دو تین بچوں کے بعد خواتین فارغ ہو جاتی ہیں۔انفارمیشن ایج میں صورتحال مزید بدلی۔اب انگلیوں کے لمس سے بڑے بڑے کام ہو جاتے ہیں۔ایسے میں دنیا بھر میں خواتین کا رول بڑھ رہا ہے اور بڑھتا چلا جائے گا۔ایسے میں ہماری خواتین کے لیے ایک راستہ یہ ہے کہ اپنے صدیوں کے سماجی کردار کی بنا پر گھر میں بیٹھ کر لایعنی گفتگو، غیبت و ظن و گمان پر مبنی باتوں، شاپنگ، دوسری خواتین سے لباس، گھر اور دیگر مادی چیزوں کے باہمی مقابلے میں اپنی زندگی کو ضائع کریں۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ ایک طرف وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ انسان بنائیں اور دوسری طرف خود اعلیٰ انسان بننے اور سماج میں اپنا کردار ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔اس معاملے میں ہماری ماؤں خدیجہ اور عائشہ رضی اللہ عنہما جیسی عظیم خواتین کا غیر معمولی ماڈل ہمارے سامنے ہے۔یہ دونوں ایک طرف اپنے عظیم المرتبت شوہر کی زبردست مددگار تھیں، اپنے بچوں کے ساتھ امت کی بھی بہترین مائیں تھیں اور دوسری طرف اپنی ذاتی حیثیت میں ایک قبائلی معاشرے میں بھی کاروباری اور علمی طور پر بہت فعال رہیں۔

اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ خواتین سطحی چیزوں سے بلند ہو جائیں۔خاندانی سیاست، فیشن اور مادیت میں مقابلہ بازی، اپنی طاقتور زبان کا غلط استعمال اور اپنے اتنے ہی طاقتور نسوانی

جمال کا بے موقع اظہار کا جذبہ وہ پست چیزیں ہیں جو خواتین کی فیصلہ کن کمزوریاں ہیں۔ان کے ساتھ وہ کبھی اعلیٰ انسان نہیں بن سکتیں نہ اپنے بچوں کو اعلیٰ انسان بنا سکتی ہیں۔

خواتین کو جنت میں اگر اعلیٰ مقام پانا ہے تو ان کو اپنی تربیت کرنا ہوگی۔علم حاصل کرنا ہوگا۔ اپنی شخصیت کو پروقار بنانا ہوگا۔اپنے وقت کے بہتر استعمال کو سیکھنا ہوگا۔انھیں یہ سمجھنا ہوگا کہ جنت میں جو مقام ایک مرد بہت سخت جدوجہد کے بعد پاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے وہ مقام حاصل کرنا بہت آسان کررکھا ہے۔خواتین کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ جنت میں جو خصوصیات انسان کو لے جانے والی ہیں، وہ اللہ تعالیٰ نے ان میں فطرتاً زیادہ رکھی ہیں۔نرمی، رحم اور ہمدردی جیسی جنتی صفات ہر خاتون میں وافر ہوتی ہیں۔بچوں کی تربیت اور دوسروں کی خدمت جیسے کام ان کی فطرت ہیں۔ان چیزوں کی موجودگی میں جنت میں جانا اور بلند درجات پانا کون سا مشکل کام ہے۔بس وہ اپنی کچھ کمزوریوں پر قابو پالیں جو اوپر بیان ہوئیں تو وہ کم کوشش سے خدا کا زیادہ قرب حاصل کرسکتی ہیں اور زیادہ بہتر انسان بن سکتی ہیں۔اور جنت بہتر انسانوں کے ہمیشہ رہنے کی جگہ ہے۔

رب کے بندے اور انسانوں کے بندے

سلیمان صاحب کے ہاں کچھ گفتگو بھی ہوئی اور سوال و جواب بھی ہوئے۔ یہ سڈنی میں دعوت کا آخری موقع تھا۔اگلے دن سے نئے سفر کا آغاز ہورہا تھا۔ برسبین، وہاں سے کینبرا اور مختصر وقت کے لیے واپس سڈنی آکر پھر ایڈیلیڈ جانا تھا۔ برسبین کے لیے صبح سویرے کی فلائٹ تھی۔اس سفر میں میرے ساتھ ذوالفقار صاحب بھی تھے۔

میں پچھلے کئی دنوں سے ذوالفقار صاحب کے ہاں مقیم تھا۔صبح وشام انھی کا ساتھ تھا۔ان کے ساتھ ہر وقت کچھ نہ کچھ علمی اور فکری چیزیں زیر بحث آتی رہتی تھیں۔اس دوران میں انھوں نے

میرے فکری سفر کا حال بھی پوچھا اپنے فکری سفر کا بھی تفصیلی ذکر کیا۔مگر یہ تفصیل کافی زیادہ تھی اس لیے انھیں کئی اقساط میں سنانی پڑی۔ اس سفر کے دوران میں اس سفر کی آخری قسطیں بھی پوری ہوگئیں۔ اِس وقت تو وہ جاوید احمد صاحب غامدی کے ادارے المورد آسٹریلیا کے کرتا دھرتا تھے،مگران کے فکری سفر کا آغاز وہی تھا جو جاوید صاحب سے وابستہ کئی اوراہم لوگوں کا تھا یعنی ڈاکٹر اسرار صاحب۔ذوالفقار صاحب ابتداء میں ڈاکٹر اسرار کے ساتھ فکری طور پر اور کسی حد تک عملی طور پر بھی وابستہ تھے۔تاہم جب انھوں نے جاوید صاحب کو سننا اور پڑھنا شروع کیا تو آہستہ آہستہ وہ جاوید صاحب کے خیالات سے متاثر ہوتے چلے گئے۔ظاہر ہے کہ یہ ایک طویل داستان تھی جس کے آخری نتیجے کو میں نے بیان کردیا ہے۔تاہم اس کا سبق یہ ہے کہ زندہ لوگ کبھی کسی عالم کی اندھی تقلید نہیں کرتے۔ وہ اپنے قائم تصورات پر ہونے والی ہر تنقید کو کھلے دل ودماغ سے پڑھتے ہیں۔پھر جو چیز قرآن وسنت کے مطابق لگتی ہے،اس کو اختیار کرتے ہیں۔

یہی وہ لوگ ہیں جو قیامت کے دن اللہ کے وفاداروں کی حیثیت میں اٹھائے جائیں گے۔ باقی لوگ جو زندگی بھر اپنے تعصّبات کے پیرو رہے،اپنے قائم کردہ تصورات کے خلاف ہر بات کو سننے سمجھنے سے انکار کردیا،ان کو ایک سخت اور کڑے احتساب کا سامنا کرنا ہوگا۔کیونکہ وہ رب کے بندے نہیں بلکہ اپنے تعصّبات اور دیگر انسانوں کے بندے بن کر دنیا میں زندہ رہے۔

برسبین اور ڈے لائٹ سیونگ

برسبین میں ہم جمعہ کی صبح پہنچے۔یکم اکتوبر کو چار پانچ دن پہلے سردیوں کے جانے پر سڈنی میں گھڑیاں ایک گھنٹے پیچھے کردی گئی تھیں تا کہ سورج کی روشنی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکے۔ ہمارے ملک میں بھی دو دفعہ یہ کام کرنے کی کوشش کی گئی۔ایک دفعہ بے نظیر صاحبہ کے دور میں جب اس فیصلے پر عملدرآمد سے قبل ہی روک دیا گیا۔جبکہ مشرف صاحب کے دور میں

ایک برس اس پر عمل ہوا۔ جس کے بعد ہمارے جیسے لوگوں کا اکثر وقت اس احمقانہ سوال کا جواب دینے میں ضائع ہوتا تھا کہ کون سا ٹائم، نیا یا پرانا؟ یہ اس بات کی عکاسی ہے کہ قوموں کو تعلیم یافتہ بنائے بغیر قانون کی سطح پر کیے گئے فیصلے نافذ کرنے کتنے مشکل ہوتے ہیں۔

برسبین میں البتہ اس کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ وہ آسٹریلیا کے مشرقی ساحل پر سڈنی سے کافی اوپر خط استوا یعنی ایکویٹر کی سمت واقع ہے اور وہاں دن پہلے ہی بڑا ہوتا ہے۔ یہاں موسم بھی نسبتاً گرم ہوتا ہے۔ ہم یہاں پہنچے تو دوسروں کا پتہ نہیں میرے حساب سے موسم نسبتاً بہتر تھا۔ یعنی تیس ڈگری کے قریب۔

سولر پینل اور شفاف فضا

یہاں ہمارے میزبان مدثر صاحب تھے۔ ائیر پورٹ سے وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے۔ ان کے گھر والے موجود نہیں تھے۔ چنانچہ ذوالفقار صاحب کے گھر کی طرح یہاں بھی مہمانوں ہی کا راج رہا۔ مدثر صاحب کا گھر ایک بہت خوبصورت وادی میں تھا اور گھر کے پچھلے حصے سے ایک جنگل کا سماں محسوس ہوتا تھا۔ دھوپ کی زیادتی کی وجہ سے یہاں لوگوں نے اپنے گھروں کی چھت پر سولر انرجی کے پینل لگا رکھے تھے اور لوگ پیدا ہونے والی بجلی حکومت کو بیچتے تھے۔

میں نے ذوالفقار صاحب سے کہا کہ ان سولر پینل کی ہر ماہ صفائی مشکل ہوتی ہوگی۔ کیونکہ پاکستان میں مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ ان پینل کو ہر ماہ صفائی کی ایسے ہی ضرورت ہوتی ہے جیسے گاڑی یا اے سی کے فلٹر کو ہوتی ہے۔ مگر انھوں نے یہ توجہ دلائی کہ یہاں فضا ہر طرح کی آلودگی سے پاک ہے اس لیے صفائی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کے کہنے سے میں نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ آسٹریلیا میں ہر جگہ فضا بالکل شفاف ملی ہے۔ آسمان کے رنگ پر ہر جگہ ہماری طرح سرمئی رنگ کے بجائے نیلا رنگ غالب رہتا تھا۔ کراچی میں کچھ عرصہ پہلے بارشیں ہوئیں تو نجانے کتنے

عرصے بعد آسمان نیلا نظر آیا تھا۔ ورنہ تو سرمئی ہی لگتا ہے۔

خدا کی کارسازی

ہم اپنے میزبان مدثر صاحب کے گھر کے پچھلے حصے میں واقع ٹیرس ہی میں بیٹھے رہے۔ وہاں سے بڑا خوبصورت منظر نظر آتا تھا۔ یہ گویا کہ جنگل کے اندر بنے ہوئے کسی ہٹ کا نقشہ پیش کررہا تھا۔ مدثر صاحب نے بتایا کہ وہ کچھ عرصے قبل ایک سخت بحران سے گزرے جس کے نتیجے میں ان کی زندگی ہر پہلو سے بہت متاثر ہوئی۔ جس کے بعد انھوں نے قرآن کریم کا مطالعہ شروع کیا۔ جب وہ قرآن مجید پڑھتے ہوئے سورہ مزمل کی اس آیت پر پہنچے۔

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا

یعنی اللہ مشرق اور مغرب کا رب ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کو اپنا کارساز بنالو تو ان کو دوبارہ نئے سرے سے زندگی شروع کرنے کا حوصلہ ملا۔ میں نے ان کی تائید میں اس آیت کا وہ مفہوم بیان کیا جو اسی جگہ سے تھوڑی دیر بعد فیس بک پر لائیو بھی بیان کیا تھا۔ یعنی ایک ایسی دنیا میں جہاں اللہ ہی جج کی کرسی پر بیٹھا ہر فیصلہ کررہا ہے، اگر اسی کو وکیل بنالیا جائے تو انسان اپنا کوئی مقدمہ کبھی نہیں ہار سکتا۔

اسی روز اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب پہلو سے مجھے اس بات کا تجربہ کرایا۔ ذوالفقار صاحب اسی روز بربین پہنچ کر کسی الرجی کا شکار ہوگئے جبکہ رات کا مرغن کھانا کھا کر بھی ان کو ایسیڈیٹی ہوگئی۔ جس کے بعد اگلے دن وہ بیمار ہوگئے۔ اس سے مجھے احساس ہوا کہ میں اس پورے سفر میں مسلسل بے آرامی، موسم اور آب وہوا کی تبدیلی، غذا اور کھانے پینے کے اوقات کی تبدیلی اور نیند کے مسائل کا شکار رہا۔ مگر الحمدللہ میں اس سب کے باوجود بیمار نہیں ہوا۔ روزانہ ہونے والے تمام پروگراموں، تقریروں اور ملاقاتوں کے علاوہ میں باہر بھی بہت گھوما پھرا۔ مگر الحمدللہ کوئی

معمول متاثر نہیں ہوا۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس دنیا میں ہر فیصلہ اللہ تعالیٰ ہی کر رہا ہوتا ہے۔ کس کو بیمار ہونا ہے کس کو نہیں ہونا، کس کو کیا ملنا ہے، کیا نہیں ملنا؛ اس کا آخری فیصلہ وہی کرتا ہے۔ اسباب اپنی جگہ مگر ان کو موثر ہونے دینا یا نہیں ہونے دینا بھی اسی کے اختیار میں ہے۔ انسان کو اسی کو اپنا کارساز بنانا چاہیے۔

تزکیہ نفس

برسبین میں ہمارا پروگرام گریفتھ یونیورسٹی میں تھا۔ موضوع تزکیہ نفس تھا۔ تقریر میں میں نے یہ عرض کیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے دین کا نصب العین بنایا ہے اور کس طرح دین کا ہر حکم اسی سے متعلق ہے۔ ساتھ میں علم نفسیات کی روشنی میں اس کے بعض دیگر اہم پہلوؤں کی طرف بھی توجہ دلائی۔

ہمارے ہاں بدقسمتی سے بعض گروہ تزکیہ نفس کے نام سے چڑتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن مجید سے واقف نہیں ہیں۔ انھوں نے تزکیہ کا نام تصوف کے حوالے سے سن رکھا ہے جس کے بعد وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کسی خانقاہی عمل کا نام ہے جس میں انسان دنیا سے کٹ کر اور سماج اور ریاست کے معاملات سے بے تعلق ہو کر زندگی گزارتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تزکیہ نفس کو قرآن جنت میں جانے کا معیار اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل دعوت قرار دیتا ہے۔ جو لوگ قرآن وسنت کی روشنی میں اس کو اپنا مقصد بناتے ہیں وہ بہترین حکمران، بہترین عالم، بہترین والدین اور سماج کے بہترین فرد بنتے ہیں۔ اس کو چھوڑ کر انسان ساری دنیا میں اسلام کی دہائی دیتا رہے، مگر اندر سے کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ وہ اندھا ہو کر دوسروں کو راہ دکھاتا ہے۔ وہ خود جہنم کے راستے کا مسافر ہوتا ہے اور دوسروں کی جنت وجہنم کے فیصلے کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت ہمارے معاشرے میں مذہب کے نام پر

ایسے ہی اندھے راہ دکھانے والے جگہ جگہ مل جاتے ہیں۔ ان کی اندھی سوچ کے خلاف لڑنا اس وقت سب سے بڑا جہاد ہے۔ ورنہ یہ لوگ خود بھی کھائی میں گریں گے، باقی لوگوں کو بھی گرائیں گے۔

برسبین کی بہترین ٹیم

برسبین کا پروگرام انتظامی طور پر بہت شاندار تھا۔ خاص طور پر اس پس منظر میں اس کے منتظمین بھی اس پروگرام کے لیے پہلی دفعہ اکٹھے ہوئے تھے۔ ان میں مدثر صاحب کے علاوہ، عمار اور دو خواتین اسما اور ارم بھابھی پیش پیش تھیں۔ عمار انڈیا سے پڑھنے کے لیے یہاں آئے ہوئے تھے۔ اسما کوئنز لینڈ یونیورسٹی میں پڑھاتی تھیں جبکہ ارم بھابی ایک اشاعتی ادارے میں مینیجر تھیں۔ ان سب نے بڑی محنت سے یہ پروگرام آرگنائز کیا تھا۔ کچھ دوسرے لوگ بھی معاونین میں تھے لیکن وہ اس نشست میں شریک نہ تھے۔ اس ٹیم کے ہر شخص کا اپنا رول تھا اور یہ پوری ٹیم ہی قابل تحسین تھی، مگر اسما اور ارم بھابھی نے اس پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے غیر معمولی محنت کی تھی، جس پر وہ مبارکباد کی مستحق تھیں۔ خاص کر اس پس منظر میں کہ ہمارے ہاں خواتین فرنٹ پر آ کر کوئی کام نہیں کرتیں، مگر ان دونوں نے اس روایت کو توڑ دیا اور بہترین کام کیا۔ یہ اس ٹیم ہی کا کمال تھا کہ میں برسبین میں جمعہ پڑھ کر مسجد سے باہر نکلا تو میرے پروگرام کے پمفلٹ میرے ہی ہاتھ میں پکڑا دیے گئے۔ غالبًا انھی لوگوں نے کچھ نوجوانوں کو مساجد کے باہر پمفلٹ تقسیم کرنے کی ڈیوٹی پر لگایا ہوگا۔

والدین اور بچے

رات کے کھانے پر ہم ایک انڈین ریسٹورنٹ میں ایک ساتھ جمع تھے۔ ارم بھابھی کے شوہر احتشام صاحب اور ان کا چھوٹا بیٹا نادر بھی ساتھ موجود تھا۔ دوسرا بیٹا زید یہاں نہیں تھا لیکن

پروگرام میں موجود تھا۔اس دوران میں کافی چیزوں پر گفتگو ہوئی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ان کے بیٹے نے گفتگو میں حصہ لیا۔عام طور پر لوگ اپنے بچوں کو ایسی مجالس میں نہیں لاتے۔ کیونکہ بچے ان چیزوں سے کچھ بھاگتے ہیں۔لیکن والدین کسی طرح بچوں کو آمادہ کرلیں تو پھر بچوں کی شخصیت پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔

یہی بات میں نے مدثر صاحب سے ایک دوسرے پہلو سے عرض کی تھی۔ان کی بھی ایک بچی تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ جب دعوت کے کام میں لگیں گے تو اس کا ایک اثر آپ کی اولاد پر پڑے گا۔ پھر یہی بچے جو غیر مسلموں کے درمیان پلے بڑھے ہیں،ان لوگوں پر اصل دعوت کا کام یہی لوگ کریں گے۔ کیونکہ یہ ان کے کلچر،محاورے اور افکار سے کہیں زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔مگر شرط یہ ہے کہ والدین بچوں کی تربیت پر توجہ دیں۔

عالم اور داعی کا امتحان

اسماء نے گفتگو میں کسی موقع پر یہ کہا کہ لوگ سیلیبرٹی سے ملنے سے خوش ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ لوگ سیلیبرٹی ہونا بڑی بات سمجھتے ہیں۔ حالانکہ دین کے اعتبار سے سیلیبرٹی ہونا ایک خوفناک امتحان میں کودنے کے مترادف ہے۔آپ جیسا ایک عام کارکن اپنا کام کر کے اللہ سے بہترین اجر پالے گا۔مگر پبلک میں نمایاں ہونے والے ایک شخص کو سخت ترین احتساب سے گزرنا ہوگا۔اس لیے کہ لوگوں کی تعریف سننے اور سیلیبرٹی بننے کے بعد نفس بہت آلودہ ہوجاتا ہے۔ ریاکاری،خودنمائی،حب جاہ،خودستائی اور خودپسندی جیسے امراض اتنی خاموشی سے انسان کو لاحق ہوجاتے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہوتا۔ یہ وہ امتحان ہے جس سے کم لوگ ہی سرخرو ہوسکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی عالم یا داعی کو کیا کرنا ہے، اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کر چکے ہیں۔ وہ جس سے جو کام لینا چاہتے ہیں لے لیتے ہیں۔اس عالم کا فیصلہ اس کے اِس کام پر نہیں ہوگا۔ بلکہ اس

پر ہوگا کہ اس نے کس جذبے سے یہ سب کچھ کیا۔ خود اس کا اپنا عمل کیا رہا۔ دنیا میں کسی کی شہرت ہونا اور لوگوں کا اس کو سننے کے لیے جمع ہوجانا ایک بہت بڑا امتحان ہے۔ کسی داعی کو اس امتحان کا اندازہ ہوجائے تو اس کے ہر لفظ کا مخاطب دوسروں سے پہلے اس کی اپنی ذات بن جائے۔ یہی وہ چیز ہے جو آج کے اکثر دینداروں میں ناپید ہے۔

فرشتوں کا سیکیورٹی الارم

اگلی صبح ہم فجر کے بعد ناشتہ کرکے ایئر پورٹ کے لیے نکلے۔ مدثر صاحب نے ایئر پورٹ تک چھوڑ دیا تھا۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ ان کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ وہ چونکہ یہاں کی سوسائٹی کے ساتھ عملی طور پر جڑے ہوئے ہیں یعنی کمیونٹی واچ کا حصہ ہیں اس لیے ان کے پاس یہاں کے معاشرے کے بارے میں بڑی معلومات تھیں۔ جس سے مجھے یہاں کی زندگی اور معاشرے کو سمجھنے میں مدد ملی۔ اسی طرح ان کی بہترین میزبانی کی بنا پر ان کے گھر کا ایک دن کا قیام بہت خوشگوار رہا تھا۔ ہماری اگلی منزل کینبرا تھی جو کہ آسٹریلیا کا دارالحکومت تھا۔

مجھے برسبین ایئر پورٹ پر ایک عجیب تجربہ ہوا۔ میں گھر سے ایسے کپڑے پہن کر نکلا جس پر دھاتی بٹن تھے۔ یہ لباس ابھی تک نہیں پہنا تھا۔ اس لیے سیکیورٹی چیکنگ سے قبل اندیشہ ہوا کہ ان کی وجہ سے الارم بج گیا تو خواہ مخواہ میں تفصیلی چیکنگ میں وقت ضائع ہوگا۔ تاہم ایسا نہیں ہوا اور میں اطمینان سے آگے بڑھ گیا۔ اس لمحے مجھے یہ احساس ہوا کہ ہم لوگ کس طرح یہ بات بھول کر جیتے ہیں کہ کتنے ہی بوجھ ہم نے وہ اٹھا رکھے ہیں، جن کو خدا کے فرشتے روز حشر جب چیک کریں گے تو الارم بجنا ہی بجنا ہے۔ مگر ہم کسی غلطی کی وجہ سے نہیں بلکہ جانتے بوجھتے معصیت و نافرمانی کے ان بوجھوں سے لدے پھرتے ہیں۔ ہمیں کوئی اندیشہ نہیں ہوتا کہ ہمیں روک لیا گیا تو ہمارا کیا حشر ہوگا۔ انسان کو یہ احساس ہوجائے تو وہ بڑے گناہوں کے ساتھ چھوٹے گناہوں

سے بھی بچتا رہے اور مسلسل توبہ کرتا رہے۔

میگنا کارٹا اور مکڑی کا جالا

میں اور ذوالفقار صاحب تقریبا دو گھنٹے میں برسبین سے کینبرا کے چھوٹے سے ائیر پورٹ جا پہنچے۔ اگر تین چار لاکھ کی آبادی کو شہر کہا جاسکے تو کینبرا واقعی ایک شہر تھا۔ لیکن اس آبادی کے ساتھ بھی یہ آسٹریلیا کا سب سے بڑا غیر ساحلی شہر ہے۔ اس شہر کو ملبورن اور سڈنی کے درمیان دارالحکومت بننے کا جھگڑا نمٹانے کے لیے الگ سے بنایا گیا تاکہ ان دونوں کے بجائے ایک تیسری جگہ کو یہ اعزاز مل سکے۔ اسے ایک گارڈن سٹی کے طور پر بنایا گیا ہے اور شہر میں ہر جگہ درخت اور پارکس موجود ہیں۔

ائیر پورٹ پر ہمارے میزبان جناب تنویر خان صاحب ہمارے منتظر تھے۔ وہ ہمیں پہلے پارلیمنٹ ہاؤس لے گئے۔ یہاں ہم اطمینان سے پارلیمنٹ کے اندر گئے اور تمام مقامات کا بلا روک ٹوک جائزہ لیا۔ نیشنل اسمبلی جسے یہاں ایوانِ نمائندگان کہا جاتا ہے اور سینیٹ دونوں کو دیکھا۔ یہاں کے نظام کی تفصیل سمجھی۔ ایک جگہ میگنا کارٹا کو دیکھا۔ یہ وہ دستاویز ہے جس نے جدید دنیا کو یہ اصول دیا کہ کوئی بھی شخص بشمول بادشاہ وقت قانون سے بلند نہیں ہوتا۔ یہ دستاویز انگلینڈ کے بادشاہ جون نے 1215 عیسوی میں لکھوائی۔ مگر یہاں اس کا آخری محفوظ نسخہ جو کہ 1297 کا تھا موجود تھا۔ اس کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا تھا کہ کوئی قانون سے بلند نہیں ہے اور یہی جدید دنیا میں قانونِ سیاست کا بنیادی اصول ہے۔

قانون کی حکمرانی کا جو عملی نمونہ دنیا کے سامنے خلافت راشدہ نے پیش کیا تھا، آج ہمارے لیے بالکل اجنبی ہے۔ ہمارے ہاں قانون مکڑی کا جالا ہے۔ کوئی کمزور اس سے نکل نہیں سکتا اور کسی طاقتور کو یہ پکڑ نہیں سکتا۔ میرے خیال میں ہماری پارلیمنٹ میں میگنا کارٹا کے بجائے مکڑی

کے جالے کی تصاویر لگا دینا چاہئیں۔اس سے کم از کم منافقت کا خاتمہ تو ہو ہی جائے گا۔

تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں جمہوری نظام کا بوریا بستر لپیٹنے کی بات کر رہا ہوں۔ ہمارے جیسے لوگوں کا کام جمہوریت پر تنقید کرنا ہے، اس کو ختم کرنے کی حمایت کرنا نہیں ہونا چاہیے۔ ہماری جمہوریت کو اصلاحات کی ضرورت ہے۔ایک اصلاح جو ہم کینبرا سے لے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ آسٹریلیا کی طرح ہمارے ہاں بھی الیکشن ہر تین سال بعد ہوں۔اس کے بعد ہی حکمرانوں کو یہ احساس ہوگا کہ اب پانچ کے بجائے تین سال بعد عوام کے سامنے جانا ہے۔تب ہی ان کے معاملات بہتر ہوں گے۔اس وقت چونکہ کرپشن اوپر سے نیچے تک پھیلی ہوئی ہے اس لیے پاکستانی سیاسی اشرافیہ کا احتساب قانونی ڈھانچے میں رہ کر کرنا آسان نہیں۔ زیادہ موثر احتساب یہی ہے کہ حکمران عوام کے سامنے بار بار اور جلدی جلدی جائیں۔ساتھ ہی شفاف الیکشن کو یقینی بنایا جائے۔اس کے بعد پچاس میں آنے والی تبدیلی پچیس سال میں آجائے گی۔

پاکستانی سفیر کے بچوں کی تعلیم

پارلیمنٹ سے نکل کر ہم لوگ دوبارہ گاڑی میں بیٹھے اور تنویر خان صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔راستے میں پاکستانی سفارتخانہ بھی دیکھا۔اسے دیکھ کر وہ واقعہ یاد آ گیا جو ذوالفقار صاحب نے اسی سفر میں کسی موقع پر سنایا تھا۔آسٹریلیا میں ان کے زمانہ تعلیم میں کسی موقع پر پاکستان کے سفیر طلباء کی کسی تقریب میں مدعو تھے۔جب سوالات کچھ تند و تیز ہونے لگے تو فرمایا کہ بھئی میں تو اپنے بچوں کو پڑھانے کے لیے یہاں آیا ہوا ہوں۔

تنویر خان صاحب کے گھر پہنچے تو ایک دفعہ پھر ایک زبردست دعوت ہماری منتظر تھی۔کھانے کے بعد سڈنی سے ہمارے تین ساتھی آ گئے۔ان میں کامران مرزا صاحب فرخ صاحب اور عابد صاحب شامل تھے۔ان کو دیکھ کر اتنی ہی خوشی ہوئی جتنا پردیس میں اپنے ہم وطنوں کو دیکھ کر ہوتی

ہے۔ان تینوں نے پروگرام کا انتظام سنبھالا جو کہ تنویر صاحب کے گھر کے لان میں ہونا تھا۔ کینبرا کی ٹھنڈی ہوا میں باہر بیٹھ کر پروگرام کرنا ایک مشکل کام تھا لیکن اللہ نے آسان کر دیا۔ جب تک میں گفتگو کرتا رہا مجھے کسی لمحے ٹھنڈ نہیں محسوس ہوئی، حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب مجلس میں بیٹھی بعض خواتین اٹھ کر گھر میں گئیں اور اندر سے شال لا کر ان کے ذریعے سے سردی سے اپنا بچاؤ کرنے لگیں۔تاہم پروگرام ختم ہوا تو ایک دم سے محسوس ہوا کہ سخت سردی ہو چکی ہے۔جائے عافیت یہی تھی کہ اندر جایا جائے اور ہیٹر کی گرمی میں بیٹھ کر غیر رسمی کوئی بات چیت ہے تو کی جائے۔

انذار اور قرآن

پروگرام سے قبل ایک دوست نے انذار کے حوالے سے میرا نقطہ نظر جاننا چاہا۔میں نے اپنا جو نقطہ نظر ان کے سامنے رکھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سورہ توبہ (122:9) میں اللہ تعالیٰ نے دین کے طالب علموں کو جب انذار کا منصب دیا ہے تو اس کی شرط یہ رکھی ہے کہ وہ تفقہ فی الدین یا دین میں گہری بصیرت حاصل کریں۔اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے انذار بالقرآن کی وہ بات جو بعض دوسرے مقامات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان کی ہے، اس موقع پر بالکل حذف کر دی۔اگر یہ شرط ہوتی تو اس موقع پر لازماً بیان ہو جاتی۔

میرے نزدیک قرآن کریم نے یہاں اپنا مدعا صاف بیان کر دیا ہے۔دین طالب علموں کے لیے انذار کا ماخذ تفقہ فی الدین ہوگا۔اس میں یقیناً سب سے بنیادی چیز قرآن مجید ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے پابند نہیں کیا کہ ایک داعی جب لب کھولے قرآن ہی کی کوئی آیات پڑھے اور پھر خاموش ہو کر بیٹھ جائے۔اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔اول یہ کہ دین کی دعوت کل انسانیت کے لیے ہے۔ ہر شخص عربی نہیں سمجھتا نہ قرآن کو براہ راست سمجھ سکتا ہے۔اسے ترجمہ

پڑھنا ہوگا جو یقیناً کسی انسان ہی نے کیا ہوگا۔ ترجمہ، ترجمہ ہوتا ہے، وہ خدائی کلام نہیں رہتا، اس میں انسانی فہم داخل ہو جاتا ہے۔ انذار بالقرآن کی شرط اسی لمحے ناقابل عمل ہو جاتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انذار صرف آخرت میں خدا کے حضور پیشی کی بات سنا کر ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ یہ بتانا پڑتا ہے کہ کن چیزوں کے کرنے سے انسان خدا کی پکڑ سے بچ سکتا ہے اور کن چیزوں سے اس کی رضا ملتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ قرآن ہی نہیں پورا دین زیر بحث آ جائے گا جس کا بیشتر عملی حصہ قرآن میں نہیں سنت میں ہے۔ پھر قرآن کی شرح وضاحت بھی اسی کام کا لازمی جز ہے۔ یہ سب چیزیں قرآن سے باہر کی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے جو شرط لگائی ہے وہ تفقہ فی الدین کی ہے جو ایک انتہائی معقول اور بہترین بات ہے۔

جہاں تک بعض دیگر بیانات کا تعلق ہے جن سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ انذار کا مطلب ہی یہ ہے کہ قرآن پڑھ کر سنا دیا جائے تو ان کا ایک موقع محل ہے۔ ان آیات کا تعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم سے ہے۔ قرآن مجید اس قوم کے لیے ایک پیغام ہی نہیں ایک فیصلہ کن حجت بھی تھا اور لاجواب کر دینے والا ایک معجزہ بھی۔ یہ انھی کے حالات، انھی کے پس منظر، انھی کی زبان اور انھی کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کے تناظر میں نازل ہو رہا تھا۔ وہاں تو ہونا ہی یہ چاہیے تھا کہ قرآن سنایا جاتا اور اسی کی بنیاد پر اپنا پیغام لوگوں کو پہنچایا جاتا۔

تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قرآن بعد کے لوگوں کے لیے اپنی معنویت کھو چکا ہے۔ ابھی بھی قرآن ہی محور و مرکز ہے۔ تفقہ فی الدین میں پہلی چیز قرآن پر گہری نظر ہے۔ قرآن سے بے بہرہ رہ کر اور اس کی بنیاد سے ہٹ کر کسی بنیاد پر کوئی انذار نہیں ہو سکتا نہ کوئی دین بیان ہو سکتا ہے۔ ہر تقریر اور ہر تحریر اسی کی بنیاد پر ہوگی۔ قرآن کا کوئی متبادل نہیں۔ لیکن صرف قرآن کو ہاتھ میں لے کر اسے سننے سنانے کی شرط کی کوئی اساس، دین کے طالب علموں کے لیے تو یہ ادنیٰ

طالب بالکل نہیں پاتا۔ ہاں عام لوگوں کے لیے یہی محفوظ راستہ ہے کہ کبھی دو چار لوگوں کو مخاطب بھی کرنا ہو تو قرآن ہاتھ میں اٹھالیں اور اسے ہی سنائیں۔

دین کی روح اور دین کا ظاہر

پاکستانی کمیونٹی ہر جگہ ہی تاخیر سے پہنچنے کی عادی تھی، اس لیے پروگرام اپنے وقت پر شروع نہیں ہوسکا۔ پہلے کچھ سوال جواب ہوئے اور پھر باقاعدہ گفتگو ہوئی۔ آج کی گفتگو میں اس طالب علم نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ دین کے ہر حکم کا ایک ظاہر ہوتا ہے اور ایک اس کے اندر کارفرما روح ہوتی ہے۔ امت کا عظیم المیہ یہ ہے کہ اس میں اول تو وہ احکام نیکی اور تقویٰ کا معیار بن گئے ہیں جو اصلاً مطلوب نہیں یا پھر ان کی وہ اہمیت نہیں جو دی جاتی ہے۔ جو مطلوب احکام ہیں ان میں بھی روح کا بالکل خیال نہیں رکھا جاتا ہے۔ پھر میں نے ایمان، نماز، روزہ، حج اور زکوۃ وغیرہ جیسے اہم اور بنیادی احکام کو لے کر ان کی روح کو واضح کیا۔

مثلاً ایمان کی روح یہ بیان کی ہے کہ قرآن مجید کے مطابق ایمان کی روح سچائی کو مان لینا ہے۔ مشرکین مکہ کے لیے یہ سچ ایک خدا پر ایمان تھا اور آج کے مسلمانوں کے لیے یہ سچ اپنے فرقہ وارانہ تعصّبات سے بلند ہو کر سچائی کو ماننا ہے۔ ایمان کی یہ روح موجود نہیں تو ایمان کی حقیقت کو ہم نے نہیں پایا۔

الوداع سڈنی

پروگرام کے بعد بھی کچھ سوال و جواب ہوئے۔ ہم نے تنویر خان صاحب اور ان کے اہل خانہ کا شکریہ ادا کیا۔ پھر کامران مرزا صاحب کی گاڑی میں سڈنی روانہ ہوئے۔ راستہ انتہائی خوبصورت اور دلکش مناظر سے پر تھا۔ راستے میں ایک جھیل ایسی آئی جو بقول عابد صاحب کے چالیس برس بعد بھری تھی۔ کچھ دیر رک کر ہم نے یہاں کی خوبصورتی کو انجوائے کیا۔ گرچہ اس

شدید ٹھنڈ میں ماحول کو بہت زیادہ انجوائے کرنے کی گنجائش نہ تھی۔

میں چونکہ دو دن سے صبح چار بجے ہی بیدار ہو رہا تھا اور سونے میں کچھ تاخیر ہو رہی تھی، پھر اگلے دن ہی صبح سویرے ایڈیلیڈ کی فلائٹ تھی، اس لیے آج جلدی سونا لازمی تھا۔ چنانچہ میں نے درخواست کی کہ مجھے راستے ہی میں ڈنر سے فارغ کر دیا جائے۔ باقی لوگوں کا خیال تھا کہ اپنے اپنے گھر پہنچ کر کھانا کھایا جائے۔ چنانچہ ایک جگہ ایک پٹرول پمپ پر مجھے سب وے برگر اور کافی کی شکل میں ڈنر کرا دیا گیا۔ ڈھائی تین گھنٹے کے سفر کے بعد ہم سڈنی پہنچے۔

صبح سویرے ایڈیلیڈ جانے کے لیے ہم وقت سے پہلے گھر سے نکلے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ساڑھے سات بجے ذوالفقار صاحب کا درس قرآن تھا۔ یہ انھی لوگوں کا حوصلہ تھا کہ ہر اتوار کو چھٹی والے دن اپنی نیند خراب کر کے درس کے لیے ایک جگہ جمع ہوتے تھے۔ اسی جذبے نے ماشاء اللہ ان کو ایک بہت اچھی ٹیم بنا دیا تھا۔ ہمیں ائیر پورٹ لے جانے کے لیے المورد کے ممبر بلال صاحب تشریف لائے تھے۔ یہ ارم بھابھی کے دیور تھے اور پاکستان ائیر فورس سے ریٹائر ہو کر یہاں آئے تھے۔

ائیر پورٹ پر ذوالفقار صاحب کو الوداع کہا۔ یہاں فرخ صاحب مل گئے۔ وہ میرے ساتھ ایڈیلیڈ جا رہے تھے۔ مختلف مراحل سے گزر کر ہم ویٹنگ لاؤنج میں جا بیٹھے۔ کچھ دیر میں جہاز اڑا تو سڈنی کا الوداعی منظر سامنے تھا۔ اس شہر سے زیادہ میری نظر میں یہاں کے ان احباب کے چہرے تھے جو ایک ہفتہ ساتھ ساتھ رہے۔

سچی بات یہ ہے کہ ملبورن کے دوستوں کی طرح سڈنی کے احباب نے بھی اپنی محبتوں کا اسیر کر لیا تھا۔ ان آٹھ دس دنوں میں انھوں نے کبھی اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ ذوالفقار صاحب نے ہر پہلو سے بہت خیال رکھا۔ دوسرے شہروں میں بھی وہ مسلسل رابطے میں رہے۔

اللہ کریم ان سب احباب کے علم و عمل میں برکت عطا فرمائے۔

نیند کی نعمت

اس دفعہ سفر میں فرخ صاحب میرے ساتھ تھے۔ان کے ساتھ ہونے کی وجہ سے یہ سفر بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔انھوں نے دفتر سے چھٹیاں لے رکھیں تھیں اور پچھلی کئی دنوں سے میری وجہ سے مختلف پروگراموں میں مصروف رہے تھے۔وولون گونگ کے سفر میں جب میں ان کے ساتھ گیا تھا تو کم نیند کی وجہ سے میں بہت اچھا محسوس نہیں کر رہا تھا۔اس سفر میں ان سے کم ہی بات ہو سکی تھی۔یہ بات میں نے فرخ صاحب کو بتا کر کہا کہ آپ پچھلے سفر کی وجہ سے مجھے بدمزاج مت سمجھیے گا۔

نیند اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب نعمت ہے۔حیاتیاتی طور پر اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان کے تمام نظام اپنی توانائی بحال کرتے ہیں۔اعصاب، عضلات، ہڈیاں اور انسانی امیون سسٹم نیند کے بعد پوری طرح تر و تازہ ہو جاتا ہے۔نیند پوری نہ ہو تو انسان ذہنی، جسمانی، نفسیاتی غرض ہر اعتبار سے کمزور اور غیر فعال ہوتا چلا جاتا ہے۔اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ سب سے بڑا تشدد یہ ہے کہ کسی شخص کو نیند پوری نہ لینے دی جائے۔اس پہلو سے نیند بہت بڑی نعمت ہے۔

قرآن مجید نیند کو ایک دوسرے پہلو سے بھی زیر بحث لایا ہے۔یہ پہلو قیامت کے بعد زندگی کی تمثیل کا ہے۔ہم روزانہ سوتے ہیں تو یہ دراصل موت کی تمثیل ہوتی ہے۔سونے کے بعد ہم پوری دنیا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔وقت گویا کہ معطل ہو جاتا ہے۔باہر کچھ بھی ہوتا رہے ہمیں کچھ خبر نہیں ہوتی۔یہاں تک کہ ہماری آنکھ کھل جاتی ہے۔

یہی ہماری موت کے وقت ہمارے ساتھ ہو جاتا ہے۔ہم خارج کی دنیا سے کٹ جاتے ہیں۔وقت ہمارے لیے معطل ہو جاتا ہے۔پھر روزِ قیامت ہم اسی طرح زندہ کیے جائیں گے

جیسے سونے کے بعد دوبارہ بیدار ہوتے ہیں۔ بظاہر موت کے بعد زندگی کا معاملہ بہت بعید اور عجیب لگتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا تجربہ ہم روزانہ کررہے ہیں۔ بس غور نہیں کرتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سونے اور جاگنے کی دعائیں اس چیز کا بڑا واضح بیان ہے کہ آپ کے لیے سونا اور جاگنا قیامت کی پیشی کا ایک زندہ تجربہ تھا۔ کاش ہم لوگ بھی اس احساس میں سونے جاگنے والے بن جائیں۔

ایڈیلیڈ کا شہر

آسٹریلیا کے تمام اہم اور بڑے شہر ساحل سمندر پر ہیں۔ یہی معاملہ ایڈیلیڈ کا ہے۔ یہ آسٹریلیا کے جنوبی ساحل پر واقع ہے اور ریاست جنوبی آسٹریلیا کا مرکزی شہر ہے۔ اس کی آبادی تقریباً تیرہ لاکھ ہے اور یہ آسٹریلیا کا پانچواں بڑا شہر ہے۔

سڈنی سے یہاں پہنچتے ہوئے ہمیں دو گھنٹے لگے اور اس عرصے میں وقت میں آدھ گھنٹے کا فرق پڑ چکا تھا۔ وہاں پہنچ کر ہم نے اپنی گھڑیاں آدھا گھنٹا آگے کرلیں۔ تاہم یہاں موسم سڈنی کے مقابلے میں ٹھنڈا تھا اور ہوا کافی تیز تھی۔ ائیر پورٹ پر اترے تو ہمارے میزبان عامر اور ان کے ساتھ آصف خان صاحب موجود تھے۔

عامر نے ہماری رہائش کا بندوبست ایک ہوٹل میں کررکھا تھا۔ راستے میں گزرتے ہوئے یہاں برسبین جیسا تاثر قائم ہوا۔ یعنی جیسے وہ ایک شہر سے زیادہ قصبہ لگ رہا تھا یہاں بھی یہی معاملہ تھا۔ برسبین کی آبادی اس سے دس لاکھ زیادہ یعنی 23 لاکھ کے قریب تھی۔ وہاں کا انفراسٹرکچر بھی کچھ بہتر تھا۔ جبکہ یہاں قصباتی پہلو کچھ زیادہ لگا۔ لیکن یہ قصبے ہمارے بڑے بڑے شہروں سے بہت بہتر تھے۔ جس ملک کی اشرافیہ کی ساری توجہ صرف اپنی آل واولاد کی طرف ہو اور اس ملک کی فکری قیادت کی ساری توجہ اپنے قومی مسائل سے زیادہ ملک سے باہر

کے مسائل کی طرف ہو، اس کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔

حلقہ یاراں

ایڈیلیڈ آسٹریلیا کے حلقہ یاراں کے وسیع تر ہونے کی جگہ ثابت ہوئی۔ یہاں کا مرکز تو ہمارے میزبان عامر صاحب تھے۔ ان کی محبتوں سے ایڈیلیڈ کا قیام بہت خوشگوار رہا۔ یہاں میرا پروگرام تو اِسی دن یعنی اتوار کو ہو گیا تھا، تاہم پرتھ روانگی دو دن کے بعد تھی۔ انھوں نے میری آمد پر دفتر سے دو دن کی چھٹی لے رکھی تھی اور یہ دو دن میرے لیے ہی وقف کیے رکھے۔ وہ نہ ہوتے تو یہ دو دن ہوٹل ہی کی نذر ہو جاتے۔

ہوٹل میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد عامر دوبارہ آ گئے اور ان کے ساتھ ہم طاہر صاحب کے ہاں دوپہر کے کھانے کے لیے روانہ ہوئے۔ یہاں پہنچے تو ایک بھرپور دعوت ہماری منتظر تھی۔ تاہم اس دعوت کی انفرادیت یہ تھی کہ کھانے پر موجود تمام ڈشیں طاہر صاحب نے خود بنائی تھیں اور بہت خوب بنائی تھیں۔ ان کی اہلیہ ڈاکٹر تھیں اور طاہر صاحب کی اس اضافی خصوصیت کا ان کو بہت فائدہ تھا۔ کھانے پر ڈاکٹر احمد صاحب بھی موجود تھے اور شام کو ان کے ہاں ہم سب کی دعوت تھی۔

آج کے پروگرام ہی میں دو مزید دوستوں شریف صاحب اور ڈاکٹر ہارون صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ شریف صاحب کچھ عرصہ قبل اپنی فیملی کے ساتھ کراچی سے یہاں آئے تھے اور ڈاکٹر ہارون عرصے سے ایڈیلیڈ ہی میں مقیم تھے۔

انذار و بشارت

ایڈیلیڈ میں پروگرام یونیورسٹی آف ساؤتھ آسٹریلیا کے مک گل کیمپس میں ہوا۔ مجھے گفتگو کا جو موضوع دیا گیا وہ انذار و بشارت تھا۔ میں نے قرآن مجید کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم کی اس عالمی حیثیت کو واضح کیا کہ آپ کو تا قیامت تمام لوگوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے۔اب یہ آپ کی امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس پیغام کو انسانیت تک پہنچائے۔اس میں عام آدمی کا کیا کردار اور اہل علم کی کیا ذمہ داری ہے اس کو میں نے قرآن مجید کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی۔ پروگرام کے بعد سوال وجواب کا سلسلہ ہوا اور پھر چائے وغیرہ کے بعد محفل اختتام کو پہنچی۔

میرا تاثر یہ ہے کہ مسلمانوں کو دنیا سے اپنے تعلق کی درست نوعیت کا بالکل شعور نہیں ہے۔ ختم نبوت کے بعد مسلمان دراصل ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے قائم مقام ہیں۔اب انھی کے ذریعے سے دنیا کو خدا کا پیغام براہ راست ملے گا۔قوم اور نبی کا تعلق داعی اور مدعو کا تعلق ہوتا ہے۔ نبی کے پاس اپنی قوم کی امانت یعنی حق کا پیغام ہوتا ہے۔

کتنی غیر معمولی بات ہے کہ عنقریب اس دنیا کو مٹا کر ایک نئی دنیا بنائی جانے والی ہے۔ جہاں صرف جنت ہوگی یا پھر جہنم اور تمام انسان ان دو میں سے کسی ایک جگہ موجود ہوں گے۔اس انتہائی غیر معمولی واقعے کی پوری اور مکمل اطلاع جن لوگوں کے پاس ہے ان کو اس اطلاع کو دوسرے لوگوں تک پہنچانے میں کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو جنت سے واقف ہیں لیکن اس کی خوشخبری دوسروں کو نہیں دینا چاہتے۔ کیسے عجیب ہیں وہ لوگ جو جہنم کو جانتے ہیں، مگر اس کی آگ سے دوسروں کو خبردار نہیں کرنا چاہتے۔اس کا حقیقی مطلب یہ ہے کہ پانے والوں نے نہ جنت کو پایا ہے نہ جہنم کو۔ جب پایا ہی نہیں تو دوسروں کو کس چیز کی بشارت دیں گے اور دوسروں کو کس چیز سے خبردار کریں گے۔

دعوت کی ڈی جیور و اور ڈی فیکٹو حیثیت

پروگرام سے نکل کر ہم ڈاکٹر احمد صاحب کے ہاں روانہ ہوئے۔فرخ صاحب کے علاوہ اس

نشست میں ڈاکٹر ہارون، ڈاکٹر قیوم، طاہر صاحب، آصف صاحب اور عامر کے ساتھ ان کے بھائی شاہد بھی موجود تھے۔

اس نشست میں احباب سے بہت سے امور پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ جو ایک اہم بات میں نے احباب کے سامنے رکھی وہ یہ تھی کہ ہمارا کام لوگوں کو دین کی دعوت پہنچانا ہے۔ لوگ مانیں نہ مانیں، سنیں نہ سنیں، بدلیں نہ بدلیں یہ سب ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہماری توجہ اصلاً صرف اس طرف رہنا چاہیے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے اور جتنے لوگوں تک ممکن ہو سکے ہم حق کا پیغام پہنچا دیں۔

یہ ہمارے کام کی ڈی جیورو یعنی قانونی حیثیت ہے۔ تاہم ڈی فیکٹو یا حقیقی معاملہ یہ پیش آتا ہے کہ دعوت کا کام کبھی بے فائدہ نہیں جاتا۔ کچھ نہ کچھ لوگ ضرور بدلتے ہیں۔ ضرور اثر لیتے ہیں۔ یہ وہ سلیم الفطرت لوگ ہوتے ہیں جو پہلے ہی سے حق کو تلاش کر رہے ہوتے ہیں یا ناحق سے غیر مطمئن ہوتے ہیں۔ ان کو جیسے ہی صحیح بات نظر آتی ہے یہ اس کی طرف ایسے لپکتے ہیں جیسے کوئی پیاسا صحرا میں کسی کنویں کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑتا ہے۔

دعوت کا دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری اپنی شخصیت ہمیشہ بہتری کی طرف گامزن رہتی ہے۔ دوسرے بدلیں نہ بدلیں ہم ضرور بدل جاتے ہیں۔ یہی سب سے بڑا فائدہ ہے۔

ریڈ بیک اسپائڈر

آسٹریلیا میں جب سے آیا تھا اس مکڑی کا بہت ذکر سنا تھا۔ یہ مکڑی صرف یہیں پائی جاتی ہے اور آسٹریلیا کی سب سے زہریلی مخلوق ہے۔ یہاں بھی طاہر صاحب نے اس کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔ یہ مکڑی عام گھروں میں پائی جاتی ہے اور کاٹ لے تو فوراً موت واقع ہو جاتی ہے۔ میں ہمیشہ کوشش کرتا ہوں کہ لوگوں سے سیکھتا رہوں۔ میرے ذہن میں ایک بنیادی

سوال یہ تھا کہ اتنی خطرناک چیز اگر گھروں میں پائی جاتی ہے تو شرح اموات تو بہت زیادہ ہونا چاہئیں۔اس سوال نے مجھے بے چین کررکھا تھا۔ چنانچہ اس نشست میں جہاں تین ڈاکٹر موجود تھے یعنی ڈاکٹر احمد، ڈاکٹر قیوم اور ڈاکٹر ہارون، میں نے ان سے اس حوالے سے معلومات لیں۔

ڈاکٹر ہارون نے مجھے بتایا کہ اس مکڑی کا زہر تکلیف دہ تو بہت ہے، مگر نہ فوری موت واقع ہوتی ہے اور نہ یہ نا قابل علاج ہے۔ بلکہ ڈاکٹر با آسانی علاج کر دیتے ہیں۔ بعد میں خود میں نے انٹرنیٹ پر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ کاٹنے کا یہ کام مادہ مکڑی ہی کرتی ہے اور یہ اپنے جالے سے عام طور پر باہر نہیں نکلتی۔اس لیے وہی لوگ زد میں آتے ہیں جو کسی وجہ سے اس کے جالے کے قریب جائیں۔ یوں نہیں ہے کہ رات سوتے ہوئے یہ کسی کے اوپر چڑھ کر اسے کاٹ لے۔ مزید یہ کہ سن 1956 میں اس کے زہر کا تریاق دریافت ہو گیا تھا جس کے بعد سے آج تک براہ راست کسی شخص کی آسٹریلیا میں اس کے کاٹنے سے موت واقع نہیں ہوئی۔گرچہ اس کے کاٹنے کے ہر برس ہزاروں کیس سامنے آتے ہیں اور یہ ایک بہت تکلیف دہ صورتحال ہوتی ہے۔ بالکل ایسے ہی جس طرح ہمارے ہاں بچھو کا کاٹنا تکلیف دہ سمجھا جاتا ہے۔

توہمات اور تحقیق

اس ایک مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان اگر تحقیق کرے تو اکثر صورتحال اس پر واضح ہو جاتی ہے۔ تحقیق نہ کریں اور سنی سنائی باتوں پر آراء قائم کریں تو غلط تصورات کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے۔ بدقسمتی سے لوگ سب سے بڑھ کر یہ معاملہ مذہب میں کرتے ہیں۔اس وقت دنیا بھر میں دینداری اور روحانیت کا کاروبار عروج پر ہے۔ کہیں بت پرستی کے نام پر، کہیں انسان پرستی کے نام پر، کہیں مذہبی پیشواؤں کی تقدیس وتقلید کے نام پر۔ کہیں قوم پرستی کے نام پر۔

لوگ ذرا تحقیق کرنے کی عادت ڈالیں، ذہن میں اٹھنے والے سوالوں کو کچلنے کے بجائے،

ان سوالوں کے جواب ڈھونڈیں تو وہ سیدھا دین حنیف اور قرآن مجید کی طرف آئیں گے۔ ان کی منزل رسول خدا کی ہستی ہوگی۔ خدا کی ہستی، تنہا و یکتا ہستی ان کی زندگی کا مرکز و محور بن جائے گی۔ مگر غیر مسلموں سے کیا شکایت کریں، جب مسلمان اپنے تعصّبات اور توہمات سے اٹھنے کے لیے تیار نہیں۔ جب تحقیق کے بجائے توہمات کا چلن عام ہو، جب قرآن کی موجودگی میں اپنی خواہشات کو دین بنا دیا گیا ہو تو ایسے میں کیا ہوسکتا ہے۔ مگر جو شخص یہ ہمت کرلے گا جنت کی بہترین نعمتیں اس کی منتظر ہیں۔

ایڈیلیڈ اوول

خیر احباب کے ساتھ یہ نشست دیر تک چلی۔ یہاں حسب معمول ایک پر تکلف عشائیہ کا اہتمام تھا۔ ڈاکٹر احمد کی اہلیہ نے اسی روایت کو قائم رکھا جو ملبورن سے شروع ہوئی اور ابھی تک جاری تھی۔ یعنی پانچ سات انتہائی پر تکلف کھانوں سے کم اہتمام نہیں ہوتا تھا۔ ڈنر کے بعد یہ نشست اپنے اختتام کو پہنچی اور ہم اپنے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ میں طاہر صاحب کے ساتھ تھا۔ راستے بھر وہ دلچسپ اور معلوماتی باتیں بتاتے رہے۔ فرخ صاحب عامر کے ساتھ تھے۔ جبکہ ڈاکٹر احمد خاص طور پر الگ سے آئے تھے۔ میری ڈسٹرب نیند کو درست کرنے کے لیے کچھ میڈیسن انھوں نے خود جا کر خریدیں تھیں اور اب مجھے دینے آئے تھے۔

اگلے دن فرخ صاحب کو سڈنی لوٹنا تھا۔ جبکہ میری فلائٹ اگلے دن سہ پہر کے وقت تھی۔ یہ گویا ڈیڑھ دن کا رسیاحت کے لیے ہی وقف تھا۔ فرخ صاحب چونکہ کرکٹ کے شیدائی تھے، اس لیے ان کی پہلی ترجیح یہ تھی کہ ایڈلیڈ اوول کا کرکٹ اسٹیڈیم دیکھتے ہوئے انھیں ائیر پورٹ چھوڑا جائے۔ راستے میں عامر نے طاہر صاحب کو بھی ساتھ لے لیا۔ چنانچہ ہم سیدھا اس کرکٹ اسٹیڈیم پہنچے۔ اندر جانے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے باہر ہی سے اس کے سامنے کھڑے ہو کر

تصویریں بنوائیں۔ عامر نے اگلے دن مجھے ایڈیلیڈ اوول دکھانے کے لیے ایک پورا ٹور بک کرا رکھا تھا۔ مگر مجھے کرکٹ اسٹیڈیم کے بجائے فطرت سے دلچسپی تھی۔ اس لیے میں نے بھی بس اسے باہر ہی سے دیکھا۔

ایڈیلیڈ: سمندر سے پہاڑ تک

فرخ صاحب کو ائیرپورٹ چھوڑ کر پہلے ہم مرکز شہر کے قریب واقع گلینگ نامی ساحل سمندر پر گئے۔ یہاں ٹھنڈی تیز ہوا کی وجہ سے عین دوپہر میں بھی سخت ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔ ہوا کی یہ کیفیت تھی کہ انسانوں کو گویا اڑائے دے رہی تھی۔ یہاں ہوٹل اور بازار بھی تھا۔ یہ ٹورسٹ کا علاقہ تھا اس لیے اس ٹھنڈ کے باوجود لوگ گھومتے پھرتے نظر آئے۔ ساحل اتنا خوبصورت نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ پانی چڑھا ہوا تھا اور ساحل کی مٹی سے ملنے کے بعد پانی پر مٹیالا رنگ غالب تھا۔ اس تیز ہوا میں لوگ دور ہی سے پانی کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

دوپہر کے کھانے کے لیے عامر ایک جگہ افغان ریسٹورنٹ لے گئے جہاں کی خاص بات افغان کباب اور افغان نمکین لسی تھی۔ اس کے بعد طاہر صاحب کو ان کے گھر چھوڑا۔ میرا اصرار یہ تھا کہ یہاں کے پہاڑی علاقے کو دیکھا جائے۔ چنانچہ عامر مجھے لے کر ایڈیلیڈ کے پہاڑی علاقے کی طرف روانہ ہوئے۔

یہاں آ کر اندازہ ہوا کہ میرا اصرار کرنا درست تھا۔ یہ اتنا خوبصورت اور حسین پہاڑی سلسلہ تھا کہ الفاظ میں اس کی خوبصورتی کو بیان کرنا مشکل ہے۔ ہر منظر قدرت کی صناعی کی ایک تصویر لگ رہا تھا۔ بعض جگہ پر پہاڑی جھیلیں موجود تھیں جنھوں نے سبزے اور درختوں کے منظر کو اور دلکش بنا دیا تھا۔ یہ راستہ بڑی حد تک خالی پڑا ہوا تھا۔ اکا دکا گاڑیاں یہاں کے ان مکینوں کی تھیں جن کے کھیت اور مویشیوں اور بھیڑوں کے فارم یہاں موجود تھے۔

یہاں کی ایک اور خصوصیت دور دور تک پہاڑوں پر لگی ہوئی انگور کی بیلیں تھیں جنھیں ڈنڈوں کے سہارے ایک کھیت کی شکل میں اگایا گیا تھا۔ عامر نے مجھے بتایا کہ یہ شراب بنانے کی غرض سے لگائی گئی ہیں اور یہاں کی وائنریز (wineries) میں بنائی جانے والی شراب دنیا بھر میں مشہور ہے۔

اک دل ہمارا کیا ہے آزار اس کا کتنا

اس طرح کے مناظر اتنے حسین ہوتے ہیں کہ ان کو بیان کرنے کی ہر کوشش ان کے حسن کو کچھ کم ہی کر دیتی ہے۔ خدا جیسی اعلیٰ ہستی جس نے انسان کو بولنے کا وصف دیا، اس نے بھی انسانی عجز کا لحاظ کر کے یہ کہہ کر بات ختم کر دی ہے کہ وہ باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا نے اِس فانی اور عارضی دنیا میں اپنے جمال و کمال کے یہ کم تر جلوے اس لیے بکھیرے ہیں کہ انسان اس برتر جنت کا تصور کرے جس سے انسان کبھی باہر نہیں نکلنا چاہے گا۔ مگر اس دل کا کیا کیجیے کہ دنیا کے ہزار آزار اس کو لگے ہوئے ہیں۔ اسے خدا پر اعتبار ہی نہیں آتا۔ اسے جنت پر یقین ہی نہیں ہوتا۔ اسے موت کے بعد زندگی کا ماننا مشکل ہو جاتا ہے۔ دماغ مان بھی لے تو دل نہیں مانتا۔ دنیا کے پھندوں سے نکلتا ہی نہیں۔ اس کے فریب سے آزاد نہیں ہو پاتا۔

انسان اسی دنیا کو پانے کی سعی و جہد میں لگا رہتا ہے۔ مگر اول تو یہاں سب کو سب کچھ نہیں ملتا۔ انسان اپنی جتنی بھی جنت بنا لے، امتحان کی دنیا میں محرومی کے جہنم سے وہ دامن نہیں چھڑا سکتا۔ پھر جتنی کچھ جنت وہ بنا لے اس میں بوریت، بیماری، غربت، بڑھاپا جیسی چیزیں ہمیشہ رہتی ہیں۔ پھر ایک روز یہ انسان اُس دنیا کی طرف لوٹ جاتا ہے جہاں حقیقی جنت موجود ہے۔ مگر وہاں جا کر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ اِس جنت کو خریدنے کے لیے جس مال کی ضرورت

تھی وہ تو انسان نے پچھلی دنیا میں کمایا ہی نہیں۔

ہر انسان کا یہی مسئلہ ہے۔ سوائے اس کے جو خدا کو اپنا مسئلہ بنا لے۔ جو خدا کی جنت کو اپنا مسئلہ بنا لے۔ ایسا انسان کچھ اور نہ کر سکے تڑپ کر اپنے آپ کو خدا کے قدموں میں لا ڈالتا ہے۔ اس فریاد کے ساتھ کہ جنت کی محرومی برداشت نہیں ہوسکتی۔ اب آپ ہی کچھ کیجیے۔ خدا مردوں کو زندہ کرسکتا ہے۔ وہ مردہ دل کو زندہ کیوں نہیں کرسکتا۔ وہ کرہی دیتا ہے۔ اس سے مانگنے والے کبھی محروم نہیں ہوتے۔ جو شخص اپنے تعصّبات اور خواہشات سے بلند ہوکر خدا کے سامنے پیش ہوجائے، یہ طے ہے کہ چاہے وہ جنت کا اعلیٰ ترین درجہ بھی مانگ لے، اس کو مل جائے گا۔

اک دل ہمارا کیا ہے آزار اس کا کتنا
تم نے تو چلتے پھرتے مردے جِلا دیے ہیں

پاک چین دوستی زندہ باد

ایڈیلیڈ کے اس سفر میں عامر کا بہت ساتھ رہا۔ ان سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ ان کی ذاتی زندگی کے کئی دلچسپ پہلو سامنے آئے۔ وہ میٹرک کر کے کراچی سے اس وقت یہاں آئے تھے جب کراچی نیا نیا مقتل بنا تھا۔ والدین کے لیے سات سمندر پار اولاد کو بھیجنا آسان تھا بہ نسبت اس کے کہ کسی روز اخبار میں کسی ایک مقتول کی خبر شایع ہوجائے۔ اس وقت آسٹریلیا شاید ہی کسی کا انتخاب ہو۔ اس کے انتخاب کی وجہ ان کا کرکٹ سے عشق تھا۔ خیر یہاں وہ پڑھنے آئے تھے، مگر اجنبی ماحول، زبان پر عبور نہ ہونا اور تنہائی جیسی چیزیں ان کی راہ کی مشکلات بن گئیں۔ اللہ نے مدد کی کہ لوٹنے کے بجائے کمر ہمت کسے رہے۔ پڑھائی چھوڑ کر ایک جاننے والے کے کہنے پر ملبورن چلے گئے۔ ملازمت کی۔ انگریزی بہتر بنائی۔ واپس آ کر تعلیم شروع کی۔ مگر تعلیم بہت مہنگی تھی۔

اس کا حل اللہ نے عجیب خوشگوار طریقے سے نکال دیا۔ ان کی ملاقات سنکیانگ سے تعلق رکھنے والی اپنی ہونے والی بیگم سے ہوئی۔ وہ چینی مہاجر تھیں جو اپنے والدین کے ساتھ یہاں آئی تھیں۔ اور اب ان کو آسٹریلوی شہریت مل چکی تھی۔ ان سے شادی کرنے کے بعد عامر کی تعلیم بھی مفت ہوگئی کیونکہ اس زمانے میں فوراً شہریت مل جایا کرتی تھی اور مقامی لوگوں کے لیے تعلیم مفت تھی۔ ملازمت کے معاملے میں بھی اللہ نے ان کی مدد کی۔ انھوں نے ابتدا ہی میں کمپیوٹر نیٹ ورکنگ کی فیلڈ اختیار کر لی اور اس کے نتیجے میں اب ایک اچھی سرکاری ملازمت کر رہے تھے۔

شہری آبشار اور گاڑی کی دھلائی

پہاڑیوں سے واپسی پر عامر مجھے اپنی زمین دکھانے لے گئے جو انھوں نے گھر بنانے کے لیے لی تھی۔ چھ سو گز کا یہ ایک بڑا پلاٹ تھا۔ اس کے برابر میں ایک گھر بنا ہوا تھا اور ایسا ہی ان کا گھر بننا تھا۔ اسے دیکھ کر خیال ہوا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے معاشی، سماجی اور دعوتی پہلو سے کتنے زیادہ مواقع کھول دیے ہیں۔ کاش مسلمان ان مواقع کو دیکھنے والے بن جائیں۔ اس کے بعد وہ مجھے شہر ہی میں موجود ایک آبشار پر لے گئے۔ یہ ایک بہت پرسکون جگہ تھی جہاں واک کرنے کا ٹریک بھی تھا، مگر شام ہونے کی بنا پر یہ بند ہو چکا تھا۔

یہاں سے نکل کر ہم ایک جگہ گئے جہاں عامر نے اپنی گاڑی کو واش کرایا۔ 16 ڈالر اور دو چار منٹ میں کسی ورکر کے بغیر آٹومیٹک طریقے پر گاڑی مکمل طور پر صاف ستھری ہوگئی اور اوپر نیچے ہر جگہ سے بالکل صاف اور چمکدار ہوگئی۔ جبکہ ہم گاڑی کے اندر ہی بیٹھے رہے۔

میں نے سوچا کہ یہاں زندگی کتنی آسان کر دی گئی ہے۔ بنیادی ضروریات یعنی تعلیم، صحت، تفریح اور روزگار وغیرہ کے علاوہ زندگی کی تمام آسانیاں لوگوں کی دسترس میں ہیں۔ جن میں حوصلہ یا صلاحیت ہے ان کے لیے تمام آسائشیں بھی دستیاب ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں تو جینا بھی

ایک امتحان بن چکا ہے۔

سماجی انقلاب یا سائنسی انقلاب

مغربی ترقی کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ یہ سائنسی انقلاب کا نتیجہ ہے۔ مگر میرے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ مغرب کی اصل تبدیلی سیاسی نہیں سماجی انقلاب کی تبدیلی تھی۔ مغرب میں قرون وسطیٰ میں مسلمانوں ہی کے اثر سے ایک سماجی انقلاب آیا ہے جس نے صدیوں سے قائم تصورات کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ سماجی تصور ایک بنیادی نکتے کے اردگرد گھومتا تھا۔ یعنی انسان کی آزادی۔ مغربی مفکرین نے دیکھا کہ انسان سیاسی پہلو سے غلام ہے۔ انسانوں پر انسان حکومت کرتے تھے جو قانون سے بالاتر تھے۔ یعنی بادشاہ اور ان کی آمریت۔ مغربی مفکرین نے نعرہ لگایا کہ عوام پر وہی لوگ حکومت کریں گے جن کو عوام کا اعتماد حاصل ہوگا۔ اور جیسے ہی عوام کا اعتماد ختم ہوگا ان کی حکومت ختم ہو جائے گی۔

آزادی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ مذہب کے نام پر انسان انسانوں پر حکومت کرتے تھے۔ یہ توہمات کی غلامی تھی جو چرچ کے نام پر مغرب میں عام تھی۔ چنانچہ چرچ کے اس مذہبی اقتدار کے خلاف بغاوت ہوئی اور اب مذہب کے نام پر کسی ادارے یا فرد کی حکومت موجود نہیں رہی۔ لوگ اپنی مرضی سے جو چاہیں مذہب اختیار کر لیں۔ آزادی کا تیسرا پہلو یہ تھا کہ اپنی جاگیر کے بل بوتے پر کچھ جاگیرداروں نے تمام معاشی وسائل پر قبضہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس نظام پر ضرب لگائی گئی اور آزاد مارکیٹ کا وہ تصور دیا گیا جس میں ہر شخص جدوجہد کر کے ترقی کر سکتا ہے۔

چنانچہ مغرب میں آزادی سب سے بڑی قدر قرار پائی۔ انسان آزاد ہو کر سوچنے، جینے اور کمانے کے قابل ہو گئے۔ اس سماجی عمل کے غیر معمولی نتائج نکلے جس نے آنے والے دنوں میں مغرب کو بدل کر رکھ دیا۔ مغرب کی ساری تبدیلیاں انھی بنیادی تبدیلیوں کا نتیجہ ہیں۔

تاہم وحی کی رہنمائی سے محروم اس سماجی انقلاب کے منفی نتائج بھی نکلے اور افراط وتفریط کی صورتحال بھی پیدا ہوئی۔ زندگی سے مذہب کا نکلنا، مادیت اور کمیونزم کا فروغ، سرمایہ دارانہ نظام کا ظلم اور فساد، خاندانی نظام کی تباہی جیسے مسائل مغرب کے بڑے مسائل بن گئے۔ ان میں سے بہت سے مسائل میں انھوں نے معاملات درست کر لیے۔ مگر دو چیزیں ایسی ہیں جو ابھی بھی تباہ کن ہیں اور ان کے معاشرے کو کھا رہی ہیں۔ ایک حقیقی روحانیت کا خلا اور دوسرے جنسی آزادی کے بعد خاندانی نظام کی شکست وریخت۔ مگر ان پر بات آگے ہوگی۔

کینگرو سے ملاقات

آسٹریلیا دنیا میں اپنے مخصوص جانور کینگرو کی وجہ سے مشہور ہے جو کہیں اور نہیں پایا جاتا۔ کینبرا میں اسے دور سے پارکوں میں اچھلتے کودتے دیکھا تھا۔ مگر ابھی تک قریب سے نہیں دیکھا تھا اور اب روانگی کا مرحلہ آ رہا تھا۔ ایڈیلیڈ اول کا پروگرام تو کینسل ہو چکا تھا۔ چنانچہ اگلی صبح طے پایا کہ ایک مقامی چڑیا گھر میں جایا جائے تاکہ کینگرو سے براہ راست ملاقات ہو سکے۔ یہ چڑیا گھر شہر سے باہر پہاڑیوں پر واقع تھا۔ تین بجے کی فلائٹ تھی اور اس سے قبل ہمیں یہ مرحلہ طے کرنا تھا۔

اس دفعہ ہمارے ساتھ آصف صاحب اور عامر کے چھوٹے بھائی شاہد بھی موجود تھے۔ ان کے ساتھ ہونے کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک جگہ راستہ بند ملا تو ان کی رہنمائی میں ہم دوسری جگہ سے اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ اس پہاڑی راستے پر بھی ہر جگہ فطرت کے حسین مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ ان مناظر سے لطف اندوز ہوتے اور گفتگو کرتے ہوئے ہم لوگ چڑیا گھر جا پہنچے۔

یہ ایک پرائیوٹ زو تھا جس کی فیس تھی۔ اندر ایک فطری ماحول میں بہت سے جانور موجود تھے۔ ان میں سے جو قابل ذکر ہیں ان میں ایک تو کوالہ (Koala) آیا۔ یہ دو تین فٹ لمبا کچھ

بندر اور کچھ بن مانس سے ملتا جلتا بہت معصوم سا جانور ہے۔ یہ جانور سفیدے یا یوکلپٹس کے ان درختوں پر رہتا ہے جن کے جنگلات میں آسٹریلیا میں ہر جگہ دیکھ چکا تھا۔ یہ جنگلات یہاں نیشنل پارک کہلاتے ہیں۔

عام طور پر یہاں وہ بڑے جانور نہیں تھے جن کے لیے لوگ ہمارے ہاں چڑیا گھر جاتے ہیں جیسے ہاتھی شیر چیتا۔ یہ غالباً یہاں پائے ہی نہیں جاتے۔ جو جانور تھے ان میں چمگادڑوں کا منظر بڑا دلچسپ تھا جو الٹی لٹکی ہوئی آرام فرما رہی تھیں۔ پنکھ پھیلائے مور بھی لوگوں کے لیے باعث توجہ تھے۔ شاہد نے مور کی خوبصورتی کو دیکھ کر اسے مورنی کہا تھا میں نے ان کی غلط فہمی دور کی اور بتایا کہ یہ صرف انسان ہوتے ہیں جن میں مادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ باقی سارے جانوروں میں نر زیادہ خوبصورت ہوتے ہیں۔

آخر میں ہم کینگرو کے پاس پہنچے۔ یہ ہرن جیسا ہی لگا۔ صرف فرق یہ تھا کہ اگلی دو ٹانگیں بہت چھوٹی تھیں جن کو یہ ہاتھوں کی طرح استعمال کرتا ہے۔ جبکہ یہ اپنی پچھلی دو ٹانگوں ہی سے قلانچیں بھرتا اور اچھلتا ہوا دوڑتا ہے۔ اس کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ اس کا نومولود بچہ ڈیڑھ سال تک پیٹ میں بنی ایک تھیلی میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔

یہ کینگرو بہت معصوم تھے۔ ان کو ہم نے ویسے ہی غذا کھلائی جیسے بکروں وغیرہ کے سامنے ان کا چارہ ہاتھ میں لے کر ان کے منہ کے پاس لے جاتے ہیں اور وہ اس کو ہمارے ہاتھ سے کھاتے رہتے ہیں۔

جانور اور انسان

جانوروں میں انسانوں کے لیے بڑا سبق ہے۔ انسان اپنے حیوانی وجود کے لحاظ سے ہر اعتبار سے ایک جانور ہے۔ اعضا کے علاوہ ساری حیوانی جبلتیں بھی انسان میں موجود ہیں۔ مگر

انسان اپنی نفسیات میں جانوروں سے بہت مختلف ہے۔ قرآن مجید کے مطابق یہ اس نفخ روح کی وجہ سے ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں کی تھی۔

اس نفخ روح کی وجہ سے انسانوں میں خدا کی ہستی اور خیر وشر کا شعور پیدا ہوا ہے۔ اسی کی بنا پر انسان کا ذوق جمال اور عقل وفہم حیوانوں سے بہت بلند ہے۔ سب سے بڑھ کر اپنی ذات کا شعور اور ارادے واختیار کی شکل میں اس کا اظہار وہ چیز ہے جو انسان کو انسان بناتی ہے۔

اس کے بعد انسان کے پاس دو راستے رہتے ہیں۔ ایک یہ کہ انسان صرف جانوروں کی سطح پر زندگی گزارے۔ پیٹ، جنس اور برتری کے جذبے کے ساتھ زندہ رہے اور اپنی روحانی طاقتوں کو ان پست مقاصد کے حصول کے لیے وقف کردے۔ دوسرا یہ کہ ان حیوانی تقاضوں کو بس ضروریات کے مقام پر رکھ کر اصل مقصد روحانی وجود کی بلندی کو بنائے۔ وہ خدا سے گہرا تعلق پیدا کرے۔ اپنے خالق کی عبادت اور اپنے شعور میں اس کی یاد کے احساس کو زندہ رکھے۔ وہ خیر وشر کے شعور کی بنیاد پر تمام انسانوں کے ساتھ عدل، احسان کے اصول پر معاملہ کرے اور ظلم وحق تلفی سے دور رہے۔

اس عمل کا نام تزکیہ ہے اور اس کا بدلہ جنت کی ابدی بادشاہی ہے جس میں انسان کے حیوانی وجود کی تمام نجاستیں اور کمزوریاں دور کر کے اسے ابدی زندگی دے دی جائے گی۔ جبکہ پہلی سطح پر جینے والوں کو ابدی طور پر ایک جانور بنا کر جہنم کے پنجرے میں قید کردیا جائے گا۔ ہم میں سے ہر شخص کو جلد یا بدیر اسی انجام تک پہنچنا ہے۔ لیکن ہمارا انجام ہمارے اس رویے پر منحصر ہے جو ہم آج اختیار کرتے ہیں۔

آسٹریلیا کا ٹریفک اور قانون وتربیت

چڑیا گھر سے فارغ ہوکر ہم روانہ ہوئے۔ پہلے شہر پہنچ کر ایک جگہ لنچ کیا۔ پھر آصف صاحب

اور شاہد کو چھوڑتے ہوئے ائیر پورٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ ہمیں دیر ہو چکی تھی۔ اگر فلائٹ مس ہو جاتی تو بہت زحمت ہوتی۔ لیکن اللہ نے کرم کیا اور فلائٹ سے نصف گھنٹے قبل ہم پہنچ ہی گئے۔ میں چیک ان کرنے والا آخری شخص تھا جس کے بعد کاؤنٹر بند ہو گیا۔

اس دیر کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ہم شہر سے باہر تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ایڈ یلیڈ میں گاڑی کی حد رفتار پچاس کلومیٹر تھی۔ اسکول وغیرہ کے پاس یا جہاں تعمیراتی کام ہو وہاں حد رفتار پچیس کلومیٹر ہو جاتی تھی۔ یہ ممکن نہ تھا کہ حد رفتار توڑ کر گاڑی چلائی جاتی۔ آسٹریلیا کے قیام میں ہر جگہ میں نے ٹریفک کے ضوابط کی انتہائی سخت پابندی دیکھی۔ لوگ عام طور پر قوانین کی پابندی کرتے ہیں اور جو نہیں کرتے ان کے لیے کیمرے اور پولیس کی گاڑیاں موجود ہوتی ہیں۔

میں ہمیشہ یہ توجہ دلاتا ہوں کہ قوانین اور سزائیں ہمیشہ اقلیت کو کنٹرول کرنے کے لیے مقرر کی جاتی ہیں۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں اکثریت قانون ماننے کے لیے تیار نہ ہو وہاں تربیت سے اصلاح کی جاتی ہے۔ مگر ہمارے ہاں ہر مسئلے کا حل قانون کا نفاذ سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس طرح قانون سے اصلاح نہیں ہوتی، البتہ رشوت کے ریٹ بڑھ جاتے ہیں۔

ائیر پورٹ پر عامر میرے ساتھ آخری مرحلے تک گئے جہاں مسافر جہاز میں بیٹھنے کا انتظار کرتے ہیں۔ جب میں ویٹنگ لاؤنج سے جہاز میں بیٹھنے کے لیے نیچے اترنے لگا تب وہ رخصت ہوئے۔ عامر بہت مخلص اور سادہ مزاج شخصیت تھے۔ وہ پچھلے تین دنوں سے ہمہ وقت میرے ساتھ رہے۔ ان جیسے لوگوں کا کسی بھی دعوتی کام میں ہونا اللہ کی ایک نعمت ہے۔ ان کی وجہ سے ایڈ یلیڈ کا سفر ایک بڑی نعمت رہا۔ انھوں نے مجھ سے اور میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔

یک نہ شد دو شد

جہاز میں پہنچا تو اپنی نشست کے عین برابر میں ایک نوجوان خاتون کو براجمان پایا۔ یہ

خاتون سخت گرمی کا شکار معلوم ہوتی تھی۔ کم از کم ان کے لباس سے یہی لگتا تھا۔ میں اپنی نشست خالی چھوڑ کر کونے والی نشست پر جا بیٹھا۔ امید یہی تھی کہ جہاز میں پیسنجر کم ہوئے تو یہ نشست خالی ہی رہے گی یا کوئی آئے گا تو اس خاتون کے برابر میں بیٹھ کر زیادہ خوش ہوگا۔ سوئے اتفاق کہ جس نشست پر میں براجمان تھا اس کی دعویدار جلد ہی آ گئی ۔ یہ بھی ایک نوجوان طالبہ ہی تھی جو پہلی والی کی طرح گرمی کا شکار تھی۔

اس نے دور سے مجھے اپنی نشست پر بیٹھا دیکھا اور مہذب انداز میں جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ میری نشست چھوڑ دیجیے۔ بہرحال ان کو جگہ دی اور اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ اب صورتحال یہ ہوئی کہ میں دائیں بائیں دونوں طرف سے گرمی کی شکار دو نوجوان خواتین کے بیچ میں گھر چکا تھا۔ یہ خیال ہوا کہ اسی حال میں جہاز گر گیا تو معاندین کہیں گے کہ دیکھو اس بدکار کا خاتمہ کس حال میں ہوا۔ میں نے جلدی جلدی سفر کی دعائیں پڑھیں اور دعا کی کہ جہاز خیریت سے پرتھ پہنچ جائے۔

مغرب میں عریانی کا مسئلہ

تفنن برطرف مگر میرے دل سے ان کے لیے اور ایسی ساری خواتین کے لیے ہدایت کی دعا نکلی۔ ان کی مت نہیں ماری جاتی کہ اس طرح نیم عریاں گھومتی ہیں، اس رویے کے پیچھے ایک فلسفیانہ سوچ اور ایک خاص سماجی زاویہ ہے۔

مغرب ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا جیسا وہ اب نظر آتا ہے۔ عریانی، بدکاری اور زنا مغرب میں بھی ایسے ہی قابل مذمت سمجھے جاتے تھے جیسے ہمارے ہاں سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم پیچھے جس آزادی کی فکر کا تذکرہ ہوا ہے اس نے جہاں دیگر سماجی معاملات پر اپنے اثرات ڈالے وہیں خواتین کی آزادی، مرد و زن کے تعلق کے سابقہ معیارات کو بدل کر رکھ دیا۔ اس میں بہت نمایاں

اثر فرائڈ کے کام کا ہوا جس نے علم نفسیات کی روشنی میں جنس کے جذبے کو قابو میں رکھنے کے لیے حیا کے معیارات کی نفی کردی اور عفت اور حیا جیسی چیزوں کو سماجی جبر قرار دیا۔

معاشرتی سطح پر عظیم فلسفی اور دانشور برٹینڈ رسل کے نظریات کا بڑا اثر ہوا۔ انیسویں صدی میں وکٹورین ایج کی سماجی اقدار بڑی حد تک قدامت پسند تھیں۔ مگر صنعتی دور میں آنے والی سماجی تبدیلیوں نے اس بات کو یقینی بنادیا کہ اب پرانی اقدار کو اپنی جگہ چھوڑنا ہوگی۔ رہی سہی کسر برٹینڈ رسل کی تنقیدوں نے پوری کردی۔ بیسویں صدی میں میڈیا اور سرمایہ دارانہ نظام نے ان اقدار کو آخری دھکا دیا۔ اور بیسویں صدی کے نصف آخر سے صورتحال مکمل بدل گئی۔ انسانیت ایک نئے دور میں داخل ہوگئی جہاں عریانی ایک قدر بن چکی ہے۔

مغربی سماج کی دو بنیادی کمزوریاں

میں نے پیچھے یہ بیان کیا تھا کہ مغربی سماج نے انسانیت کو مادیت کے عروج پر پہنچادیا ہے۔ تاہم دو پہلو ایسے ہیں جن کی بنا پر یہاں اس ساری مادی ترقی کے باوجود لوگ حقیقی خوشی سے محروم ہیں۔ ایک حقیقی روحانیت کا خلا اور دوسرے جنسی آزادی کے بعد خاندانی نظام کی شکست و ریخت۔ یہ دونوں چیزیں بے لگام آزادی کے لازمی نتائج ہیں۔ خدا ہو یا خاندان دونوں انسانوں پر کچھ پابندیاں لگاتے ہیں۔ خدا کی بیان کردہ اخلاقیات کو تو لوگ فطرت کی آواز سمجھتے ہیں، مگر شریعت ان کو وہ بیڑیاں لگتی ہے جس سے ان کی آزادی پر قدغن لگ جاتی ہے۔ اسی طرح خاندان عفت اور حفظ مراتب کے اصول کو مانے بغیر اپنے مقاصد حاصل نہیں کرسکتا۔

خدا نے جنسی تعلق کو حیوانی نسل کے آگے بڑھنے کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ تاہم انسانوں میں یہ جذبہ نسل بڑھانے کے ایک تعلق سے کہیں آگے بڑھ کر اپنی ایک غیر معمولی کشش رکھتا ہے۔ یہ کشش خدا نے اس لیے رکھی ہے کہ مرد و زن خاندان کی بھاری ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے

آپس میں جڑ جائیں۔ دورِ جدید کے انسان نے آزادی کے نشہ سے سرشار ہوکر لذت اندوزی کو اپنا مقصد بنایا تو خاندان کہیں پس منظر میں چلا گیا۔ خاندان کہیں بنتا بھی ہے تو اکثر بڑی عمر میں جا کر جب لوگ لذت اندوزی سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں۔ چنانچہ آپ اکثر مغرب میں یہ دیکھیں گے کہ چالیس پینتالیس سال کے افراد کا پہلا بچہ ان کی گود میں ہوگا۔ دوسری طرف نوجوانوں کا حال یہ ہے کہ بیشتر بالغ لڑکیاں بکینی، منی اسکرٹ پہنے اور نوجوان لڑکے ان کے آگے پیچھے بھنبھناتے پھرتے ہیں۔ ایک جائزے کے مطابق مغربی مرد وزن زندگی میں اوسطاً بارہ پارٹنر بدلتے ہیں۔ قیاس یہ ہے کہ اصل تعداد اس سے زیادہ ہوگی۔ اس صورتحال کے پیچھے فرائڈ سے لے کر برٹینڈ رسل تک جیسے بڑے اذہان کا استدلال، آزادی کی تحریک، میڈیا کا مکمل بے لگام ہو جانا اور صنعتی انقلاب کے بعد آنے والی معاشی اور معاشرتی تبدیلیاں ہیں۔

تاہم یہ غنیمت ہوتا کہ یہ لوگ اس طرح کوئی مثبت نتیجہ حاصل کر لیتے۔ مگر اس وقت صورتحال یہ ہے کہ مغرب میں بیشتر شادیاں ناکام ہو جاتی ہیں۔ لوگ مستقل پارٹنر بدلتے رہتے ہیں۔ سنگل پیرنٹ کی تعداد معاشرے میں بڑھتی جا رہی ہے۔ سب سے بڑھ کر لوگوں کی تشفی و تسکین ہونے کے بجائے ان کی فرسٹریشن بڑھ رہی ہے۔ اس وقت تو مغرب میں مادی اور سماجی ترقی اور امن وامان نے اس صورتحال کو کچھ سنبھال رکھا ہے۔ کبھی یہ صورتحال بدلی تو یاد رکھنا چاہیے کہ خاندانی تحفظ سے محروم رہنے والے بچے بہت جلد بھیڑیے بن جاتے ہیں۔

بے ضرر خدا کی تلاش

مغرب کا دوسرا مسئلہ ایک روحانی خلا ہے۔ اہل مغرب بیسویں صدی کے تلخ تجربات کے بعد اب خدا کو ماننے کے لیے تیار ہیں۔ مگر یہ خدا خارج میں اپنا وجود رکھنے والی اور علیم وقدیر ہستی نہیں بلکہ ایک ثقافتی تصور ہے۔ خدا کو ماننا کسی سچائی کا نہیں بلکہ روحانی سکون کی تلاش کا موضوع

ہے۔ ایسا بے ضرر خدا جو کوئی حکم نہیں دیتا بلکہ آپ کی مرضی کے تصورات میں ڈھلتا چلا جاتا ہے، اب کافی مقبول ہو چکا ہے۔ مگر یہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ خداوند کائنات نہیں ہو سکتا جو ایک روز لوگوں کا حساب کرنے کے لیے ان کو اپنے پاس جمع کرے گا۔

اس حقیقی خدا اور اس کی عائد کردہ پابندیوں کو نہ ماننے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان حقیقی روحانیت سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس وقت روحانیت کے نام پر انسان کو جو کچھ مل رہا ہے وہ اصلاً ان کے نفسی ذوق کی تسکین ہے۔ انسان کے نفس میں خدا کے تصور کی ایک زبردست طلب ہے۔ یہ طلب خدا کو ماننے سے پورا ہو جاتی ہے۔ مگر جس روحانی سکون کو انسان تلاش کر رہا ہے، وہ خدا کو جیسا وہ ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے، اس سب کو ماننے ہی سے ملتی ہے۔ یہ چیز لوگ آزادی کے فریب میں ماننے کے لیے تیار نہیں۔

مغربی مفکرین اپنے تمام تر استدلال میں درست ہو سکتے ہیں۔ مگر وہ ایک چیز کا ادراک کرنے میں مکمل قاصر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ انسانی طبیعت آزادی میں جتنا سکون محسوس کرتی ہے، بے لگام آزادی میں اتنی ہی بے کیف ہو جاتی ہے۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے بہت محدود پیمانے پر سبھی انسانوں پر شریعت کی کچھ پابندیاں لگائی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جب بدکاری کو حرام قرار دیا ہے تو اس کے جہاں اور بہت سے سماجی اور اخلاقی پہلو ہیں وہیں ایک بہت اہم پہلو یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ انسان کو اِس دنیا میں لذت کامل نہیں مل سکتی۔ اگر انسان کو کھلی چھوٹ مل گئی تو انسان لذت کی تلاش میں آخر کار اپنے سماجی ڈھانچے کو تباہ کر لے گا اور پھر بھی بے سکون رہے گا۔ چنانچہ انھوں نے بدکاری پر پابندی لگا کر انسانوں کو ایک طرف اس سماجی انارکی سے بچایا ہے دوسری طرف پابندی لگا کر اس کی زندگی میں مقصدیت اور روحانیت پیدا کر دی ہے۔ یہ مقصدیت جنت کی اس بستی کی ہے جہاں لذت کامل

ہوگی اور روحانیت خدا سے اس تعلق کی ہے جو بے لگام آزادی کے ساتھ نہیں مل سکتی۔ یہ مقصد اور یہ روحانیت انسان کو وہ آخری سکون عطا کرتا ہے جو اس دنیا میں اسے مل سکتا ہے۔

یہی معاملہ شریعت کے ہر حکم کا ہے۔ اللہ کو معلوم ہے ان کے نام لیواؤں کی ایک بڑی تعداد کے لیے فجر کی نماز پڑھنا بہت مشکل کام ہے۔ اور بہت سے لوگوں کے لیے ساری نمازیں پڑھنا بہت مشکل کام ہے۔ وہ یہ کر سکتے تھے کہ صرف جمعہ کی نماز فرض کر دیتے۔ مگر انھوں نے پنج وقتہ نماز میں کوئی رعایت نہیں کی۔ انھیں معلوم ہے کہ گرمیوں کے روزے بہت مشکل ہوتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ حج کرنا آسان نہیں۔ مگر شریعت کے ہر حکم میں دیگر حکمتوں کے علاوہ ایک اور اصول کارفرما ہے۔ وہ یہ کہ انسانوں کو جتنی خوشی آزادی سے ملتی ہے، اتنا ہی اطمینان بعض محدود پابندیوں میں بھی ملتا ہے۔

مگر یہی وہ پابندیاں ہیں جن کی وجہ سے جدید انسان خدا کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ ایک ایسے خدا کو ماننے کے لیے تیار ہے جو بس اخلاقی احکام دیتا رہے۔ انسانیت کی بات کر لے۔ اس سے آگے بڑھ کر عملی زندگی میں انفرادی یا اجتماعی سطح پر دخل اندازی نہ کرے۔ ایسے خدا کو انسان ماننے کے لیے تیار نہیں۔

یاجوج ماجوج، اولادِ آدم اور اولادِ نوح

جہاز کا یہ سفر بہت طویل تھا اور کٹ نہیں رہا تھا۔ ہمیں کم و بیش آدھے براعظم آسٹریلیا پر سے گزرنا تھا۔ میں اس دوران میں اپنی دو یاجوج ماجوج بہنوں کے بیچ میں بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ یاجوج ماجوج کی اصطلاح قرآن مجید نے قدیم صحف سماوی کے پس منظر میں استعمال کی ہے۔ قدیم صحف سماوی میں یہ اصطلاح حضرت نوح کے بیٹے یافث کی اولاد کے لیے استعمال ہوئی ہے۔ اس وقت زمین پر زیادہ تر حضرت نوح کی اولاد ہی موجود ہے۔

ابتدا میں اولادِ آدم نے اپنی زندگی کا آغاز غالباً افریقہ میں کیا۔ افریقہ سے یہ ایشیا میں پہنچے۔ ایشیا سے ایک طرف یہ لوگ وسطی ایشیا کے راستے امریکہ جا پہنچے۔ دوسری طرف جنوبی ہندوستان کے راستے آسٹریلیا تک آ گئے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ آسٹریلیا اور امریکہ خشکی کے جزوی راستوں سے ایشیا سے جڑے ہوئے تھے۔ یوں اولادِ آدم دنیا پر غالب ہوگئی۔

حضرت آدم کی اولاد کا وہ حصہ جو ایشیا کے مرکز میں مشرق وسطیٰ اور اردگرد کے علاقوں میں تھا ان میں حضرت نوح کی بعثت ہوئی اور ان کے کفر کی پاداش میں تباہ ہوگئی۔ پھر طوفان نوح میں بچ جانے والے حضرت نوح کی نسل کے لوگوں نے دوبارہ اسے آباد کیا، (الصافات 77:37)۔ ان کے بیٹے سام کی نسل کے لوگ مشرق وسطیٰ میں، حام کی نسل کے لوگ شمال مشرقی افریقہ میں اور یافث کی نسل کے لوگ یورپ اور ایشیا کی سرحد پر شمال کے پہاڑی علاقوں اور میدانوں میں پھیل گئے۔

اولادِ نوح میں حام اور سام کی نسل بہت جلد متمدن ہوگئی اور زیادہ نہیں پھیلی۔ لیکن یافث کی نسل غیر متمدن رہی اور بہت زیادہ بڑھی۔ ابتدا میں یہ مشرق کی طرف پھیلے اور مشرق بعید تک پہنچ گئے۔ جغرافیائی اثرات سے وہ زرد فام نسلوں میں بدل گئے۔ اس کے بعد ان کی ایک بڑی نسل آریائی لوگوں کی شکل میں پھیلی اور وسط ایشیا سے لے کر جنوبی ایشیا تک پھیل گئی۔ ان کا تیسرا بڑا نسلی گروہ کاکیشین کی سفید فام نسل ہے۔ کاکیشین کا مطلب اس خطے کے لوگ ہیں جو بحیرہ اسود اور بحیرہ کیسپین کے درمیان کوہ قفقاز کا ایک پہاڑی سلسلہ ہے اور ایشیا اور یورپ کی سرحد پر واقع ہے۔ یہی وہ نسل ہے جو یورپ کی سمت بڑھی اور جدید تاریخ میں امریکہ اور آسٹریلیا تک جا پہنچی۔ انھی کو ہماری زبان میں گورے یا مغربی ممالک کے لوگ کہا جاتا ہے۔

پچھلے کئی ہزار برسوں میں اولادِ نوح نے ہر جگہ اولادِ آدم کو مغلوب کر لیا تھا۔ اور قیامت سے

قبل جس واقعہ کی قرآن نے پیش گوئی کی تھی بظاہر اس کی تعبیر یہی ہے کہ اولاد نوح میں سے اولاد یافث باقی اولاد نوح پر یلغار کر دے گی، (الانبیا 21:96,97)۔ اس وقت عملاً یہی ہو رہا ہے۔

بعض روایات میں روز حشر کا جو ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت نوح کی قوم اس بات کا انکار کر دے گی کہ ان تک حضرت نوح کا دعوت حق کا پیغام پہنچا ہے اور پھر مسلمان حضرت نوح کی طرف سے گواہی دیں گے، میرے نزدیک اس کی حقیقت یہی ہے کہ قوم نوح سے وہاں مراد حضرت نوح کی اولاد کا یہی حصہ جن کے ہاں ہزاروں برس سے کوئی پیغمبر نہیں آیا۔ ان تک دعوت حق کا کام مسلمانوں کو ہی کرنا ہے۔

پرتھ کا شہر

میں اس طویل سفر کے آخری مرحلے میں ساڑھے تین چار گھنٹے میں پرتھ پہنچا۔ تاہم وقت میرے لیے ٹھہرا ہی رہا۔ اس کی وجہ تھی کہ پرتھ اور ایڈیلیڈ کے وقت میں ڈھائی گھنٹے کا فرق تھا۔ اس لیے گھڑی کے حساب سے وقت میں صرف آدھے پونے گھنٹے کا فرق پڑا۔ یہ بھی خدا کی عجیب قدرت تھی۔ پرتھ سڈنی سے تین گھنٹے آگے تھا۔ ایک ہی ملک تھا اور اس میں دو شہروں کے وقت میں تین گھنٹے کا فرق۔ یہ فرق ان ہزاروں میل کے ان طویل فاصلوں کی وجہ سے تھے جو ان شہروں کے بیچ میں تھے۔ بہر حال اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نیا جیٹ لیگ مجھے لاحق ہو گیا۔ پرتھ پہنچ کر شام سات بجے ہی مجھے نیند کے جھونکے آنے لگتے۔

پرتھ ریاست ویسٹرن آسٹریلیا کا صدر مقام تھا۔ یہ بیس لاکھ کی آبادی کے ساتھ سڈنی، ملبورن اور برسبین کے بعد آسٹریلیا کا چوتھا بڑا شہر تھا۔ پانچوں ایڈیلیڈ ہی ہے جس سے میں ہو کر آ رہا تھا۔ برسبین آسٹریلیا کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ اس سے نیچے جنوب کی سمت جاتے ہوئے مشرقی ساحل پر سڈنی آتا ہے۔ اس سے ذرا قبل خشکی میں گھرا ہوا کینبرا ہے۔ جبکہ سڈنی

سے آگے مغرب کی سمت بڑھتے ہوئے جنوبی ساحل پر پہلے ملبورن اور پھر ایڈیلیڈ آتے ہیں۔ جبکہ پرتھ بالکل مغرب کے آخری کنارے پر ہے۔یہی وہ تمام شہر تھے جن سے میں ہوتا ہوا آرہا تھا اور آسٹریلیا کی بیشتر آبادی انھیں میں مقیم ہے۔ان چند ساحلی شہروں کے سوا پورا آسٹریلیا ڈھنڈار پڑا ہوا ہے۔

پرتھ میں پچھلے دس پندرہ برسوں میں معاشی ترقی کا زبردست دور دورہ رہا تھا۔کان کنی کی صنعت اپنے عروج پر تھی،مگر اب کچھ معاشی زوال آیا ہوا تھا۔تاہم پھر بھی یہ شہر ترقی اور خوشحالی اور خوبصورتی کا بہترین نمونہ تھا۔جس کو اگلے دن میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

خالص اردو

پرتھ میں ڈاکٹر ثمینہ یاسمین میزبان تھیں۔وہ یونیورسٹی آف ویسٹرن آسٹریلیا میں پروفیسر تھیں اور انھی کے زیرِ انتظام ایک کانفرنس میں مجھے اپنا مقالہ پڑھنا تھا۔ائیر پورٹ پر ڈاکٹر صاحبہ کے ایک جاننے والے صاحب مجھے لینے آئے اور ان کے گھر پہنچا دیا۔اس وقت وہ گھر پر نہیں تھیں بلکہ ان کے نومسلم شوہر ڈاکٹر جیمز گھر پر تھے۔انھوں نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا۔

ڈاکٹر جیمز ایک زبردست شخصیت کے مالک تھے۔وہ چالیس برس تک یونیورسٹی میں پڑھا کر ریٹائر ہوئے تھے اور اپنا بزنس بھی کرتے تھے۔ان کے پاس ہر طرح کی معلومات کا خزانہ تھا اور وہ اسے دوسرے تک منتقل کرنے میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔اس لیے میری ان سے بہت اچھی ملاقات رہی اور ان دو تین دنوں میں ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔

کچھ دیر میں ڈاکٹر صاحبہ بھی تشریف لے آئیں۔ان سے فون اور ای میل پر تو پہلے ہی رابطہ تھا،مگر اب ملاقات کر کے بہت خوشی بھی ہوئی۔وہ اپنی کلاسیں لینے اور کانفرنس کے سلسلے میں کافی مصروف تھیں۔بقول ڈاکٹر جیمز کہ آج کل انہوں نے کھانے پکانے کی ذمہ داری لے رکھی

تھی۔ اگلے دن میں نے ان کے ہاتھ کا بہت مزے کا کھانا کھایا۔

تاہم انھوں نے بتایا کہ اس وقت ڈنر ہمیں باہر کرنا ہے۔ ان کے ایک دوست فرخ صاحب نے پاکستانی سفیر نائلہ چوہان صاحبہ کی دعوت کی ہے جو کینبرا سے آئی ہوئی ہیں۔ چنانچہ ایک تھائی ریسٹورنٹ میں تھائی کھانا کھانے کے ساتھ فرخ صاحب ان کی اہلیہ، سفیر پاکستان نائلہ چوہان صاحبہ اور ان کے صاحبزادے سے بھی ملاقات ہوئی۔

اس ڈنر میں میرے لیے نائلہ صاحبہ کے صاحبزادے عثمان چوہان سے ملنا بہت باعث مسرت ہوا۔ وہ ایک انتہائی قابل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھے جو سات زبانوں میں ماہر تھے۔ دوران گفتگو وہ اتنی گاڑھی اردو بول رہے تھے کہ شاید کسی عام اردو داں کے لیے اس کو سمجھنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے ہی وکی پیڈیا اردو کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس پر میں نے ان کو توجہ دلائی کہ اردو زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نئے زبانوں کے الفاظ لے کر اپنے آپ کو بہتر بنا رہی ہے۔ اردو میں کئی زبانوں کے علاوہ زیادہ تر ہندی، فارسی اور عربی کے الفاظ ہیں۔ اب انگریزی زبان کو بھی یہ حیثیت حاصل ہوگئی ہے کہ اردو اس کے بہت سے الفاظ قبول کر چکی ہے۔ تحریری طور پر تو ابھی یہ الفاظ اس طرح استعمال نہیں ہوتے، مگر زبانی اردو میں انگریزی کے الفاظ فیشن کے طور پر نہیں بلکہ اردو زبان کے اجزا کے طور پر بولے جاتے ہیں۔

وہ اس وقت کینبرا میں اپنے والدین کے ساتھ مقیم تھے اور وہیں سے اکنامکس میں اپنا پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ ایسے ذہین اور قابل لوگ بلاشبہ ہمارا سرمایہ ہیں، مگر ایسے سارے سرمائے کا آخری انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ آخر کار ملک سے باہر چلا جاتا ہے۔

تصویر اور بگاڑ

اگلے دن یہاں مقیم کاشف صاحب کے ساتھ شہر دیکھنے کا پروگرام تھا ان سے رابطہ ڈاکٹر

ذوالفقار نے کرادیا تھا۔وہ ایک بہت اچھے نوجوان تھے جن کا دینی ذوق بہت اچھا تھا۔ سارے راستے ان سے دینی اور علمی موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ساتھ میں پرتھ کی کئی اہم جگہیں انھوں نے دکھادیں۔

سب سے پہلے ہم کنگز پارک گئے۔ یہ شہر کے اندر بنا ہوا دنیا کا سب سے بڑا اور بہت خوبصورت پارک تھا۔اس کے اندر سے جو سڑک گزرتی ہے اس سے جاتے ہوئے کسی جنگل کے اندر سے گزرنے کا گمان ہوتا ہے۔اس کا بڑا حصہ ایک پہاڑی پر واقع ہے۔اس پہاڑی سے کھڑے ہوکر دریائے سوان اور اس سے آگے پھیلے ہوئے پرتھ کے جنوبی حصے کا انتہائی خوبصورت منظر نگاہوں کو شب وروز کے ہر پہر میں دعوت نظارہ دیتا ہے۔اس کے علاوہ یہاں سے ڈاؤن ٹاؤن کی بلند و بالا عمارتوں کا نظارہ بھی بہت حسین لگ رہا تھا۔اس کے علاوہ دور واقع پہاڑیوں پر بش فائر کا منظر دیکھا۔اس بش فائر کا بہت ذکر یہاں سنا تھا۔آسٹریلیا میں سب جگہ سفیدے کے جنگلات ہیں جن میں موسم گرما میں اکثر آگ بھڑکتی رہتی ہے۔اس وقت یہی بش فائر ہمارے سامنے تھی۔

دریائے سوان وہ بڑا اسارا دریا ہے جو پرتھ کو جنوبی اور شمالی پرتھ میں تقسیم کرتا ہے اور ساتھ میں مختلف آبی تفریحات کے علاوہ اہل شہر کو ایک بہترین منظر بھی فراہم کرتا ہے۔کاشف مجھے یہاں لے گئے اور یہاں سے میں نے ایک لائیو وڈیو بھی بنائی۔

آسٹریلیا کے ہر شہر کی طرح یہاں بھی میرا درد وہی رہا جو پہلے تھا۔ایک یہ کہ یہ اولاد نوح جن تک دین کی دعوت پہنچانا ہماری ذمہ داری ہے، ہم اس سے بالکل غافل ہیں۔ خاص کر وہ مسلمان جو یہاں ہزاروں کی تعداد میں رہ رہے ہیں۔دوسرے یہ کہ کس طرح ان اقوام نے اپنے شہریوں کو ضروریات سے آگے بڑھ کر تفریحات اور سہولیات میں بھی اتنا کچھ دے دیا ہے

کہ کس کس چیز کی تفصیل بیان کی جائے۔

میری مزید تکلیف کا سبب یہ چیز تھی کہ پچھلے پندرہ برسوں میں یہ لوگ آگے سے آگے بڑھ گئے ہیں اور ہم جہاں تھے اس سے بھی پیچھے جا چکے ہیں۔ چین، جنوبی کوریا، سنگاپور، ملائشیا کو تو چھوڑ دیجیے جو آزادی کے وقت ہم سے بہت پیچھے تھے، اس وقت حال یہ ہے کہ پچھلے کچھ عرصے میں بنگلہ دیش، سری لنکا اور بھارت جیسے ممالک ہم سے بہت آگے جا چکے ہیں۔ اس وقت تو ہم سے شاید افغانستان ہی پیچھے ہو۔ اس کی وجہ بڑی حد تک وہ پالیسیاں ہیں جو پچھلے تیس برسوں سے افغانستان کو اپنا حصہ بنانے کی کوشش میں ہم نے اختیار کر رکھی ہیں۔

اس صورتحال سے نکلنے کا بنیادی راستہ ایمان و اخلاق کو قوم کا مسئلہ بنانا، تعلیم کو عام کرنا، جذباتی اندازِ فکر کے بجائے معقولیت کا فروغ اور اعلیٰ انسانی اقدار کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ ورنہ ہم یہی شعر پڑھتے رہیں گے۔

ایک ہم ہیں لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

پرتھ کے ہلز سے پرتھ کے ساحل تک

ڈاکٹر ثمینہ کا گھر شہر کے ایک کونے پر تھا۔ ہم وہاں سے چلے اور دریائے سوان سے ہوتے ہوئے کنگز پارک تک آئے تھے۔ اس کے بعد ہم ڈاؤن ٹاؤن کی طرف گئے۔ کام کے اوقات کی وجہ سے یہاں رش نہ تھا۔ وہاں سے گزر کر پرتھ کی پہاڑیوں کی طرف گئے۔

ایڈیلیڈ کی طرح یہاں کی پہاڑیاں بھی ایک بہت خوبصورت منظر پیش کر رہی تھیں۔ تاہم یہاں ایک اضافی چیز یہ تھی کہ موسم میرے حساب سے بہت خوشگوار تھا۔ نہ سردی تھی نہ گرمی تھی۔ ایسے میں پہاڑی راستوں میں آنے والے بعض مناظر کے پاس اتر کر ان کو دیکھنا، اپنی ذات میں

ایک ناقابل فراموش تجربہ تھا۔ ایڈیلیڈ کی طرح یہاں بھی انگور کے دور تک پھیلے باغات، اردگرد کے درخت، سبز گھاس کا لبادہ اوڑھے پہاڑی ڈھلوانیں، ان پر چلتی پھرتی بھیڑیں، اوپر شفاف نیلا آسمان اور ہر طرف پھیلی خوبصورت خاموشی۔ شاید اقبال نے اسی سکوت کا خواب دیکھا تھا۔

شورش سے بھاگتا ہوں دل ڈھونڈتا ہے میرا
ایسا سکوت جس پر تقریر بھی فدا ہو

دوپہر عام طور پر سورج کی گرمی اور تمازت سے عبارت ہوتی ہے۔ مگر دوپہر ایسے معتدل موسم اور ایسی پرفضا جگہ پر ہو تو شاید اس سے زیادہ حسین پہر کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ میں کچھ دیر کار سے اتر کر ان مناظر کو دیکھتا رہا۔ انگور کے کھیت کے پاس اکادکا گھر ان کے مالکوں کے تھے۔ میں نے ان گھروں کے باسیوں کو رشک سے دیکھا۔ ان کا تو ہر پہر طلسماتی شان سے طلوع ہوتا ہوگا۔ صبح، دوپہر، شام اور رات کے گھٹتے بڑھتے سایوں میں سورج اور سائے، آسمان اور پہاڑ، بادل اور برسات، چاند اور چاندنی، اندھیرے اور تاروں کی روشنی میں یہ جگہ ہر پہر میں خدا کی جنت کا زندہ نمونہ تھی۔

خدائی حسن کی ایسی ہی برسات اس شام میں نے پرتھ کے ساحل پر دیکھی۔ راستے میں کسی مقام پر کاشف کو میں نے زبان کا ایک پہلو سمجھاتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ شام نے دلہن کا لبادہ اوڑھ لیا کی تعبیر کا مطلب کیا ہے۔ مگر اس شام جب ہم ساحل پر پہنچے تو واقعی ڈوبتے سورج کی لالی نے اپنے پیچھے یہی منظر چھوڑ دیا تھا۔ شفق تو بہت جگہ دیکھی ہے، مگر افق کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی شفق کا جو منظر اس ساحل پر تھا وہ واقعی کسی دلہن کے پھیلے ہوئے آنچل سے کم نہ تھا۔

خدا نے اس دنیا میں اتنا حسن اس لیے تخلیق کیا ہے کہ انسان اس حسن کو دیکھے اور جنت کے

لافانی حسن کا طلبگار بن جائے۔مگر کم ظرف انسان اس عارضی دنیا کے پیچھے اس طرح لگتا ہے کہ ابدی زندگی کے لافانی حسن کو ہمیشہ کے لیے گنوا دیتا ہے۔انسان کو کیسا عظیم موقع ملا ہے۔انسان نے کتنی بے دردی سے اس موقع کو ضایع کر دیا ہے۔

بچوں سے مکالمہ

راستے میں ہم کئی جگہ اور گئے۔صوبائی پارلیمنٹ کو دیکھا۔ٹماٹو گارڈن میں گئے جہاں ایک جھیل بھی بنی ہوئی تھی۔اس کے علاوہ مشہور گراؤنڈ واکا (WACA) گئے۔راستے میں پرتھ کا نیا اور بہت بڑا اسٹیڈیم بھی دیکھا۔

یہاں کے لوگوں کو کھیل اور فٹنس کا بہت زیادہ ذوق ہے۔اسکول میں ہر بچے کو کسی نہ کسی کھیل میں حصہ لینا ہوتا ہے۔لیکن ظاہر ہے کہ یہ ان قوموں کی عیاشیاں ہیں جہاں بنیادی ضروریات مہیا ہوں۔ہم تو تیس برسوں سے جاری لسانی، فرقہ وارانہ، سیاسی اور اب دہشت گردی کی قتل و غارتگری کی وارداتوں کو پوری طرح ختم نہ کر سکے تو باقی چیزوں کا کیا ذکر۔کبھی کبھی خیال ہوتا ہے کہ اس ملک کے عوام جنگل کے ان ہرنوں جیسے ہیں جو درندوں کی غذائیں بنتے رہتے ہیں۔ جب درندے کو بھوک لگی اس نے اپنی پسند کا شکار کرلیا۔ ایسے ہی اس ملک کے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے۔اس کی وجہ مگر یہ ہے کہ عوام نے ایسے لوگوں کو اپنے مذہبی، سیاسی اور فکری لیڈر بنا رکھا ہے۔ جو باشعور لوگ ہیں وہ معاشرے کے خیر و شر سے بے نیاز اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔اس کے بعد وہی کچھ ہوتا ہے جو ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔

چائے کے لیے کاشف کے گھر پہنچے۔ان کی بیگم نے چائے کے ساتھ بہت اہتمام کر رکھا تھا۔کاشف کی تین بچیاں تھیں۔انھوں نے اپنی ایک بچی کا سوال بیان کیا کہ سائنس تو خدا کو نہیں مانتی۔یہ سوال آنے والے برسوں میں ہر جگہ بچے کر رہے ہوں گے۔میں نے تو مذہبی گھرانوں

کے بچوں سے بھی یہی سوال سنا ہے۔ ہمیں اس سوال کے جواب کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

میں نے دوران گفتگو ان میاں بیوی کو یہ سمجھایا کہ بچوں کے ساتھ چھوٹی عمر ہی سے مکالمہ ہونا چاہیے۔ جبکہ عام طور پر والدین چھوٹے بچوں سے صرف دو ہی مواقع پر بات کرتے ہیں۔ ان کو ڈانٹنے کے لیے یا کوئی حکم دینے کے لیے۔ اسے مکالمہ نہیں کہتے۔ مکالمہ یہ ہوتا ہے کہ ان سے ان کی سطح پر آ کر بات کی جائے۔ اسے والدین کوئی کام نہیں سمجھتے۔ یہاں تک کہ بچے والدین سے زیادہ ماحول کا اثر قبول کر کے بڑے ہو جاتے ہیں۔ اس عرصے میں بچوں نے جو بننا ہوتا ہے بن چکے ہوتے ہیں۔

کاشف کے ہاں سے ہم ساحل کے لیے نکلے۔ دیر ہو گئی تھی اس لیے سورج ڈوبنے کا منظر نکل گیا۔ شام کے وقت ساحل سمندر اور سورج ڈوبنے کا منظر یقیناً بہت خوبصورت ہوتا۔ خیر جو مل گیا وہ بھی کم نہ تھا۔ وہاں چھائی ہوئی شفق نے خدائی جمال کا وہ مشاہدہ کرا دیا جو شاید کسی اور جگہ میں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔

کوالٹی مینجمنٹ اور مہنگی لیبر

گھر پہنچے تو ڈاکٹر جیمز اور ڈاکٹر ثمینہ یاسمین کو کھانے پر اپنا منتظر پایا۔ ڈاکٹر جیمز نے قیمہ اور اسپگیٹی بنائی تھی اور خوب بنائی تھی۔ ڈاکٹر جیمز سے ان تین دنوں میں بڑی دلچسپ گفتگو رہی۔ انھوں نے بعض ان تصورات کی نفی کی جو میں نے یہاں سنے تھے۔ مثلاً یہاں لیبر مہنگی ہے اور پاکستان میں سستی۔ انھوں نے اس پر تبصرہ کیا پاکستانی لیبر باعتبار نتیجہ بہت مہنگی پڑتی ہے۔ اس لیے کہ یہ پاکستانی لیبر سستی مگر بہت غیر تربیت یافتہ ہوتی ہے۔ ان میں پروفیشنل ازم نہیں ہوتا۔ چنانچہ آخر کار یہ غیر تربیت یافتہ لیبر یا تو لاگت بہت بڑھا دیتے ہیں یا چیزوں کا معیار گرا دیتے ہیں۔

میں نے ان کی بات کی روشنی میں اپنے تجربات کو ذہن میں تازہ کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ سو فیصد سچ کہہ رہے ہیں۔ ہمارے ہاں لیبر طبقہ ہر اعتبار سے غیر تربیت یافتہ اور نان پروفیشنل ہوتا ہے۔ معیار، کام سے کمٹمنٹ، وقت پر کام کرنا، مرضی کا کام کرنا یہ ہمارے لیے اجنبی تصوارت ہیں۔ ہاں کوئی شخص انتہائی سخت ہو تو وہ ان لوگوں سے پھر کام لے سکتا ہے۔

اس کو ایک عملی مثال سے یوں سمجھیے کہ ان کے گھر کام کرنے کے لیے فیجی کی ایک خاتون مہناز آتی تھیں۔ اسی طرح گھر کی صفائی کے لیے بوسنیا کی ایک اور خاتون سنارڈا آتی تھیں۔ یہ دونوں تو گھر پر تھے نہیں۔ دو دن تک ان خواتین سے میرا ہی واسطہ پڑا۔ میں نے دیکھا کہ انھوں نے گھر والوں کی غیر موجودگی میں بھی ویسے ہی کام کیا جیسے ان کی موجودگی میں کرتیں۔ جبکہ ہمارے ہاں گھریلو ملازماؤں کے سر پر کھڑے ہو کر جب تک کام نہیں کرایا جائے وہ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرتیں۔

کوالٹی مینجمنٹ

ایک اور چیز جو آسٹریلیا میں ہر جگہ مجھے نظر آئی کوالٹی مینجمنٹ تھی۔ جب میں سوشل سائنس میں ایم فل کر رہا تھا تو ٹوٹل کوالٹی مینجمنٹ کے نام سے ایک سبجیکٹ پڑھا تھا۔ اس وقت مجھے یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس مضمون کا سوشل سائنس سے کیا تعلق ہے، یہ تو مینجمنٹ کا مضمون لگتا تھا۔ مگر بعد میں اندازہ ہوا کہ جدید مغربی معاشرہ اب اعلیٰ کوالٹی کے اصول پر آچکا ہے۔ ہر جگہ معیارات مقرر ہیں جن سے ذرہ برابر انحراف نہیں ہو سکتا۔ کوالٹی اب ایک سماجی قدر ہے اور زندگی کے ہر شعبہ میں اس کا پایا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ لوگ اپنی پروڈکٹ اس اصول پر بیچتے ہیں کہ کوئی خرابی ہو تو اطمینان سے اسے واپس لے لیا جائے گا۔

عاطف نے اس ضمن میں سڈنی میں ایک دلچسپ واقعہ سنایا کہ وہ ڈرائیونگ ٹیسٹ کے لیے

گئے تو ان کی گاڑی کے ٹائیر نسبتاً گھسے ہوئے تھے۔ٹیسٹ لینے والے اہلکار نے اس میں بیٹھنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ ٹائر بدلوا کر آئیں۔وقت ختم ہو رہا تھا اس لیے اس نے عاطف کو یہ سہولت دی کہ میں ٹیسٹ لینے کی خاطر ایک گھنٹہ مزید بیٹھ جاؤں۔مگر غیر معیاری ٹائر کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے کا کوئی امکان نہیں۔جبکہ ہمارے ہاں بیشتر لوگ ٹائر کے پھٹنے تک اس کو نہیں بدلتے۔اس پر بہت فخر بھی کیا جاتا ہے کہ پیسے بچا لیے۔حالانکہ اس عمل میں مجموعی طور پر حادثات میں جو جانیں جاتی ہیں اور جو نقصانات ہوتے ہیں وہ اجتماعی طور پر کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں کوالٹی کا یہ تصور ہی ناپید ہے۔گرچہ ہمارے ہاں یہ محاورہ بہت مشہور ہے کہ مہنگا روئے ایک بار اور سستا روئے بار بار۔مگر ہمارے ہاں صورتحال یہ ہے کہ گھٹیا اور سستی چینی اشیا کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔''جگاڑ'' اور کام چلاؤ کے عوامی اصول پر پورا معاشرہ چل رہا ہے۔اس پر ہم بہت فخر بھی کرتے ہیں۔دوسرے شعبہ ہائے زندگی کا کیا کہنا صحت کا شعبہ جہاں زندگی اور موت کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے وہاں بھی معاملات انتہائی غیر معیاری انداز میں ہوتے ہیں۔غلط تشخیص، غلط ٹیسٹ اور غلط دوا سے معذوری اور اموات کے متعدد واقعات میرے علم میں ہیں۔میری والدہ اور اہلیہ میڈیکل کے شعبے کی اس نالائقی کا براہ راست شکار ہوئی ہیں اور صحت کے سنگین ترین مسائل کا سامنا کیا ہے۔خود پچھلے برس میری ایک ڈاڑھ کا ڈینٹسٹ نے جو حشر کیا ہے اس کے بعد سے آج تک میں ٹھیک طرح سے کھانا کھانے کے قابل نہیں رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اپنی صورتحال کو پوری قوت سے بدلنا ہوگا ورنہ زیادہ وقت نہیں گزرے گا کہ ہم اپنی نگاہوں میں خیر الامم ہوں گے لیکن دنیا میں اچھوت بن کر رہ جائیں گے۔ اس سفر میں مجھے اندازہ ہوا کہ پاکستان دنیا میں کسی قابل قدر جگہ پر نہیں رہا ہے۔یا جتنا کچھ بھی ہے دنیا کے دیگر مما لک حتیٰ کہ بنگلہ دیش تک ہم سے آگے نکل چکا ہے۔کاش کوئی ہماری قوم کو

نرگسیت کے فریب سے نکال کر حقیقت کا آئینہ دکھائے۔

انسان کی درندگی اور حدود کی سزائیں

ڈاکٹر جیمز سے ایک بڑے اہم پہلو پر گفتگو ہوئی۔ اس کی طرف میں نے سفر نامے کے شروع میں دو نام دو علامتوں کے عنوان میں ضمناً بیان کیا تھا۔ ان سے بعض جنگی جرائم کے معاملے میں گفتگو ہو رہی تھی تو انھوں نے توجہ دلائی کہ مغرب میں یہ تصور غلط طور پر پھیل گیا ہے کہ انسان مہذب ہو چکا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انسان کتنا ہی مہذب ہو جائے، اسے درندہ بنتے دیر نہیں لگتی۔ جس کے بعد معصوم عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا قتل، عورتوں کی بے حرمتی حتیٰ کہ لاکھوں انسانوں کا قتل عام بھی معمولی بات بن جاتا ہے۔ وہ اصلاً مغربی اقوام کے اس تصور پر تنقید کر رہے تھے کہ ستر برسوں میں اہل مغرب بہت مہذب ہو چکے ہیں۔

تاہم میرے لیے یہ بات اس لیے اجنبی نہیں تھی کہ ہم نے تو اپنی آنکھوں سے اور اپنی ماضی قریب کی تاریخ میں یہ سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ تقسیم ہند ہو یا مشرقی پاکستان کی علیحدگی، ان میں جو قتل عام ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔ ہاں اس کا الزام سب یکطرفہ دوسرے گروہ پر ڈال کر خود معصوم بن جاتے ہیں۔ شہر کراچی میں لسانی بنیادوں پر جو کچھ ہوا اور پھر فرقہ وارانہ اور مذہبی بنیادوں پر جس طرح انسانوں کو قتل کیا گیا اور آج کے دن تک کیا جا رہا ہے، وہ تو ہم سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جس فرقے سے ہمیں نفرت ہو، اس کا کتنا ہی قتل عام ہو جائے، مجال ہے جو دوسرے گروہ کو کوئی معمولی سی بھی تکلیف ہو۔ یہ سب اسی چیز کا نتیجہ ہے کہ انسان کے اندر ایک درندہ چھپا ہوا ہے۔ اس درندے کو بڑی مشکل سے باندھا گیا ہے۔ مگر جب کبھی کسی لسانی، نسلی، مذہبی یا قومی بنیاد پر اس کو ڈھیل مل جائے یہ جان، مال، آبرو کو اس طرح پامال کرتا ہے کہ انسانیت کانپ اٹھے۔

اس موقع پر ایک سیاستدان کا یہ جملہ یاد آ گیا جو انھوں نے اپنی مغربی تعلیم کے زیر اثر کہا تھا کہ اسلامی سزائیں وحشیانہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی سزائیں وحشیانہ نہیں ہیں بلکہ وحشیوں کو دینے کے لیے ہیں۔ اسلام میں حدود کی سخت ترین سزائیں اسی لیے رکھی گئیں ہیں کہ چند لوگوں کو سزا دے کر باقی لوگوں کے اندر کے درندوں کو ڈرا کر رکھا جائے۔ تاہم اسلام کے اسی مقدس نام پر جب اسی درندے کو ڈھیل دی جاتی ہے تو یہ ماتم کرنے کا مقام ہوتا ہے۔

خاندانی نظام کی کمزوری

آسٹریلیا کا معاشرہ مغرب کے معیار پر ایک قدامت پسند معاشرہ ہے۔ ہم جنس پرستی ابھی بھی یہاں غیر قانونی ہے۔ میں اپنے سفر میں ہر وقت باہر گھومتا رہا لیکن کم ہی یہ منظر دیکھا کہ مرد و زن سرعام بوس و کنار میں مصروف ہوں۔ جبکہ دیگر مغربی معاشرے ان تمام معاملات میں آگے ہیں۔

ڈاکٹر ثمینہ یاسمین سے ایک موقع پر میں نے اپنے اس تاثر کا ذکر کیا کہ یہاں خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں تو انھوں نے کہا کہ یہاں خاندانی نظام مضبوط ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے قریبی حلقے میں ایسا ہی ہو۔ مگر جو کچھ معلومات میں نے دوسروں لوگوں سے لی تھیں، وہ اس کے برعکس تھیں۔ برسبین میں مدثر صاحب جو پاکستانی کمیونٹی سے ہٹ کر یہاں کی کمیونٹی کے اجتماعی معاملات سے وابستہ تھے انھوں نے اس کی بڑی تفصیل بتائی تھی۔ حتیٰ کہ خودکشی میں ایک وجہ یہ رشتوں کا بریک اپ بھی تھا۔ انھوں نے بتایا کہ یہاں گھریلو تشدد کے واقعات بھی ہوتے ہیں۔ یہ دلچسپ بات بھی بتائی کہ برسبین میں 97 فی صد علیحدگی کی درخواستیں خواتین کی طرف سے دائر ہوتی ہیں۔

میں نے دورہ آسٹریلیا میں بہت سفر کیا اور اس بات کو خاص طور پر نوٹ کیا تھا کہ ہر جگہ تنہا

لڑکیاں چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ گھوم رہی ہیں۔ یہ سنگل پیرنٹ کی علامت تھی اور اس بات کی کہ خاندانی نظام کس طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ بعد میں آسٹریلیا کے سرکاری اعداد و شمار سے اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ آسٹریلیا کا ہر پانچواں خاندان (22 فیصد) سنگل پیرنٹ فیملی پر مشتمل ہے۔ اس میں بھی تنہا ماں کی شکل میں پائے جانے والے خاندانوں کا تناسب 81 فیصد ہے۔ آسٹریلیا کے مشہور اخبار ٹیلی گراف کے مطابق سنگل فیملی کا یہ رجحان اگلے برسوں میں ستر فیصد اور بڑھے گا۔ جیسا کہ پیچھے کسی موقع پر عرض کیا یہی مغربی نظام کے سب سے کمزور پہلو ہیں یعنی خاندانی نظام کی کمزوری اور حقیقی روحانیت کا خلا۔ شاید ہمارے پاس یہی دو چیزیں بچی ہیں جو مغرب کو ہم دے سکتے ہیں۔ باقی تو ہمیں ان سے سب کچھ لینا ہی لینا ہے۔

میرا خیال یہ ہے اور یہی میرے اس سفرنامے کا خلاصہ ہے کہ ہمیں اب مغرب سے یہ تجارت کر لینا چاہیے۔ اسی میں انسانیت کی فلاح ہے۔ اسی میں ہماری فلاح ہے۔

اسلام کا پیغام

یہی میری اس گفتگو کا خلاصہ تھا جو اگلے دن میں نے یونیورسٹی آف ویسٹرن آسٹریلیا میں کانفرنس میں اپنا پیپر پڑھتے ہوئے کہی۔ یہ کانفرنس دو دن جاری رہنا تھی جو یونیورسٹی کے سنٹر فار مسلم اسٹیٹ اینڈ سوسائٹیز کے زیر اہتمام ہونا تھیں۔ ڈاکٹر ثمینہ یاسمین صاحبہ اس سنٹر کی ڈائرکٹر تھیں۔ تاہم میں نے پہلے ہی ان کو مطلع کر دیا تھا کہ مجھے جمعے کو لوٹنا ہے۔ چنانچہ انھوں نے از راہ عنایت مجھے پہلے دن موقع دے دیا۔ اس روز دیگر تین اسکالرز کے ہمراہ اس طالب علم نے بھی اپنا مقالہ پیش کیا۔ اس کا عنوان اسلام، اسلام ازم اور ویسٹ تھا۔

میں نے اس مقالے میں یہ نقطہ نظر پیش کیا تھا کہ کمیونزم کے زوال کے بعد اہل اسلام اور اہل مغرب بظاہر تصادم کی حالت میں ہیں۔ ہم مانیں نہ مانیں مگر یہ ایک حقیقت ہے۔ تاہم

دوسری حقیقت جو میں نے نمایاں کرنے کی کوشش کی وہ تھی کہ اس تصادم میں مسلمانوں کی طرف سے فریق اسلام نہیں ہے بلکہ اسلام کی ایک خاص تعبیر ہے جو مسلمانوں کے عالمی غلبے کو دین کا نصب العین قرار دیتی ہے۔ جبکہ مغرب کا وہ گروہ اس کا فریق ہے جس کے مفادات اس بات میں ہیں کہ ایک کمزور قوم ان سے ٹکرائے اور وہ اس قوم کے لیڈروں کی حماقت سے فائدہ اٹھا کر اس کے وسائل پر قبضہ کرلیں۔ عام اہل مغرب اس جنگ کے فریق نہیں۔

پھر میں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اصل دعوت کا تعارف اس طرح کرایا کہ یہ اصلاً توحید و آخرت کی دعوت ہے جو عدل، احسان، انفاق کے فروغ اور ظلم، حق تلفی اور فواحش کے خاتمے کی علمبردار ہے۔

انسانیت کا انتظار

گفتگو کے بعد سوال و جواب ہوئے۔ جب سیشن ختم ہوا اور میں اپنی جگہ سے اتر کر نیچے گیا تو دیگر لوگوں کے علاوہ میں نے ایک مقامی آسٹریلوی طالبہ کو اپنا منتظر پایا۔ اسے میری تقریر بہت پسند آئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا اس کی سمجھ میں آیا جو میں نے کہا تھا۔ اس نے کہا کہ ہاں، بہت اچھی طرح۔ اس لڑکی سے بات کر کے فارغ ہوا تو ایسا ہی نوجوان لڑکا میری طرف آیا اور انھی خیالات کا اظہار کیا۔

اسلام کی دعوت کے لیے ایک سفید فام نوجوان مرد و عورت کی پسندیدگی اس بات کی علامت تھی کہ جدید دنیا کی جدید نسل اسلام کی منتظر ہے۔ وہ اس تعلیم کو اپنے دل کی آواز سمجھتی ہے۔ بس اس تعلیم کو اعلیٰ سطح پر پیش کرنے والے لوگ ہوں۔

انسانیت اسلام کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ اسلام جو آخرت ہی نہیں بلکہ دنیا کی بہتری کا بھی علمبردار ہے بلکہ اسے اس نے انسانیت کے سب سے بڑے اجتماع یعنی حج کے موقع پر ان

خوبصورت الفاظ میں انسانیت کی دعا بنادیا ہے:

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّار

اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی سے نواز اور آخرت میں بھی بھلائی عطا کراور آخرت میں آگ کے عذاب سے بچا،(البقرہ201:2)۔

اسلام کی دعوت انسان کے ہر تقاضے کی تکمیل کرتی ہے۔شادی کرنا، خاندان بنانا اوران کے لیے رزق کمانا یہاں عبادت ہے۔خوبصورتی اور تفریح یہاں اللہ کی رحمت ہے۔ایک اللہ کی عبادت انسان کی روحانیت کی تکمیل ہے۔اسلام کسی لذت پر پابندی نہیں لگا تا بس اسراف،ظلم، حق تلفی اور بدکاری سے روکتا ہے۔وہ ایمان، عدل، احسان اور انفاق سے لوگوں کو خدا اور انسانوں کے قریب کرتا ہے۔صبر،عفواور درگزر سے ان میں جینے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔اور آخرت کی امید دلا کرانھیں ایک ابدی خوشی سے سرشار کیے رکھتا ہے۔

اسلام انسانیت کی امید ہے۔ اسلام انسانیت کا انتظار ہے۔ کاش حاملین اسلام اپنے تعصّبات سے اوپر اٹھ کراس حقیقت کو سمجھ لیں۔

آخرت کا کریڈٹ کارڈ اورلوگوں کا فیصلہ

پرتھ سے میری روانگی اگلی صبح تھی۔ڈاکٹر ثمینہ یاسمین صاحبہ کے گھر دو تین دن کا قیام بہت خوشگوار رہا۔انھوں نے اور ڈاکٹر جیمز نے ہر طرح سے بہت خیال رکھا۔ان دونوں میاں بیوی نے اپنی تمام ترعلمی اور پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود میرے کھانے پینے اور آرام کا بہت اہتمام کیا۔میں نے رات کو بہت منع کیا تھامگر میری روانگی کے وقت بھی وہ قبل از وقت بیدار ہوکر مجھے الوداع کہنے کے لیے موجود تھیں۔

ائیر پورٹ پر ایک عجیب تجربہ پیش آیا۔ میں نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں خریدیں۔مگر

خریداری کے وقت کریڈٹ کارڈ اور ڈیبٹ کارڈ دونوں نہ چل سکے۔ مجھے احساس ہوا کہ قیامت کے دن ہمارے نامہ اعمال کریڈٹ کارڈ میں تبدیل ہوجائیں گے۔جس کی نیکیاں زیادہ ہوں گی اس کے کریڈٹ کارڈ میں جنت کی نعمتوں کو خریدنے کی زیادہ استعداد ہوگی۔جس کی نیکیاں کم ہوں گی اس کی استعداد اتنی ہی کم ہوگی۔

مگر کچھ لوگ ہوں گے کہ ان کے کریڈٹ کارڈ بالکل نہیں چل سکیں گے۔ یہ وہ لوگ ہوں گے کہ ایمان کے نام پر غیر اللہ کی محبت، اسلام کے نام پر اپنے فرقہ وارانہ تعصّبات، عبادت اور سنت کے نام پر بدعات غرض ہر پہلو سے اللہ کے غیر مطلوب اعمال لے کر پہنچیں گے۔ وہاں ان کی توقع کے بالکل برخلاف ان کا ہر عمل رد کر دیا جائے گا۔

عافیت کا ایک ہی راستہ ہے کہ انسان اپنی ہر مرضی، خواہش اور پسند وناپسند کو چھوڑ کر صرف اللہ کی مرضی جاننے کی کوشش کرے اور خود کو اس کے مطابق ڈھالے۔ باقی ہر شخص کا انجام یہی ہونا ہے کہ اس کا کریڈٹ کارڈ غیر متوقع طور پر نہیں چلے گا اور اس کو جنت کی کسی نعمت سے کوئی حصہ نہیں دیا جائے گا۔

سفر کے پہلے حصے میں آسٹریلیا سے بنکاک تک ہر چیز وی آئی پی تھی۔ جبکہ بنکاک سے کراچی تک ہر چیز دوسرے درجے کی تھی۔ مجھے دیگر ائیر لائنز سے بھی ہمیشہ یہی تجربہ ہوا تھا۔اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پاکستانی قوم کی دنیا میں کتنی عزت ہے۔

ایک پر مشقت سفر کے بعد سفر نامہ لکھنے کی مشقت اس عاجز نے اسی لیے اٹھائی ہے کہ اپنے لوگوں کو آخرت اور دنیا کے انھی مسائل پر متوجہ کردوں۔ اور یہ بتادوں کہ ان کا حل ایمان اور اخلاق کی اس دعوت میں ہے جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی شکل میں موجود ہے۔ اب فیصلہ لوگوں کو کرنا ہے کہ ان کو دنیا اور آخرت کی عزت چاہیے یا ذلت۔ خدا کے ہاں دینے کو

عزت بھی ہے اور ذلت بھی۔ اب فیصلہ لوگ کرلیں انھیں کیا چاہیے۔

سیر ناتمام

اتفاق کی بات ہے کہ میں نے پچھلے چار ماہ میں مسلسل تین سفر کیے۔ پہلے ترکی گیا۔ پھر کالام اور سوات گیا اور اب آسٹریلیا کے اہم ترین مقامات کو دیکھا۔ خدا کی صناعی، جمال و کمال کی قدرت کے ایسے غیر معمولی نمونے دیکھے کہ جن کی کوئی حد نہیں۔ خدا کا آسمان ایک ہی تھا، مگر اس کے نیچے تین براعظموں ایشیا، یورپ اور آسٹریلیا کے تین خوبصورت مقامات میں اس زمین کو ہر بحر و بر میں ایک نئے پہلو سے اس کی ثنا خوانی کرتے دیکھا۔ ترکی میں باسفورس کو کبھی سیاہ، کبھی فیروزی اور کبھی نیلگوں رنگ میں بدلتے دیکھا۔ آسٹریلیا میں بحر جنوبی کے سمندر کو سبز، سرمئی اور نیلے رنگوں میں ڈھلتے دیکھا۔ کالام میں دریائے سوات کو سفید جھاگ اڑاتا، جوش مارتا اور طلسم ہوشربا اور پرستان کی کہانیوں کی مانند خوبصورت مہوڈنڈ جھیل کے ٹھہرے ہوئے سبز پانی کی شکل میں دیکھا۔ ترکی میں گوریم سے لے کر ملبورن میں ٹویلوا پوسل تک عجیب و غریب چٹانوں کو اپنے وجود سے خدا کی کبرائی بیان کرتے دیکھا۔ میں نے اس کی کاریگری کے عجیب نمونے دیکھے۔ دلربا حسن کی مالک اور گھاس کے مخملی فرش سے ڈھکی آسٹریلیا کی پہاڑی ڈھلوانوں سے لے کر وادی کالام کی مسحور کن فلک بوس پہاڑوں تک ہر پستی و بلند کو خدا کی تسبیح میں مشغول پایا۔

ان اسفار میں صرف ایک انسان ملا جو خدا سے غافل تھا۔ جو خدا کو بھولا ہوا تھا۔ جو خواہش، تعصب اور مفاد کا اسیر تھا۔ جو حرص و ہوس کا پیرو تھا۔ جس نے اپنے مالک کی عطا میں پوری کائنات میں سب سے زیادہ حصہ پایا اور سب سے زیادہ نمک حرامی کا مظاہرہ کیا۔

میں نے ہر قدم پر فرشتوں کو اس کے حکم سے لرزاں اور ترساں پایا جو صاحبِ صور سردار اسرافیل کو دیا جا چکا ہے۔ فیصلہ ہو گیا ہے کہ زمین کو ان نافرمانوں سے پاک کر دیا جائے گا۔ ان کا

نام ونشام مٹا کران کو جہنم کے قید خانے میں ہمیشہ کے لیے بند کر دیا جائے گا۔ خواہش اور تعصب، غفلت اور معصیت میں اندھے ہو جانے والوں کو ہمیشہ کے لیے اندھا کر دیا جائے گا۔ پھر یہ دھرتی اور یہ آسمان ایک نئی دنیا سے بدلے جائیں گے۔ جہاں خدا کی حمد، تسبیح اور محبت میں جینے والے مرد اور عورتوں کو ابدی راحت اور مسرت میں بسا دیا جائے گا۔ ایمان و اخلاق کو زندگی بنانے والوں کو ابدی زندگی دے کر حسن و رعنائی، لذت و نعمت اور شباب و جمال سے مزین فردوس بریں میں ہمیشہ کے لیے آباد کر دیا جائے گا۔

اسی واقعے پر انسانیت کا موجودہ سفر تمام ہو گا۔ اسی کے ساتھ بظاہر میرا سفر، میری سیاحت یا میری سیر، اسے جو بھی نام دیں، تمام ہو رہی ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے کہ اس سیر میں آپ میرے ساتھ رہے۔ مگر درحقیقت میرا سفر ابھی نامکمل ہے۔ یہ سیر ابھی سیر ناتمام ہے۔ یہ سیر ناتمام ایک جہد مسلسل ہے، ایک ختم نہ ہونے والی جنگ ہے۔ یہ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک خدا کی بندگی کی پکار پوری دنیا تک نہیں پہنچ جاتی۔ جب تک اس حسن ازل کے کمال، جمال اور جلال کا تعارف پوری انسانیت تک نہیں پہنچ جاتا۔

\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-\-

جب زندگی شروع ہوگی

مصنف: ابو یحییٰ
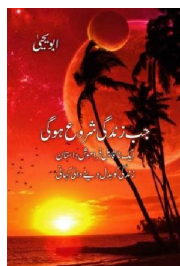
☆ ایک ایسی کتاب جس نے دنیا بھر میں تہلکہ مچادیا

☆ ایک ایسی تحریر جسے لاکھوں لوگوں نے پڑھا

☆ ایک ایسی تحریر جس نے بہت سی زندگیاں بدل دیں

☆ ایک ایسی تحریر جو اب ایک تحریک بن چکی ہے

☆ آنے والی دنیا اور نئی زندگی کا جامع نقشہ ایک دلچسپ ناول کی شکل میں

☆ ایک ایسی تحریر جو اللہ اور اس کی ملاقات پر آپ کا یقین تازہ کردے گی

☆ علم و ادب کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف

قسم اُس وقت کی

مصنف: ابو یحییٰ
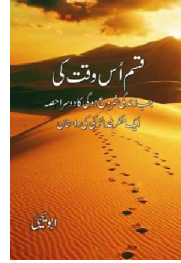
''جب زندگی شروع ہوگی'' سے شروع ہوئی کہانی کا دوسرا حصہ

☆ ایک ایسی کتاب جس نے کفر کی طرف بڑھتے کئی قدموں کو تھام لیا

☆ ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر جو سچ تلاش کرنے نکلی تھی

☆ ایک خدا پرست کی کہانی جس کی زندگی سراپا بندگی تھی

☆ اللہ تعالیٰ کی ہستی اور روز قیامت کا ناقابل تردید ثبوت

☆ رسولوں کی صداقت کا نشان دور رسالت کی زندہ داستان

☆ کفر و الحاد کے ہر سوال کا جواب ہر شبہے کا ازالہ

☆ ایک ایسی کتاب جو آپ کے ایمان کو یقین میں بدل دے گی

☆ ابو یحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

آخری جنگ

مصنف: ابویحییٰ
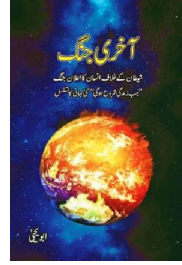
"جب زندگی شروع ہوگی" سے شروع ہوئی کہانی کا تیسرا حصہ

☆ جب زندگی شروع ہوگی کی کہانی کا دلچسپ تسلسل

☆ شیطان اور انسان کی ازلی جنگ کا آخری معرکہ

☆ شیطانی طاقتوں کے طریقہ واردات کا دلچسپ بیان

☆ شیطان کے حملوں کو ناکام بنانے کے موثر طریقے

☆ مسلمانوں کے عروج کا وہ راستہ جو قرآن مجید بتاتا ہے

☆ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کامیابی کا حقیقی راستہ

☆ تاریخ کے وہ اسباق جو مسلمان بھول چکے ہیں

☆ یہ سب کچھ عبداللہ اور ناعمہ کی داستان کی شکل میں پڑھیے

خدا بول رہا ہے

مصنف: ابو یحییٰ
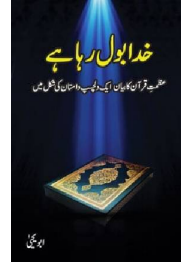
''جب زندگی شروع ہوگی'' سے شروع ہوئی کہانی کا چوتھا حصہ

- ☆ ''جب زندگی شروع ہوگی'' کی کہانی کا ایک نیا پہلو
- ☆ جنت میں عبداللہ کی اپنے والدین سے ملاقات کی روداد
- ☆ عظمتِ قرآن کا بیان، ایک منفرد ناول کی شکل میں
- ☆ ایک باوفا شخص کے اوراق حیات جس کی دنیا لٹ گئی تھی
- ☆ ایک نوعمر لڑکی کی داستان جو دنیا کو اپنی جنت بنانا چاہتی تھی
- ☆ قرآن کی تاثیر کا بیان جس نے ان دونوں کی زندگیاں بدل کر رکھ دیں
- ☆ قرآن کی دعوت کو سمجھنے اور سمجھانے کا انوکھا انداز
- ☆ وہ کہانی جس کا اختتام جانتے ہوئے بھی آپ اسے ختم کیے بنا نہیں رہ سکتے
- ☆ ایک اچھوتے اور منفرد انداز میں قرآن مجید کا تعارف

قرآن کا مطلوب انسان

مصنف: ابو یحییٰ
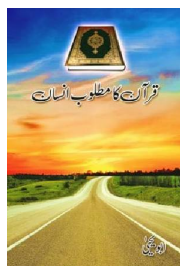
- ☆ قرآن مجید پر مبنی اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام
- ☆ اللہ تعالیٰ ہمیں کیسا دیکھنا چاہتے ہیں
- ☆ وہ کن لوگوں کو جنت عطا کریں گے
- ☆ کون سے اعمال انہیں ناراض کر دیتے ہیں
- ☆ ان کی پسند اور ناپسند کا راستہ کیا ہے
- ☆ اللہ تعالیٰ کی مرضی ان کے اپنے الفاظ میں جاننے کا منفرد ذریعہ
- ☆ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مزین اخلاق نبوی کا قرآنی نمونہ
- ☆ ابو یحییٰ کی ایک منفرد تصنیف

تیسری روشنی

مصنف: ابویحییٰ
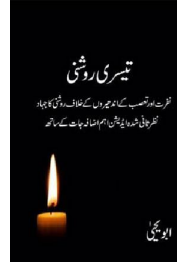
☆ ابویحییٰ کی داستان حیات ۔ تلاش حق کی سچی کہانی

☆ نفرت اور تعصب کے اندھیروں کے خلاف روشنی کا جہاد

☆ جب زندگی شروع ہوگی کے حوالے سے اٹھائے گئے اہم سوالات کا جواب

☆ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کرنے والے رویوں کا تفصیلی بیان

☆ امت مسلمہ کے اتحاد کا جذبہ رکھنے والوں کے لیے ایک رہنما تصنیف

☆ ابویحییٰ کی ایک اور منفرد تصنیف

بس یہی دل

مصنف: ابو یحییٰ
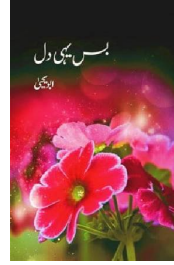
☆ دل کو چھو لینے والے مضامین

☆ ذہن کو روشن کر دینے والی تحریریں

☆ آنکھوں کو نم کر دینے والے الفاظ

☆ ابو یحییٰ کے قلم سے نکلے ہوئے وہ مضامین جو ایمان و اخلاق کی اسلامی دعوت کا بھرپور اور موثر بیان ہیں۔

☆ دلنشین اسلوب میں لکھی گئی ایسی تحریریں جنھیں پڑھ کر آپ دل کے دروازے پر ایمان کی دستک سن سکیں گے۔

حدیثِ دل

مصنف: ابو یحییٰ
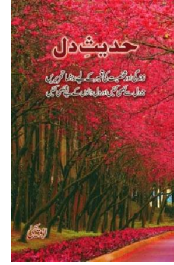
مجموعہ مضامین جس میں آپ پائیں گے اپنی

☆ شخصیت کی تعمیر

☆ اخلاق کی اصلاح

☆ ایمان کی تازگی

☆ اقدار کی زندگی اور

☆ افکار کی تشکیل نو

☆ ہمیشہ کی طرح ابو یحییٰ کے الفاظ کی دستک آپ اپنے دل کے دروازے پر محسوس کریں گے۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ

مصنف: ابو یحییٰ

- ☆ مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ
- ☆ کینیڈا، امریکہ کی زندگی کا تفصیلی جائزہ
- ☆ مکہ، مدینہ کی مقدس سرزمین اور سعودی عرب کا احوال
- ☆ سری لنکا، تھائی لینڈ، ملائیشا اور سنگاپور کی زندگی کا نقشہ
- ☆ مغرب اور مشرق کے ممالک کا تقابل اور اسلام کی علمی برتری کا بیان
- ☆ مغربی تہذیب کی کمزوریوں نظام کی خوبیوں کا بے لاگ جائزہ
- ☆ سات ممالک کے اہم قابل دید مقامات کی دلچسپ منظرکشی
- ☆ سفرنامے کے اسلوب میں لکھی گئی ایک اہم فکری کتاب

سیرِ ناتمام

مصنف: ابویحییٰ
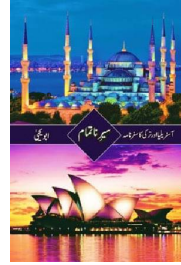
☆ آسٹریلیا کی نئی دنیا کے تمام اہم شہروں کے دعوتی سفر کی روداد

☆ مغرب اور مشرق کے سنگم ترکی کا آنکھوں دیکھا حال

☆ جدید اور قدیم دنیا کے تفریحی مقامات کی دلچسپ سیر

☆ سترہ صدیوں تک دنیا کا مرکز رہنے والے استنبول کی کہانی

☆ احوال سفر کے دلچسپ مشاہدات، معلومات اور نئی چیزوں کا تعارف

☆ ابویحییٰ کے دلچسپ اور پرمغز تجزیے، تنقید اور تبصرے

☆ ہر قدم پر تاریخ کے اسباق اور جدید و قدیم دنیا کا تعارف

☆ آپ کے وژن اور طرز فکر کو نیا انداز عطا کرنے والی کتاب

☆ ایک داستان سفر جو سفر سے بڑھ کر بھی بہت کچھ ہے

ملاقات

مصنف: ابو یحییٰ
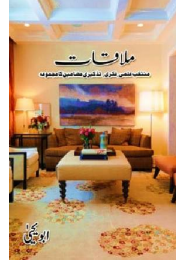
☆ اہم علمی، اصلاحی اور اجتماعی معاملات پر ابو یحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

☆ کریم اور رحیم کا خطاب پانے والے انبیا کی دلنواز سیرت کا بیان

☆ دین کی حقانیت اور دعوت دین کے اہم پہلوؤں کی وضاحت

☆ قیامت اور قرب قیامت کے اہم احوال کی تفصیل

☆ اہم معاشرتی اور خاندانی مسائل کے حل کے لیے رہنما تحریریں

☆ لونڈیوں سے تعلقات کے ضمن میں اسلام کے موقف کی وضاحت

☆ مسائل زندگی کے حل کے لیے رہنما تحریریں

☆ ہم جنسی تعلقات اور ارتقا جیسی عملی اور فکری گمراہیوں کی موثر تردید

When Life Begins

English Translation of Abu Yahya's Famous book **Jab Zindagi Shuru Ho Gee**
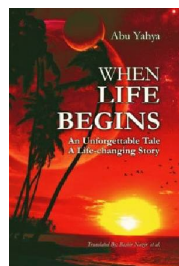
A Book that created ripples through out the world

A Writing that was read by Millions

A Book that changed many Lives

A Writing that has become a Movement

A Comprehensive sketch of the World and Life in Hereafter in the form of an interesting Novel

A Book that will strengthen your Faith in God and Hereafter

The first book of its kind in the world of Literature